~~APT~~
~~BOB~~
416
109

جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۲۲)

تذکرۂ شعرائے اردو

موسومہ بہ

گلِ رعنا

یعنی

اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اور اُس کی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے باکمال اُردو
شعراء کے صحیح حالات اور اُن کے منتخب اشعار، اور اُن کے ہر قسم کے کلام کے نمونے

از

مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

……

باہتمام: مسعود علی ندوی

در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع گردید

طبع چہارم سنہ ۱۳۷۰ہجری

...T GIRLS COLLEGE
SRINAGA
ACC. NO 3042
LIBRARY

دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

891.4391092
ع 31 گ

C. L. 29.

COLLEGE LIBRARY

Class No.........................

Book No.........................

Acc. No. 3042

فہرست مضامین

گل رعنا

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱ - ۴	مولانا نصرتی	۸۲	اشرف علی خاں فغاں	۱۲۱
مقدمہ	۵	دورِ دوم (شعرائے دکن)	۸۶	حصہ دوم (طبقۂ متوسطین)	۱۲۴
اردو زبان اور اردو	,,	شمس الدین ولی	۸۷	دور اول	,,
شاعری کی تاریخ،		فقیر اللہ آزاد	۹۲	حضرت مرزا مظہر جانجاناں	,,
اردو شاعری کا مرکز دکن نقل	۲۹	میر سراج الدین سراج	۹۳	مرزا محمد رفیع سودا	۱۳۶
سے دلی کو منتقل ہوتا ہے،		مرزا داؤد۔ داؤد	۹۸	میر محمد تقی میر	۱۵۴
اردو نثر کی تاریخ	۳۴	میر عبد الولی عزلت	۱۰۰	خواجہ میر درد علیہ الرحمہ	۱۶۴
اردو شاعری پر تبصرہ	۳۹	عارف الدین خاں عاجز	۱۰۳	سید محمد میر سوز	۱۸۳
طبقۂ متقدمین	,,	تیسرا دور متقدمین شعرائے اردو کا	۱۰۷	شیخ قیام الدین قائم	۱۸۶
طبقۂ متوسطین	۴۲	شاہ مبارک آبرو		انعام اللہ خاں یقین	۱۹۱
طبقۂ متاخرین	۶۳	شیخ شرف الدین مضمون		خواجہ احسن اللہ بیان	۱۹۶
دور اول	,,	میر محمد شاکر ناجی	۱۱۱	میر محمد باقر حزیں	۱۹۹
دور دوم	۸۰	مصطفیٰ خاں یکرنگ	۱۱۴	حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت	۲۰۲
حصہ اول (طبقۂ متقدمین)	۸۳	محمد حسین کلیم	۱۱۵	میر محمد بیدار	۲۰۴
دور اول	,,	شاہ ظہور الدین حاتم	۱۱۹	میر قدرت اللہ قدرت	۲۰۷

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
میر ضیاء الدین ضیا	۲۰۹	مرزا اسد اللہ خاں غالب	۳۱۲	نواب مرزا خاں داغ	۴۱۷
دوسرا دور متوسطین شعرائے اردو کا	۲۱۲	میر حسین تسکین	۳۲۶	سید ظہیر الدین ظہیر	۴۲۷
سید محمد میر اثر	״	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	۳۳۰	مرزا قربان علی سالک	۴۳۱
شیخ بقاء اللہ بقا	۲۱۶	کرامت علی شہیدی	۳۳۶	میر مہدی مجروح	۴۳۴
مرزا جعفر علی حسرت	۲۱۹	حصہ سوم (طبقہ متاخرین)	۳۴۰	حکیم ضامن علی جلال	۴۳۸
شیخ غلام ہمدانی مصحفی	۲۲۲	دور اوّل	״	شیخ امیر اللہ تسلیم	۴۴۳
شیخ غلام علی راسخ	۲۳۴	شیخ امام بخش ناسخ	۳۴۳	مولوی محمد محسن محسن	۴۵۵
میر غلام حسن حسن	۲۳۸	خواجہ حیدر علی آتش	۳۶۱	دور سوم	۴۶۰
شیخ قلندر بخش جرأت	۲۵۱	خواجہ محمد وزیر وزیر	۳۷۱	جدید شاعری کا آغاز	״
میر انشاء اللہ خاں انشا	۲۵۷	میر وزیر علی صبا	۳۷۴	مولوی محمد حسین آزاد	۴۶۸
مرزا سعادت یار خاں فراق	۲۶۸	نواب سید محمد خاں رند	۳۷۷	خواجہ الطاف حسین حالی	۴۷۲
حکیم ثناء اللہ خاں فراق	۲۷۳	مرزا محمد رضا برق	۳۸۲	مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی	۴۸۰
دور سوم از طبقہ متوسطین	۲۷۶	میر علی اوسط رشک	۳۸۸	سید اکبر حسین اکبر	۴۸۷
شاہ نصیر الدین نصیر	״	مرزا اصغر علی خاں نسیم	۳۹۲	ضمیمہ نمبر ۱ (مرثی کا بیان)	۴۹۷
میر نظام الدین ممنون	۲۸۲	میر مظفر علی خاں اسیر	۳۹۶	مرزا سلامت علی دبیر	۴۹۹
شیخ محمد ابراہیم ذوق	۲۸۷	شیخ امداد علی بحر	۳۹۸	میر ببر علی انیس	۵۱۱
بہادر شاہ ظفر	۲۹۶	دور دوم	۴۰۲	ضمیمہ نمبر ۲	۵۲۴
حکیم محمد مومن خاں مومن	۳۰۱	منشی امیر احمد امیر مینائی	״	مولٰنا سید فخر الدین والد بزرگوار مصنف	״

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی سیدنا محمد وعترتہ بعدد کل معلوم لک

اگلے زمانہ مین جن لوگون کو کچھ بھی علمی مذاق ہوتا تھا وہ اپنے پاس ایک ایک بیاض رکھا کرتے تھے، کبھی اس کی تقطیع کتابی ہوتی جس کا شیرازہ عرض مین کاغذون کو موڑ کر باندھا جاتا ہے، کبھی طول مین کاغذون کو موڑ کر بہی کی طرح باندھتے، وہ ایک سادی کتاب ہوتی جو ہر وقت پاس رہتی، چھاپہ خانہ اس زمانہ مین نہین تھا، کسی خوش قسمت کو خود لکھکر یا لکھوا کر کتابین مل بھی جاتین تو اس زمانہ مین جب کہ ریل نہین تھی اور اس طرح سفر آسان اور سہل نہین تھا، کتابون کو اپنے ساتھ ساتھ سفر مین رکھنا دشوار تھا، اور رکھتے بھی تو سارا کتبخانہ کہان کہان لئے پھرتے، وہی سادی کتاب ساتھ رہتی، اسی وجہ سے اس بیاض کا ایک نام "زاد السفر" بھی تھا،

مذاق علمی بھی ایک طرح کا نہ تھا، جو طبیب ہوتے وہ بیاض پر اپنی مجربات یا کہین سے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ آتا اس کو لکھتے جاتے، کوئی نادر کتاب طب کی کہین مل جاتی تو اس مین سے ان نوادر کو جن کا محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے اسی بیاض پر قلمبند کر لیتے، عربی کی مثل ہے "العلم صید والکتابۃ قید" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بات کتابون مین پڑھ کر یاد ہو جاتی ہے، مگر چند روز مین ایسا ذہول ہو جاتا ہے کہ وہی بات یاد کرنے سے بھی یاد نہین آتی، اس واسطے لکھ لینا آیندہ چل کر کام دیتا ہے،"

قاضیون اور مفتیون کے پاس جو بیاضین ہوتین اس مین مفتی بہ مسئلے اور معتبر کتابون کے حوالے لکھ لیتے تاکہ موقع پر جب ضرورت پڑے تو اُن سے کام لے سکین،

شعرا کی بیاضون مین شعر و سخن کے رموز، عروض و قافیہ کی ضروری ضروری یادداشتین، قدما کے قصائد، غزلین، رباعیان، معمے، پہیلیان، تاریخین اور جہان کوئی مزہ دار شعر سنا وہ اور اسی کے تمام متعلقات قلمبند ہوتے تھے،

عام لوگ جو یک فنی نہین ہوتے وہ بھی اپنے اپنے پاس بیاضین رکھتے، مگر اُن کی بیاضین معجونِ مرکب ہوتی تھین، ایک حصہ مجرب نسخون کے لئے مخصوص ہے تو دوسرا دعاؤن اور تعویذون کے واسطے، ایک برجستہ اشعار اور دل نشین کلام کے لئے، نظم ہو یا نثر، ایک اپنے بزرگون، دوستون اور نامورانِ ملک کی تاریخہاے ولادت و وفات کے واسطے، غرض کہ وہ ایسی چیز ہوتی جس سے بیکاری کے وقت ہر مذاق کا آدمی اپنا دل بہلا سکتا، اور ضرورت کے وقت ان یادداشتون سے کام لے سکتا ہے،

مین نے اپنے بچپن مین جن بزرگون اور عزیزون کو دیکھا ان مین کا ہر ایک، ایک ایک بیاض کا مالک تھا اور اس کو اپنی عمر بھر کی کمائی سمجھ کر اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا، سید عبدالجلیل مرحوم ایک سن رسیدہ بزرگ میرے رشتہ کے نانا تھے، ان کی بیاض اتنی دلچسپ تھی کہ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کو آتے، وہ بیاض کیا تھی، جام جہان نما تھا، ہندوستان کے عام انقلاب کی چشم دید تاریخ، نامورانِ ملک کی موت و حیات کا ابھرا ہوا خاکہ، فقہ و حدیث کے نوادر اور مشکلات کا حل، شعرا کے نتائجِ فکر کا بہترین نمونہ، غرضکہ وہ ایک ہی کتاب ہر مذاق کے لوگون کے لئے دلچسپی کا بہت بڑا ذریعہ تھی،

مین نے ان ہی بزرگون کے دامنِ تربیت مین پرورش پائی تھی، مجھکو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا، جب زمانہ نے آنکھین کھولین اور اور کامون

بن لگ گیا پھر خبر نہین رہی کہ وہ کہان ہے اور کس حالت مین ہے،

ندوۃ العلماء کے کامون سے جب فرصت ملتی تو تصنیف و تالیف مین لگ جاتا، دن کے اُجالے اور راتون کی تاریکی مین جو کام بن پڑتا وہ ان ہی دو چیزون مین محدود تھا جنۃ المشرق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس مین ہندوستان کا جغرافیہ، ظہور اسلام سے لے کر غدر ۱۸۵۷ء تک کی اسلامی تاریخ، مسلمانون کا طریقۂ حکمرانی اور امور نافعہ کا بہ قدر امکان تلاش و تحقیق سے ذکر کیا ہے، دوسری کتاب المعارف کے نام سے لکھی، جس مین علوم و فنون کی تاریخ اور ہندوستان مین جس علم کی جیسی مسلمانون نے خدمت کی ہے، اور جو کتابین ان علوم مین یہان تصنیف ہوئی ہین ان کی تفصیل دی ہے، تیسری کتاب نزہۃ الخواطر آٹھ جلدون مین تصنیف کی جس مین ہندوستان کے علماء اور دوسرے نامورون کے حالاتِ زندگی جنھون نے علم کی خدمتین کی ہین، بڑی کاوشون اور کاہشون سے فراہم کئے ہین، علاوہ ان کے چند کتابین اور بھی لکھین، جو فقہ و حدیث سے تعلق رکھتی ہین، مگر بدقسمتی سے یہ سب کتابین عربی مین تالیف کین جن کی اس ملک مین مانگ نہین، یہ سودا ہنوز دماغ مین موجود تھا کہ سال گذشتہ مین صحت نے بیوفائی کی اور سال کا سال مرض کے الجھاؤ مین گذر گیا، اس سال کچھ کام کرنے لگا تھا کہ پھر مرض کا اعادہ ہوا، مدتون کی عادت پڑی ہوئی کتاب بینی اور تصنیف و تالیف طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی مجبوراً طبیعت کو ایسی کتابون کے مطالعہ پر مائل ہونا پڑا جن سے دماغ پر زور نہ پڑے، ان ہی کتابون مین وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانہ مین ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور شاعرون کا کلام اس مین اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والون کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیئے جائین، تذکرے جمع کئے اور کام شروع کیا، بات مین بات نکلتی آئی، اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی جس کا نام "گلِ رعنا" مین نے رکھدیا ہے،

اُمید ہے کہ بزرگانِ سخن فہم اس کی قدر افزائی فرمائین گے، اور کیا عجب ہے کہ اس طریقہ سے جس سرزمین کی مختلف حیثیتون سے مین نے اب تک خدمتین کی ہین اس کی ملکی زبان کی بھی یہ اچھی خدمت سمجھی جائے،

غرض نقشے است کز ما یاد ماند — کہ ہستی را نمی بینم بقاے
مگر صاحب دلے روزے زرحمت — کند بر حالِ این مسکین دعاے

عبدالحئی

۶ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ، لکھنؤ،

مقدمہ

اُردو زبان اور اُردو شاعری کی تاریخ

انسان کے دل مین کسی چیز کے دیکھنے یا سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے ذوق و شوق، عشق و محبّت، حیرت و استعجاب، طیش و غضب، رنج و غم وغیرہ کی جو کیفیتین پیدا ہوتی ہین ان کو اس طرح سے موزون کر کے ادا کرنا کہ جو اثر اس کے دل مین ہے وہی دوسرون پر چھا جائے اسکا نام شاعری ہے،

اگر ایک مضمون کو ایک سطر مین لکھو اور نثر مین پڑھو، پھر اسی مضمون کو فقط لفظون کے ایک خاص پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھو، تو کچھ اور ہی عالم ہو جائے گا، اول تو وہ موزون ہوجاتا ہے، پھر کلام کا زور بڑھ جاتا ہے، تیسرے سیدھی سادی بات مین ایسا لطف پیدا ہوجاتا ہے کہ سب اس کو بار بار پڑھتے اور مزے لیتے ہین،

قدرتی شاعر ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت مین بیٹھتا ہے مگر حقیقت مین اس کا دل اور اس کے خیالات ہر وقت اپنے کام مین لگے رہتے ہین، قدرت کے کارخانہ مین جو چیز اس کے حواس مین محسوس ہوتی ہے اور اس سے جو کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے، وہ ہر شخص کو نصیب نہین، خواہ لطف و شگفتگی ہو خواہ آزردگی یا بیزاری،

یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اٹھاتا ہے، اس کے لئے ڈھونڈھتا ہے کہ کیسے لفظ ہون اور کس طرح ان کو ترکیب دون تا کہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے، وہی کیفیت سننے والے کے دل پر چھا جائے، اور وہ بات کہون کہ جو اثر میرے دل پہ ہوا ہے، وہی اس پر بھی ہو، یا

جس طرح کا لطف مین نے اٹھایا ہے اسی طرح کا لطف اسے بھی حاصل ہو[1]

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق کچھ نہ کچھ روئیدگی سے خالی نہین رہ سکتی، اسی طرح کوئی زبان اپنے اہلِ زبان کی حیثیت کے موافق نظم سے خالی نہین رہ سکتی، یا جس طرح سے روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح زبانون کے سلسلہ مین ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہلِ زبان کی شائستگی اور تہذیبِ علمی کے ساتھ لطافتِ طبع کے جوہر دکھاتی ہے،

زبانِ اردو کے ظہور پر خیال کرو اور اس کی تصنیفات پڑھو تو اس مین نثر سے پہلے نظم آئے گی، جب ملکی زبانون نے اپنی وسعتِ اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانون کو جگہ دی تو طبیعتون مین اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا، لیکن وہ صدہا سال تک دوہرون کے رنگ مین ظہور کرتی رہی، یعنی فارسی کی بحرین اور فارسی کے خیالات ایک زمانہ تک اس مین گھسنے نہین پائے[2]،

جہان تک چھان بین کی گئی ہے، سب سے پہلے امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع مین اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی، ملکِ سخن مین برج بھاشا کی ترکیب سے انشاپردازی کا ایک طلسم خانہ کھولا، مکرنی، انمل، دوسخنی، قسم قسم کے گیت اور پہیلیان، خاص ان کے آئینۂ کمال کا جوہر ہین، خالق باری کو بھی اُن ہی کی طبعِ رسا کا نتیجہ سمجھو، تو اس حیثیت سے اس کو اردو نظم کی داغ بیل قرار دینا ایک حد تک ٹھیک ہے، مگر اس کی کیا سند ہے کہ یہ اُن ہی کی تصنیف ہے، ایسی زبانی روایتون سے جو مکتبون کے مُلّا ایک دوسرے سے لیتے چلے آئے ہین، تاریخ کی بنیاد نہین پڑتی، پہیلیون اور گیتون کی حالت دوسری ہے، ان کی بنیاد مضبوط چٹان پر قائم ہے، ہر زمانہ مین ہزارون مرد اور عورتون نے نقل در نقل ان کو ہم تک پہنچایا ہے، اسی طرح سے امیر خسرو نے جو اختراع موسیقی کے راگ اور راگنیون مین کی ہین، ان کی سند بڑی پکی ہے، بہرحال، اس مین کچھ شبہہ نہین کہ اس کی داغ بیل امیر خسرو کی ڈالی ہوئی ہے،

---

[1] آبِ حیات [2] ایضاً

خسرو کے بعد سلطان حسین شرقی نے جو فنِ موسیقی کا بے نظیر ماہر تھا، اس مین برگ و بار پیدا کئے، اس نے دھرپد مین تصرف کیا، اور بجائے چار مصرعون کے دو مصرعے کر دیے یا آہنگ مین تصرف کرکے اس کا خیال اور چٹکلہ نام رکھا، یا حقیقت کے منہ سے نقاب ہٹا کر مجاز کو زیادہ کھول دیا، یہ اُس کے تصرفات براہ راست موسیقی کے راگ اور راگنیون مین تھے مگر ان کا اثر شاعری پر بھی پڑتا ہے، چو مصرعی ترکیب بھاشا کی خصوصیات مین سے ہے اس کو دور کرکے اس نے گیتون کو غزل کے قریب کر دیا،

علاوہ اس کے امیر خسرو کے زمانہ مین جو زبان گیتون کی تھی وہ شرقی کے زمانہ مین زیادہ منجھ گئی تھی اور عربی فارسی کی آمیزش اس مین زیادہ ہو گئی تھی، امیر خسرو ترک تھے، اس وقت ترکون کی بادشاہت تھی، فتوحات کا سیلاب ہندوستان مین بہہ رہا تھا، اور یہان کے قدیم باشندون سے سخت کشمکش ہو رہی تھی، اپنی ملکی زبان، ملکی رواج، اور مذہب کو ہر ایک جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، بادشاہ سے لے کر ایک سپاہی تک ترکی یا فارسی زبان بولتا تھا اپنی زبان کو عزیز رکھتا تھا، پھر اس کو بھی دیکھو کہ ان مین اکثر تازہ وارد ہوتے تھے، بہت کم ایسے لوگ ہون گے جن کی دو پشتین بھی یہان گذری ہون، اس لئے ہندی کے بعض حروف کا تلفظ بھی وہ اچھی طرح سے ادا نہ کر سکتے ہون گے، شرقی کی اصل و نسل ہندوستان کی سرزمین سے تھی، وہ بھی فی الجملہ اطمینان و فراغت کا تھا، اس کا لب و لہجہ اور زبان کی لوچ قدرتی طور پر ہندوستانی تھی، اور اس کے ملازمین و رعایا بھی سب ہندوستانی تھے، اس لئے اپنی ملکی زبان سے ایک طرح کا انس ہونا، اُن کے واسطے قدرتی امر تھا،

تھوڑے دنون کے بعد سکندر لودی نے ملکی مصالح کے لحاظ سے ہندوون کو فارسی پڑھنے کی رغبت دلائی، تا کہ وہ دفتری زبان سیکھ کر ملکی کاروبار مین حصہ لے سکین، برہمن اور راجپوت جیسی دھرماتما قومون نے انکار کیا، صرف اسقدر کامیابی ہوئی کہ کایستھون نے فارسی پڑھنے کی ٹھان لی، اور وہی ایک مدت تک سرکاری عہدون کے ٹھیکہ دار بنے رہے، جیسا کہ انگریزی سلطنت قائم ہونے تک

مسلمانون نے انگریزی زبان سیکھنے کی پرواہ نہین کی، اور ہندوون کی سب قومون نے اس مرتبہ اپنے پرانے تجربہ کی بنا پر فائدہ اٹھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کمپنی کی حکومت اٹھنے اور قاضی، مفتی، صدر امین، صدر الصدور کے عہدون کے ٹوٹنے یا نام اور کام بدل جانے کے بعد ہندؤن سے سرکاری خدمتین بھر گئین، اور مسلمان منہ دیکھتے رہ گئے، بہرحال سکندر لودی کا یہ حکم بھی اس بات کا ایک ذریعہ ہوگیا کہ خود ہندؤن کی زبان پر عربی اور فارسی کے الفاظ چڑھ گئے، اسی طرح مسلمانون کی زبانون پر ملکی زبانون نے قابو پالیا، اور باہمی میل جول کی وجہ سے ان مین روانی پیدا ہوگئی،

بابر شاہ ہندوستان آتا ہے تو باوجودیکہ وہ ایک ٹھیٹ مغل ہے، ڈال کا ٹوٹا ہوا، وہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کے ترکی دیوان کا جو نسخہ نواب رام پور کے کتبخانہ مین ہے وہ سنہ ۹۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اس مین ایک شعر ہے جس کا ایک پورا مصرع اور دوسرے مصرع کا ایک ٹکڑا اردو مین ہے، کتاب خط نسخ مین لکھی ہوئی ہے، اس کے رسم الخط کے موافق مین اس شعر کو نقل کرتا ہون،

مجکانہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی　　نقرا[1] ہلیغہ بس بولغوسیدور پانی و ربی
مجھے　کچھ

بابر کے پوتے اکبر شاہ کے زمانہ مین یہ میل جول اور بھی بڑھ گیا، بادشاہ کی زمانہ سازی سے ہندو رانیان گھر کی مالک بن بیٹھین، ہندؤن کے سارے رسم و رواج بادشاہ نے اختیار کر لئے، پیشانی پر قشقہ لگایا، ہاتھون مین راکھی باندھی، راکھی بندھن کی رسم سال بسال دھوم دھام سے ہونے لگی، راجہ ٹوڈرمل دیوان اور بیربر مصاحب ہوئے، راجپوتانہ مین کسی جگہ سسرال بنائی گئی کہین سمدھیانہ قائم ہوا، فارسی شعرا کے دوش بدوش کبیشرون اور گوّیون نے بھی جگہ پائی، اُن کو اگر ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا،

---

[1] جب مین رامپور گیا تھا میرے معزز دوست حافظ احمد علی خان شوق سپرنٹنڈنٹ کارخانجات سرکار رامپور نے مہربانی سے سرکاری کتبخانہ کی سیر کرائی اور اس کتاب کو خصوصیت سے دکھایا، مین ترکی زبان نہین جانتا، انھون نے جو مطلب دوسرے مصرع کا بتایا وہ یہ تھا کہ "فقرا کو پانی اور روٹی کافی ہے"

تو اُن کو کب راج اور کب راے بنایا گیا، گھوڑون، ہاتھیون اور ہتھیارون کے نام ہندی رکھے گئے،

جو چیزین ہندوستان کی پیداوار تھین، اُن کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے، وہ سب زبانون پر چڑھ گئے، اور فارسی عبارتون مین بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کئے جانے لگے، مثلاً جھروکہ، درشن، پھول کٹار، کھپورہ مرصع، جمدھر، کٹار، تلوار، گھوڑا، ہاتھی، پالکی، نالکی، جھالر، کہار، ڈاک، چوکی، سرچوکی، ویسمکہ، دیس، پانڈیہ، پٹیل، پٹواری، راے، راو، راجہ، مہاراجہ، چودھری، پہر، دوپہر، گھڑی، گھڑیاں، ڈاتی، گھاٹ، گھروارہ، بیوپاری، اور اسی طرح کے صدہا الفاظ سلاطینِ مغلیہ کی شاہی زبان مین ملے جلے نظر آتے ہین،

اکبر شاہ جہانگیر کو پیار سے شیخو جیو، مراد کو پہاڑی راجہ اور فیضی کو شیخ جیو کہتا تھا، ایک دن فیضی حسب الحکم حضور مین کچھ لکھ رہا تھا، بیربر بات کرنے لگا، اکبر شاہ نے آہستہ سے کہا "حرف نزنید شیخ جیو می نویسد"، آرام بانو اس کی چہیتی بیٹی تھی، مرتے وقت جہانگیر سے وصیت کرتا ہے،

"بہ این خواہر خود کہ لاڈلہ من است بعد از من باید بردشے سلوک کنی کہ من با وی کنم"،

جہانگیر بادشاہ کی رنگیلی طبیعت سے تم واقف ہو، اُس نے شراب کا نام "رام رنگی" رکھا تھا، شاہجہان بچپن مین باپ کو "شاہ بھائی" اور دادا کو "شاہ بابا" کہتا تھا، مراد بخش شاہ شجاع کو "بھائی جیو" کہتا تھا، ایک خط مین عالمگیر کو لکھتا ہے،

"اگر این طرز پسند خاطر انند صاحب و قبلہ بھائی جیو را درہم درین باب متفق ساختہ در یک ساعت دیک وقت از جا ہاے خود روانہ مطلب می باید شد"

عالمگیر نے کلماتِ طیبات مین کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کئے ہین، جستہ جستہ فقرے اس کے بھی ملاحظہ ہون، فرزند عالیجاہ (محمد اعظم) کو لکھتے ہین،

مزہ کھچڑی و بریانیِ شما در زمستان یاد می آید . . . . ڈالی انبہ مرسلہ آن فرزند بذائقہ پدر پیر خوشگوار

آمد برائے نام انبہ گنام استدعا نمودہ اند چون آن فرزند جودت طبع دارند، روا دار تکلیف پدر پیر چرا می شوند، بہر حال سہ بارس درستاپلاس نامیدہ شد ..... خود بدولت بنفس نفیس چہار گھڑی آخر شب از خواب گاہ برآمدہ ..... نماز صبح ادا کردہ بجھروکۂ درشن تشریف می آورند و درشنیان را بہ سعادت دید از فیض آثار نواختہ بعد برآمدن چہار گھڑی روز دیوان عام می فرمودند .. .. تا قریب دو پہر این معاملات در پیش می بود ..... درین ضمن کرسی کچکڑہ نیز بہ نظر گذشت ..... بر اسپ نیلو فر و چوا چندن کہ بتواتر سوار می شوند ظاہراً از سواری آنہا پر محظوظ اند .... شادیانۂ فتح بہ نوازند، و حرف ایام طفولیت یاد دارند کہ باباجی دھون دھون ..... قلعہ پرنالہ بہ اسم نول تازہ موسوم شد ..... از توپ و رہکلہ و بان و رام جنگی و جزائر و گھڑ نال و شتر نال و گجنال و سواران با براق و اسپان و فیلان با برگستوانہائے براق و دیگر لوازمۂ طمطراق آن قدر کہ باید، بلکہ نباید ملاحظہ شد ..... حدود فوجداری خود چنان از قطاع الطریق خالی و از امن پر سازد کہ مسافرین و متردّدین و تاجر و بیوپاری بلا وسواس آمد و رفت کنند"

اس مشتے نمونہ از خروارے سے تم سمجھ سکتے ہو کہ ہندی کے کتنے الفاظ ان کی زبان پر چڑھ گئے تھے اور پیار و محبت کے موقعون پر وہ کس بے تکلفی سے اُن کو کام مین لاتے تھے،

جہانگیر بادشاہ کے زمانہ مین غواصی ایک شاعر تھا، اس نے مولانا نخشبی کے طوطی نامہ کو بکٹ کہانی کے طور پر نظم کیا تھا، اس زمانہ کے دستور کے موافق کچھ ہندی، کچھ فارسی ملی جلی نظم تھی، میر حسن شعرائے ریختہ کے تذکرے مین غواصی کا ذکر کرتے ہین اور کہتے ہین کہ مین نے اس کتاب کو دیکھا تھا، مگر کوئی شعر اس وقت یاد نہین، اگر اس کے دو چار شعر بھی مل جاتے تو پتہ چل جاتا کہ اس زمانہ مین زبان کی کیا حالت تھی،

میر حسن نے تذکرہ مین اسی عہد کے ایک اور شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا تخلص خاکی تھا، وہ کہتے

ہین کہ یہ دلّی مین درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس سے زیادہ اس کا کچھ حال معلوم نہین، مگر اس کا ایک شعر کسی پیر مرد سے سنا ہوا اب تک یاد ہے،

ٹھانی ہے اپنے من مین اتو یہی سرجن
تجھ پیم کی گلی مین خاکی کو خاک ہونا

اگر درحقیقت یہ اسی زمانہ کا شاعر تھا، اور یہ شعر اسی کا ہے جس کی شہادت کا توڑ ایک مجہول الحال پیر مرد پر ہوتا ہے تو خاکی کو دکن کا باشندہ ماننا پڑے گا، جو خاک چھانتا ہوا دلّی پہنچ گیا ہوگا،

جہانگیر ابراہیم عادل شاہ کا ہمعصر ہے، اُس وقت دلّی مین اردو شاعری کا سراغ نہین ملتا، دکن مین اس کی بنیادین قائم ہو رہی تھین، مگر اس وقت زبان جس عالمِ طفولیت مین تھی اس کا نمونہ محمد قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور مولانا نصرتی کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہوسکتا ہے،

خاکی کا جو شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ مین نقل کیا ہے، اس کی زبان شمس ولی اللہ اور ان کے ہمعصر شعراء کی زبان ہے، اس وجہ سے میری قطعی رائے یہ ہے کہ میر حسن کو دھوکہ ہوا ہے یا کاتب کا سہو القلم ہے، بجائے جہانگیر کے عالمگیر ہونا چاہیئے تھا[1]،

---

[1] سید محمد بن جمال الدین قادری ایک بزرگ شمس ولی اللہ کے ہمعصر تھے، خاکی تخلص تھا، ان کا مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتبخانہ مین موجود ہے، یہ دیوان ردیف دار ہے، علاوہ غزلون کے مثنوی اور مستزاد بھی ہے، ایک دو ریختیان بھی ہین جو ہندی شاعری کا نمونہ ہین، مناجات بھی ہے، نعت بھی، اول سے آخر تک کلام عارفانہ رنگ مین ڈوبا ہوا ہے، مقطعون مین کثرت سے اپنے پیر کا نام لیتے ہین، زبان وہی ہے جو ولی کے دیگر ہمعصرون کی ہے، اس دیوان کے علاوہ ایک مثنوی ان کی فیض عام ہے، جو سنہ ۱۱۱۸ھ مین لکھی ہے، جس سال ولی نے وہ مجلس لکھی تھی، یہ ساڑھے سولہ جز کی کتاب ہے، اور سید عبد الرزاق چیف ٹرانسلیٹر ناگپور کے کتبخانہ مین موجود ہے، میرا گمان غالب یہ ہے کہ میر حسن نے خاکی کا جو شعر نقل کیا ہے وہ ان ہی کا ہے، علامہ شروانی نے مہربانی کرکے ان کے دیوان سے کچھ اشعار منتخب کرکے بھیجے ہین جو ملاحظہ طلب ہین،

جائز نہین تھی ہجر کے شب کی شکایتین
مجکون خصوص آج تو نقدِ وصال تھا

اپنے معشوق سنگ ہو رہنا
ایک دل ایک رنگ ہو رہنا
خوش یہی حال ہے فقیری کا
نفس و دل بیچ جنگ ہو رہنا

جن نے مے کو پیا کے نوش کیا
اس کے حق مین ہوا ہے شربت تلخ

تاہم اس مین کچھ شبہہ نہین کہ اکبر و جہانگیر کے طرز حکومت سے کایستھون کے سوا ہندوستان کی اور قومون کی بھڑک بھی جاتی رہی تھی، وہ بھی فارسی پڑھنے لگے تھے، ان کا میل جول مسلمانون سے بہت بڑھ گیا تھا، اسی میل جول کا نتیجہ ہے کہ مخلوط زبان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، پھر بھی وہ بازارون اور بے لطف صحبتون یا گھرون تک محدود رہی،

اُس زمانہ مین شاہی زبان فارسی تھی، بادشاہی فرمانون سے لے کر دفترون کے احکام تک اُسی زبان مین جاری ہوتے تھے، اسی مین عرائض اور مقدمے کے کل فرائض طے ہوتے تھے، اسی مین عام طور پر خط و کتابت ہوتی تھی، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے دلون پر اس کا رعب و اقتدار اسقدر چھایا ہوا تھا کہ ملکی زبان کو بے علمی کی علامت جانتے تھے،

اس وجہ سے اردو زبان کو علمی زبان تک رسائی نہین ہوئی، اور مدت دراز تک دارالملک اور اس کے گرد و پیش کے شہرون اور قصبون مین فارسی کا سکہ روان رہا، لیکن اطراف ملک کی یہ حالت نہین تھی، وہان کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ مخلوط زبان (اردو) کی جڑ مضبوط ہوتی گئی،

دکن مین محمد شاہ تغلق کی بے عنوانیون سے بہمنیون کی جو عظیم الشان سلطنت قائم ہوگئی اور علاوالدین حسن[1] گانگو کے نام قرعۂ سلطنت پڑا، اس نے شروع سے برہمنون کو مالی و ملکی عہدے دیکر حکومت مین دخیل کر لیا، مال کا دفتر ملکی زبان مین ہونے سے بہت سرعت کے ساتھ ملکی، اور فارسی زبانین مخلوط ہوگئین،

---

[1] حسن گانگو ایک مفلوک الحال امیرزادہ تھا، اپنے خاندان کی تباہی کے بعد ملتان سے دلی آیا، یہان اس کا کوئی شناسا نہ تھا، اتفاق سے جمنا کے کنارے گانگو پنڈت جو دربار شاہی کا منجم تھا اس کو مل گیا اور اس نے حسن کو پریشان و خستہ پا کر اس کی سرپرستی کی، اور چند روز اپنے گھر مین مہمان رکھ کر محمد شاہ تغلق کے دربار مین اس کو باریاب کر دیا، حسن مین وہ تمام صفتین موجود تھین جو اقبال مندون مین ہوا کرتی ہین، دربار شاہی امیرانِ صدہ مین اس کو جگہ مل گئی،

فیروز شاہ کے بیٹون کے زمانہ مین ظفر خان[لہ] گجرات بھیجے گئے، دلّی کی سلطنت اس وقت مردہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲)

چند روز کے بعد بکری رائے باغ وغیرہ مقامات اس کو جاگیر مین ملے اور دکن کی تعیناتی ہو گئی، محمد شاہ تغلق کی سخت مزاجی سے امرائے شاہی سب پریشان رہتے تھے، ایک بار کسی بات پہ ناراض ہو کر دکن کے امراو نے بغاوت کر دی، بادشاہ نے بہت کوشش کی مگر وہ بغاوت کا استیصال نہ کر سکا، بڑھتے بڑھتے یہان تک نوبت پہنچی کہ علاء الدین حسن کو لوگون نے اپنا بادشاہ بنا کر گلبرگہ مین ایک جداگانہ سلطنت قائم کر لی، حسن نے گانگو پنڈت کو بلا کر صدر محاسب (اکونٹنٹ جنرل) کا عہدہ دیا، اور اس خوبی سے ملک کا انتظام کیا کہ جو حصے اب تک اسلامی اقتدار سے باہر تھے وہ سب اس کے قلمرو مین داخل ہو گئے، اسی طرح گانگو پنڈت نے زراعت و محاصل ملک کی افزایش مین پوری تندہی اور محنت سے خدمتین انجام دین، جس کی وجہ سے اہل ملک مرفہ الحال اور خزانہ شاہی مالامال ہو گیا، حسن پہلا بادشاہ ہے جس نے برہمنون کو مالی صیغے دے کر شریک دولت بنایا، جب تک سلطنت بہمنیہ قائم رہی اور اس کے بعد طوائف الملوکی کے زمانہ مین بھی برہمنون کے متعلق یہ صیغے ہمیشہ رہتے رہے، اسی وجہ سے اس ملک مین برہمنون کا رعب و اقتدار بہ نسبت دوسرے ملکون کے زیادہ قائم ہو گیا ہے، اور اب بھی صوبہ مدراس مین یہ اثر نمایا ہے۔

[لہ] ظفر خان کے باپ کا نام سہارن تھا، نانک ان کی قومیت تھی جس کو کہا جاتا ہے کہ کھتریون کی ایک شاخ ہے، سہارن فیروز شاہ تغلق کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے، اور اپنی کارگذاری اور خوش قسمتی سے امارت کے درجہ تک پہنچے، وجیہ الملک ان کو خطاب ملا، ان کے بیٹے ظفر خان نے ان سے زیادہ ترقی کی، وہ ۷۹۳ھ مین گجرات کی حکومت پر سرفراز ہوئے، دلّی کی سلطنت فیروز شاہ کے بیٹون اور پوتون کی نااہلیت سے روز بروز برباد ہوتی گئی، اور گجرات مین ان کی حسن کارگذاری سے ان کی طاقت بڑھتی گئی، چند روز مین فیروز شاہ کی اولاد برباد ہو گئی اور ظفر خان کی اولاد نے تقریباً دو سو برس تک نہایت کر و فر سے سلطنت کی،

لاش کی حیثیت رکھتی تھی، انھون نے گجرات کو تسخیر کر کے ایک پائدار حکومت کی بنیاد ڈالی، جو تقریباً دو سو برس تک اُن کے خاندان مین رہی، بانیِ خاندان کی اصل و نسل ہندوستان کی سرزمین سے تھی، اور ملکی زبان اُن کی مادری زبان تھی، مگر شاہی دفتر فارسی مین تھا اور کاروبار بھی سب فارسی زبان مین ہوتے تھے،

تاہم اس مین کچھ شبہہ نہین کہ ملکیون سے وہ ملکی زبان مین بات چیت کرتے اور بے تکلف صحبتون مین وہ اسی کو کام مین لاتے تھے، مگر جس زبان مین وہ گفتگو کرتے تھے وہ خالص گجراتی زبان نہین ہوتی تھی،

زیادہ چھان بین کرنے سے مشائخ کے ملفوظات اور بادشاہون کے سوانح مین جستہ جستہ ایسے فقرے ملتے ہین جو کسی موقع پر ان کی زبان سے نکل گئے ہین، ان کو تبرک سمجھ کر یا موقع کی اہمیت کے لحاظ سے ان ہی کے الفاظ مین نقل بہ نقل تاریخ نے ہم تک پہنچا دیا ہے، اگر ان سب کو تلاش کر کے یکجا کیا جائے تو زبان کی درجہ بدرجہ تبدیلی کا حال خوب معلوم ہو سکتا ہے، مثال کے طور پر چند نمونے مین پیش کرتا ہون جو اس وقت پیشِ نظر ہین،

۱- سید جلال الدین حسین بخاری (مخدوم جہان جہانیان گشت) کے پوتے بارہ ۱۲ برس کے سن مین گجرات چلے آئے تھے اور یہین بود و باش اختیار کر لی تھی، نام و لقب ان کا برہان الدین عبد اللہ ابن محمود تھا، مگر گجرات والے ان کو "قطب عالم" کہتے ہین، ان کے بڑے بیٹے کا نام و لقب سراج الدین محمد بن عبد اللہ تھا، ان کو "شاہ عالم" کہتے ہین، یہ دونون باپ بیٹے اپنی خاندانی وجاہت کے ساتھ بڑے پایہ کے بزرگ بھی تھے، اسی وجہ سے شاہانِ گجرات ہمیشہ ان کے سامنے سرِ نیاز خم رکھتے تھے، جام جانو حاکم سندھ نے اپنی دو لڑکیون مین سے ایک کی نسبت شاہ عالم سے کر دی تھی، اور دوسری کی محمد شاہ بادشاہِ گجرات سے،

جس کی نسبت شاہ عالم سے ہوئی تھی وہ حسن وجمال مین اپنی بہن سے اچھی تھی، محمد شاہ کو اس کی خبر لگی تو اس پر زور و زر کا دباؤ ڈال کر نسبت بدلوا دی، شاہ عالم کو سن کر اس کا ملال ہوا، انھون نے باپ سے جا کر شکایت کی، اس وقت قطب عالم ایک حالت مین تھے، سُن کر اُن کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا، جو ان ہی کے الفاظ مین ہم تک پہنچا ہے،

بیٹے تیسا نصیب دھوون دیجہ[1]
تیرے دونوں

۲۔ قطب عالم ایک بار تہجد کی نماز کو اٹھے، پیشاب کرنیکے بعد کلوخ لیکر ٹہل رہے تھے، کہ رات کے اندھیرے مین کسی لکڑی یا پتھر سے پاؤن ٹکرایا، اور چوٹ آگئی، اس وقت آپ کی زبان سے بیساختہ نکل پڑا،

لوہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے[2]
لوہا لکڑی

---

[1] خدا کی قدرت دیکھو محمد شاہ کے مرنے پر اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا، محمد شاہ کا دوسرا بیٹا سندھ کی بیگم سے فتح خان تھا جو آگے چل کر محمود شاہ اوّل اور محمود شاہ بیگرہ کے نام سے مشہور ہوا ہے، اس کا سن اس وقت دس برس سے کم تھا، اُسکی مان کو احمد شاہ کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا، وہ اس خیال سے کہ فتح خان یا کہو محمود کو بھائی سے گزند نہ پہنچے، اس کو لیکر اپنی بہن کے پاس شاہ عالم کی خانقاہ مین چلی آئی، چند روز کے بعد بہن کا انتقال ہوگیا، شاہ عالم نے اسکو پیغام بھیجا کہ جب تک تمھاری بہن زندہ تھی تم محرم تھین اور ہمارے گھر مین رہ سکتی تھین، اب کوئی دوسرا انتظام کرو، اُس نے اپنے بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد کہلا بھیجا کہ میری نسبت آپ ہی سے ہوئی تھی، مگر بادشاہ نے میرے باپ پر دباؤ ڈالکر بدلوا دی، اب آپ مجھ کو اپنی لونڈی بنا کر رکھئے، یہ سُنکر شاہ عالم نے اس سے نکاح کر لیا، اور قطب عالم کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی، قطب عالم نے ۸۵۷ھ اور شاہ عالم نے ۸۸۰ھ مین وفات پائی،

[2] صبح کو دیکھا گیا تو وہ ایک ایسی چیز نکلی جس پر تینون چیزون کا شبہہ ہوتا تھا، اور تینون کی خاصیتین اس مین پائی جاتی تھین، اس کو لوگون نے عجیب چیز یا قطب کی کرامت سمجھ کر مدتون رکھ چھوڑا، اکبر شاہ نے جب گجرات فتح کیا ہے تو وہ بھی اُس کے دیکھنے کو گیا، اس قصہ کو نظام الدین، ابو الفضل اور فرشتہ نے اپنی اپنی تاریخون مین نقل کیا ہے،

۳- محمود شاہ اوّل کا سن دس برس کا تھا، اور وہ شاہ عالم کے گھر مین اپنی خالہ کے پاس رہتا تھا، اس کا بھائی احمد شاہ دوم برسر حکومت تھا، وہ چاہتا تھا کہ محمود شاہ کو اپنے قابو مین کرلے، اگر شاہ عالم کی وجاہت سے محلسرا مین داخل ہو کر اس کو نکال نہ سکتا تھا،

ایک دن معلوم ہوا کہ محمود فلان جگہ شاہ عالم کے پاس بیٹھا پڑھ رہا ہے، بادشاہ بنفس نفیس سوار ہو کر اُس جگہ دفعتہً پہنچ گیا، خادمون نے بغیر اجازت اندر داخل ہونے سے روکنا چاہا، مگر شاہ عالم نے آواز پہچان کر کہا آنے دو اور محمود کی طرف دیکھ کر فرمایا،

بڈھ ڈوکرے

بوڑھے بڈھے

بادشاہ آ کر دیکھتا ہے کہ ایک پیر مرد حضرت کے سامنے بیٹھا پڑھ رہا ہے، آ کر مسند پر بیٹھ گیا اور اثنائے گفتگو مین اِدھر اُدھر دیکھتا بھی رہا، جب محمود کو نہ پایا تو اُٹھ گیا، اور جا کر جاسوسون کو سرزنش کی،

محمود شاہ اوّل[1] کے عہد مین قاضی نجم الدین احمد آباد کے قاضی تھے، ایک دن اثنائے راہ مین

---

[1] محمود شاہ اوّل گجرات کا سب سے اچھا بادشاہ گذرا ہی، ۸۶۳ھ مین تخت نشین ہوا، اور ۹۱۷ھ مین وفات پائی، اور کچھ اوپر ۵۴ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی، یہ بادشاہ علوم وفنون کی سرپرستی مین اپنا آپ ہی نظیر تھا، شیراز و یمن سے علما و محدثین کثرت سے اس کے زمانہ مین آئے، اور اس نے ہر ایک کے مرتبہ کے موافق وظائف مقرر کئے اور عہدے دیئے، علاوہ اس کے دور دور سے صناع اور ہنرور لوگون کو بلا کر کام پر لگایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی، زراعت کو اتنی ترقی دی کہ گجرات کے سارے جنگل اور بیہڑ جت کر زمینین آباد ہو گئین، باغات خود بھی کثرت سے لگائے اور رعایا کو انعام دے کر حوصلہ دلایا کہ جس سے ہر طرف باغ ہی باغ نظر آنے لگے، محمد آباد، اور مصطفےٰ آباد اور محمود آباد، کے نام سے کئی شہر آباد کئے، انصاف اور عدالت کے قوانین بنائے، ان تمام باتون سے بالاتر یہ بات ہے جو میرے نزدیک اس کی زندگی کا پُر فخر کارنامہ ہو کہ اس نے توسیع سلطنت کے خیال سے اپنے ہمسایہ بادشاہ پر کبھی قوت آزمائی نہین کی، جو آسودہ حالی اس کے زمانہ مین اور اس کے لائق جانشین مظفر شاہ حلیم کے عہد مین رعایا کو تھی وہ کبھی گجرات والون کو نصیب نہین ہوئی،

سنار کے ہاتھ مین ایک نہایت خوبصورت رباب دیکھا جو مرصع بجواہر تھا، پوچھا کس کا ہے، اس نے کہا بادشاہ کا، یہ سنکر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زمین پر پٹک کر ٹکڑے کر ڈالا، بادشاہ کو خبر ہوئی تو ہنس کر فرمایا،

نیچی بیری ہر کوئی جھورے

مقصد یہ تھا کہ احتساب کا سارا زور ہم پر صرف کیا جاتا ہے، شاہ عالم کے یہان جا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہین کرتے جو دھڑتے سے سماع سنتے ہین،

۵۔ بہادر شاہ ایام شاہزادگی مین شیخ جیو کا مرید ہو گیا تھا اور انھون نے اس کو سلطنت کی بشارت دی تھی، سکندر خان کو جو ولیعہد اور صاحبِ اقتدار تھا یہ سُن کر ملال ہوا، اس وقت بہادر شاہ کی جاگیر مین صرف دو گاؤن تھے جن سے اس کا خرچ چلتا نہ تھا، اپنے والد مظفر شاہ حلیم کی خدمت مین کئی بار عرضداشت کی مگر جب ان کو متوجہ نہ پایا تو بغیر اجازت و اطلاع کے قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا، اُس وقت دلی کی سلطنت کا ڈھچر ڈھیلا ہو رہا تھا، امرا مین بد دلی پھیلی ہوئی تھی وہ اس کے خواہشمند تھے کہ مضبوط ہاتھون مین عنانِ سلطنت ہو،

پنجاب کے بعض امرا بابر شاہ مغل سے سازباز کر رہے تھے، جون پور کے لوگون نے بہادر شاہ کو دعوت دی، یہ منچلا تو تھا ہی اسی امید پر جون پور کا قصد کر کے روانہ ہو گیا،

ادھر بہادر شاہ نے وطن چھوڑ کر غربت اختیار کی، اُدھر اس کے پیر و مرشد شیخ جیو کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کی خبر سکندر لودی کو پہنچی تو خوش ہو کر طنز کے لہجہ مین کہا،

پیر ہوا مرید جوگی ہوا[1]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اب میدان صاف ہے، مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے تھوڑے ہی دنون کے بعد مظفر شاہ حلیم کا انتقال ہو گیا، ادھر سکندر خان تخت نشین ہوا، ادھر امرا نے بہادر شاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی، یہ وہ زمانہ ہے کہ بابر شاہ ہندوستان کی تسخیر کو آچکا تھا اور ابراہیم لودی سے برسرپیکار تھا، بہادر شاہ اس تماشے کو دیکھتا ہوا لوٹ پڑا، ہنوز گجرات

۷- بہادر شاہ کے پاس ایک طوطا تھا، جس کی میٹھی میٹھی باتین بادشاہ کو بہت پسند تھین اور اُس کو وہ اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷) نہین پہنچا تھا کہ بعض نمک حرامون نے سکندر شاہ کو صرف دو مہینہ سولہ دن بادشاہی کرنے کے بعد تخت سے کھینچ کر تختہ پر لٹا دیا، اور ایک کمسن بچہ کو تخت نشین کر دیا، بہادر شاہ کو اس واقعہ کی بھی اثنائے راہ مین اطلاع ہوئی، وہ کوچ در کوچ کرتا ہوا گجرات پہنچا اور ۹۳۲ھ مین عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ مین لے لی اور جس نمکحرام نے اس کے بھائی کو قتل کیا تھا اس کو بری طرح سے سزا دی،

بہادر شاہ گجرات کے بادشاہون مین سب سے زیادہ حوصلہ مند بادشاہ گذرا ہے، شجاعت اور بہادری کے لحاظ سے اسم بامسمّٰی تھا، مالوہ کا پورا ملک مع اس کے توابع اور ملحقات کے اس کے عہدِ دولت مین ممالکِ محروسۂ گجرات مین داخل ہو گیا تھا، اور دکن کی چار اسلامی سلطنتون نے اس کے نام کا خطبہ اپنے اپنے ملکون مین جاری کر دیا تھا،

چتور اور رنتھنبور جیسے فلک فرسا قلعے اس نے بڑی آسانی سے فتح کر لئے تھے، راجپوتانہ مین کوہ آبو تک جو آجکل ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے رہنے کا مقام ہے، اس نے اپنی عملداری کو بڑھا لیا تھا، اور کوشش یہ تھی کہ دلی کی شہنشاہی پر ہاتھ مارے، مگر افسوس ہے کہ رومی خان نے اس سے دغابازی کی اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا،

رومی خان اصل مین قسطنطنیہ کا بادشاہ تھا، سواحل یمن مین اس نے اپنی قوت بازو سے بہت سے مقامات پر قبضہ کر لیا تھا جب اس کو محسوس ہوا کہ سلطنتِ عثمانیہ کی جانب سے اس کی گیر و دار ہونے والی ہے تو بھاگ کر بہادر شاہ کے دامن مین پناہ لی، بہادر شاہ کو پرتگیزون سے ہمیشہ مقابلہ کرنا پڑتا تھا، اس نے اس کو کام کا آدمی سمجھ کر ڈیو، دمن، تھانہ، ماہم، راندیر، سورت وغیرہ مقامات جو سواحل پر واقع ہین اس کی جاگیر مین دیئے، اور اپنے یہان توپخانہ قائم کر کے اس کو نواب ناظر بنایا، اصلی نام مصطفےٰ بن بہرام تھا، بہادر شاہ نے رومی خان خطاب دیا تھا،

رومی خان کے خمیر مین بغاوت و سرکشی کا مادہ تھا، کسی بات پر ناخوش ہو کر اس نے دغابازی کی ٹھان لی، جب مالوہ مین ہمایون بادشاہ سے جنگ کی ٹھہری تو اس نے بہادر شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ تمام لشکر کو یکجا کر کے توپ خانہ کا قلعہ گھیر کر محصور ہو جائے، ہمایون اس ملک مین اجنبی ہے، رسد نہ ملنے سے چند روز مین بھاگ کھڑا ہو گا، امراء و وزراء نے کوشش کی کہ اس غلط مشورہ کو نہ مانا جائے مگر بہادر شاہ کے دل مین اس نے اتنا اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ اور کسی کی اس کے سامنے کچھ نہ چلی اور اس کے مشورہ پر عمل کیا گیا، اس نے جب دیکھا کہ یہ محصور ہو گئے تو ہمایون سے نامہ و پیام شروع کر دیئے، جو رسد بہادر شاہ کے واسطے آتی وہ دشمن لوٹ لیتا، آخرکار ایک شب اس نے میگزین مین آگ لگوا دی، ہمایون کو پہلے سے معلوم تھا، وہ اپنا لشکر لیکر ٹوٹ پڑا، یکایک اس واقعہ کے ہو جانے سے بہادر شاہ کا دل چھوٹ گیا اور اس کو وہان سے بھاگ جانے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہین آیا، ہمایون نے رفتہ رفتہ تمام گجرات پر قبضہ کر لیا، مگر اس کا قدم گجرات مین اچھے طور پر جمانہ تھا کہ شیر شاہ ایسے دشمن اور بھائیون ایسے مار آستین دوستون کے ڈر سے وہ آگرہ واپس آیا اور بہادر شاہ نے امرائے ہمایونی

جب مالوہ مین رومی خان کی نمکحرامی سے ہمایون بادشاہ کے مقابلہ مین اس کو شکست ہوئی، اور بہادر شاہ کو بے سر و سامانی کے ساتھ گجرات بھاگنا پڑا تو اس کے طوطے کا پنجرا بھی مالِ غنیمت کیساتھ ہمایون بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا طوطے کی حیرت انگیز باتون کو سنکر بادشاہ دنگ ہو رہا تھا کہ رومی خان بھی حاضر ہوا، بادشاہ نے فرمایا "بیائید رومی خان" اس کا نام سننا تھا کہ طوطا چیخنے لگا،

پھٹ رومی خان حرام خور، پھٹ رومی خان حرام خور

قرینہ یہ ہے کہ رومی خان کی نمکحرامی سے بہادر شاہ کو شکست ہوئی ہوگی تو اُس کے لشکر کے بچہ بچہ کی زبان پر یہ فقرہ چڑھ گیا ہوگا اور اس طوطے کو بھی سنتے سنتے یاد ہو گیا ہوگا جس وقت ہمایون شاہ کی زبان پر رومی خان کا نام آیا، اُس کو سُن کر وہ فقرہ یاد آگیا، اور اس کو دہرانے لگا،

مین نے یہ چند مثالین صرف ایک کتاب مرأۃ سکندری سے لی ہین، اگر بزرگانِ دین کے ملفوظات مین جستجو کی جائے تو اردو کی درجہ بہ درجہ ترقی پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے،

اب اُردو شاعری کی حقیقت سنو

زیادہ چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کا ظہور دکن سے ہوا ہے، اس کا ایک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸) کو گجرات سے نکال کر پھر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کی، مگر اس کی تقدیر نے اس کو چند روز کی مہلت بھی نہ دی، اب پرتگیزون سے اس کو سابقہ پڑا اور یہ رومی خان سے بھی دغا باز نکلے، پرتگیزون نے دعوت کے بہانہ سے بلا کر اس قصہ کو ۹۴۳ھ مین ہمیشہ کے لئے تمام کر دیا، اور اس طریقہ سے ڈیو، ڈمن اور تھانہ وغیرہ ان کے قبضہ مین آگئے، جن مین سے ڈیو اور ڈمن اب بھی ان ہی کے قبضہ مین ہین،

رومی خان کا انجام یہ ہوا کہ ہمایون بادشاہ نے اس کو چنار گڈھ کے فتح کرنے پر مامور کیا، اور فتح ہو جانے پر اُسکو اسی کی جاگیر مین دیدیا، مگر تھوڑے دن نہین گذرے تھے کہ زہر ہلاہل سے اس کا کام تمام کر دیا گیا،

خاص سبب ہے، جس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنیکی حاجت ہے،

دلی مین قطب الدین ایبک سے لیکر اکبر شاہ تیموری تک جتنے بادشاہ ہوے، ترک ہون یا افغان سید ہون یا مغل، ان مین بیشتر ولایت زا ہوے، اور اگر ان کی اولاد بھی برسرِ حکومت ہوئی تو وہ بھی آئین وقوانین مین اپنے اسلاف کی پیروی کرتی تھی،

شاہی زبان ہمیشہ فارسی رہی اور اسی زبان مین شاعرون کو اپنے جوہرِ قابلیت کے چمکانے کا موقع ملتا رہا، جس طرح سے آج انگریزون کو ہندوستانیون سے الگ تھلگ رہنا پسند ہے یہان تک کہ اپنی چھاؤنیان ہندوستانی آبادی سے دور تر مقامون پر قائم کرتے ہین، اتنا تو وہ اپنی رعایا سے کھنچے نہین رہتے تھے تاہم رعب وداب قائم رکھنے کو زیادہ میل جول بھی نہین کرتے تھے،

سب سے پہلے اکبر بادشاہ نے مصالحِ ملکی کے لحاظ سے قرابت ویگانگت ہندؤن سے پیدا کی اور چاہا کہ جو پردہ بادشاہ اور رعایا مین بیگانگی کا حائل ہے وہ اٹھ جائے، تاہم شاہی زبان فارسی رہی، اور چنگیزی وتیموری تورہ پر آئین وقوانینِ سلطنت کی بنیاد باقی رہی،

بادشاہ وامرا سب کے سب فارسی بولتے اور ترکی زبان کے سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے، تم دیکھتے ہو کہ محمد شاہ رنگیلے جن کی سات پشتون نے ہندوستان کی آب وہوا مین پرورش پائی ہے، اور ان مین سے ایک نے بھی ترکستان کی ہوا نہین کھائی، وہ بھی ترکی زبان بولتے تھے اور فارسی کو اپنی مادری زبان سمجھتے تھے، اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہندوستان کے نام برآوردہ فارسی شعرا مین امیر خسرو، میر حسن، فیضی، غنی، بیدل، غنیمت اور ناصر علی جیسے چند نفوس کے سوا تمام تر وہی اہلِ سخن ہین جو

---

[1] محمد شاہ جن روزون سادات کے پنجہ مین گرفتار تھے اور سادات کی مرضی کے خلاف سانس بھی نہین لے سکتے تھے، اس زمانہ مین اعتماد الدولہ محمد امین خان کو اگر کبھی موقع مل جاتا تو ترکی زبان مین گفتگو کرکے اپنا کام نکال لیتا تھا، دیکھو سیر المتاخرین ص ۴۳۳ مطبوعہ نول کشور پریس،

وقتاً فوقتاً شاہانِ ہند کی فیاضیون کا شہرہ سُن کر ایران سے ہندوستان آئے اور یہین کے ہو رہے اور ان کی زبان فارسی، نتائجِ فکر فارسی، اُن مین سے بیشتر ساری عمر ہندوستان مین رہ کر ملکی زبان سے ناآشنائے محض رہے، لیکن ہندوستان مین بہت کم ایسا ہوا ہے کہ دور ترین صوبے شہنشاہی طاقت کے زیرِ اقتدار ہمیشہ رہے ہون، کشمیر مین ظہور اسلام سے لے کر اکبر شاہ کے زمانہ تک ہمیشہ آزاد حکومت برسرِ اقتدار رہی، وہان کے بادشاہون نے شاہانِ دہلی کے سامنے کبھی سرِ نیاز نہین جھکایا، بنگال اور سندھ کبھی آزاد اور کبھی ماتحت ہوتے رہے، دکن مین محمد شاہ تغلق کے ناروا تشدد سے ایسی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی جس کی یادگار عالمگیر مرحوم کے زمانہ تک باقی رہی، گجرات، مالوہ اور جونپور مین فیروز شاہ کے بعد آزاد سلطنتین قائم ہوئین، جو سیکڑون برس تک زندہ رہین،

یہ حکومتین بیرونی حملون سے ہمیشہ بے خوف رہین، ایران و توران سے جو بادل گھر کر آتے تھے وہ دلی پر گرج برس کر نکل جاتے تھے، یا جو بجلی گرتی تھی وہ دلی پر گرتی تھی، آج غلامون کی سلطنت ہے، کل خلجیون کی، پرسون تغلق کی، کبھی سید برسرِ حکومت ہین، کبھی افغان، کبھی مغل، جو آیا اس نے سب پچھلون کو مار ہٹایا اور خود تاج و سریر کا مالک بن بیٹھا، ایک تیموریون نے کئی سو برس حکومت کی، باقی وہ دو دو تین تین پشتون سے زیادہ نہین چلے،

یہ حالت ان بادشاہون کی نہ تھی جو اطرافِ ہند مین برسرِ حکومت تھے، جس خاندان مین سلطنت آئی، آخر تک اسی خاندان مین رہی، علاوہ اس کے کچھ خاندان ان مین ایسے تھے جو خالص ہندی النسل تھے اور نہین بھی تھے تو دو چار پشتون کے بعد ہندی ہو گئے تھے، خصوصاً دکن مین جہان ملکی اور غیر ملکی کے جھگڑون سے صفحاتِ تاریخ بھرے پڑے ہین،

معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دکن مین عصبیت کا مادہ زیادہ تھا، ان کو غیر ملکیون کی ہر چیز سے نفرت تھی، غریب کُشی کا تماشا دیکھنا ہو تو تاریخ فرشتہ مین بیجاپور، احمد نگر اور گلکنڈہ کے حالات پڑھو، اسی

کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی مستقل ہستی قائم کرنے کو زبان اور شاعری مین بھی غیر ملکیون سے الگ رہنا چاہتے تھے ،

افسوس ہے کہ ہم اس کا ٹھیک زمانہ متعین نہین کر سکتے کہ دکنی زبان فارسی آمیز مین شعر و سخن کا آغاز کس وقت سے ہوا ہے مگر جیسا کہ قاعدہ ہے ہندی دوہرون مین پہلے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبون کی آمیزش ہوئی ہوگی اور اس کے بعد فارسی بحرون کو اختیار کیا گیا ہوگا اور سرکاری تقریبون مین بادشاہون کی تعزیت و تہنیت کا کام اس سے لیا گیا ہوگا، پھر رفتہ رفتہ دیگر اصناف سخن اس مین آگئے ہونگے، آخر کار رقص و سرود کی محفلون اور عزاداری کی مجلسونکی گرمی ہنگامہ اسی پر موقوف رہ گئی ہوگی ،

ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کا بادشاہ تھا، اس کو ہندوستان کی موسیقی سے محبت نہین عشق تھا، اور اس مین ایسا کمال پیدا کیا تھا، کہ اس زمانہ کے تمام گوئیے اس کو جگت گرو کہتے تھے ،

ابراہیم سنہ ۹۸۸ھ مین تخت نشین ہوا، نو برس کی عمر تھی، دس برس تک دکنی امرا کی نگرانی مین رہا اور دکنیون کے زور سے غیر ملکی اس کے گرد و پیش سے خس و خاشاک کی طرح نکال پھینکے گئے، ایرانیون کا زور بہت کچھ گھٹ گیا، بادشاہ خود ہندوستان مین پیدا ہوا، ہندوستان مین پرورش پائی، ہندوستانیون پر حکومت کرنے کا موقع ملا اور خدا جانے طبعی مناسبت یا اثر صحبت سے ہندوستان کی موسیقی کا شوق پیدا ہوا اور ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین ہزار گوئیے بیجاپور مین جمع کر لئے ،

سنہ ۱۰۰۰ھ مین بیجاپور کے قریب نورس پور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس مین گرد اور چیلون کے لئے بڑی بڑی محلسرائین، عمدہ عمدہ باغات، صاف اور ستھرے بازار تھوڑے دنون مین بن کر تیار ہو گئے، شاہی محلسرا کا نام نورس محل، شاہی مہر پہ نورسی، سکہ پر نورس، علم و نشان کے نام

نورسی، دھرپد مین ایک کتاب ملکی زبان مین لکھی تھی، اس کا نام نورس نامہ، ظہوری نے اس کا دیباچہ فارسی مین لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے، اس کا نام دیباچۂ نورس نامہ قرار پایا،

مثل ہے ''الناس علیٰ دین ملوکھم'' بعض شاعرون نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا، ظہوری فارسی نژاد فارسی زبان کا مشہور شاعر ہے، وہ بھی فارسی مین ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے نمونہ ملاحظہ ہو،

سپہر از سر افرازیش در حساب   زچوکھنڈلیش سایہ بر آفتاب

ایک جگہ ساقی نامہ مین لکھتا ہے،

شود چہرۂ زرد خورسند آل   دہندش اگر نازنینان اگال

ابراہیم کو خود راگ اور راگنیون کو ترکیب دینے اور اپنی زبان مین شعر کہنے کا شوق تھا جو کچھ تصنیف کرتا گویون کو سناتا، وہ اس کو یاد کر کے پھیلاتے تھے، رفتہ رفتہ ملکی زبان مین جو نہ خالص ہندی تھی بلکہ عربی اور فارسی الفاظ کے امتزاج سے ایک نئی زبان ہو گئی تھی، طبع آزمائی کرنے کا شوق عام ہو گیا، اور بڑھتا گیا، یہان تک کہ فارسی بحرون مین کہنے لگے،

گلکنڈہ مین محمد قلی قطب شاہ اسی ابراہیم کا معاصر، نہایت علم دوست، ہنر پرور بادشاہ تھا علوم و فنون مین مہارتِ کلی رکھنے کے ساتھ رنگین مزاج بھی تھا، عنفوانِ شباب مین بھاگ متی نام ایک عورت پر ایسا شیفتہ ہوا کہ گلکنڈہ سے چھ میل کے فاصلہ پر اپنی معشوقہ کے نام سے بھاگ نگر ایک شہر آباد کیا اور اس مین عمدہ عمدہ محلسرائین اور باغات تیار کرئے، بھاگ متی کے مرنے پر جوشِ محبت سرد ہوا تو بھاگ نگر کا نام بدل کر حیدرآباد رکھا جو آج دولتِ آصفیہ کا پایہ تخت ہے،

محمد قلی شاعر بھی تھا، فارسی اور اردو مین شعر کہتا تھا، اس کا مکمل دیوان نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ مین، اور کتب خانۂ آصفیہ مین اس کا ضخیم کلیات اصنافِ سخن سے مملو موجود ہے

جو قطب شاہی خاندان کا شاہی نسخہ ہے کلام کا نمونہ اس لحاظ سے دیکھو کہ اردو کلام کا سب سے قدیم تر نمونہ جو ہم تک پہنچ سکا ہے، وہ یہی ہے، اس سے پہلے کا کوئی شعر کم از کم میری نظر قاصر سے نہین گذرا،

پیا ہون حضرت کے ہت ہاتھ آبِ کوثر
تو شاہان اپر مجھ کلس کر بنایا

سدا تو مدحِ نبیؐ و علیؓ کہ کہتا ہے
معانی شعر ترا تو لکھے ہین دست بدست

خورشید کہ اُپر سے ابرو ہلالِ عید
اس ابروان کو سجدہ کیا ہو وصالِ عید

ہے محمد قطب شہ بارہ امامان کا غلام
ہین سو عاجز داس ٹھہرایا علیؓ سیج دستگیر
آیت قرآن نازل جیون ہوا حضرتؐ کے تئین
مرتضیٰؓ ہین بس دو جگ مین جیون محمدؐ بے نظیر

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۲۲ھ مین وفات پائی، اس کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ تخت و تاج کا مالک ہوا، یہ بھی شاعر تھا، فارسی مین ظل اللہ اور دکنی فارسی آمیز مین قطب شہ تخلص کرتا تھا، اس کا دیوان مکمل سالار جنگ کے کتب خانہ مین موجود ہے، ۱۰۳۵ھ مین اس نے وفات پائی، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

پیا سانولا من ہمارا بھولایا
نزاکت عجب سبز رنگ مین دکھایا

بے دام اس کا خدمت کرتا ہون اپنی دل سون
دیتے ہین دام ان کو ہور کرتے ہین عنایت

بکر ید عید آیا صلوات بر محمدؐ
آنند علم اجایا صلوات بر محمدؐ

انجانے مین جوانی گیا پند نا سنا   قرآن اور حدیث سون ترکیب کر کلام

ساقیا آ شراب ناب کہان   چندر کی پیالی مین آفتاب کہان

سلطان محمد قطب شاہ کے بعد اس کا بیٹا عبد اللہ قطب شاہ بادشاہ ہوا، وہ بھی شاعر تھا ۱۰۸۳ھ مین اس نے وفات پائی، یہ بھی صاحبِ دیوان گذرا ہے، ؎

گفتم کہ خال ذرلفت کیا ہے سو بول منجکو   گفتا کہ زلف دامت ہور خال سو ہے دانا

اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب   دیکھتا ہون تو رہے نا منجہ مین تاب
قند اور نابات گلتا ہے اچھون   دے نہ سک تری مٹھی لب کا جواب

راز کی باتان نبی کے صدقے پوچھیگا اگر   شاہ عبد اللہ کو پوچھ آ کر کہ ہے حاضر جواب
آب حیات تھی ہے زیادہ کہ لب ترا   کرتے ہین منجون خضر علیہ السلام بحث

یہ تینون سرزمینِ دکن کی سلطنت کے ساتھ ملکِ سخن کی بھی حکومت رکھتے تھے، مین نے ان تینون کا مندرجہ بالا کلام آصفی کے تذکرہ سے نقل کیا ہے، اور ظنِ غالب یہ ہے کہ ان کے زمانہ مین بہت سے باکمال شاعر ہوئے ہونگے جو اسی زبان مین شعر کہتے ہون گے، اس واسطے کہ بادشاہون کا میلان جس جانب ہوتا ہے اسی جانب لوگون کے خیالات متوجہ ہو جاتے ہین، اور نہ سہی مراثی یا بادشاہِ وقت کی مدح مین قصیدے اسی زبان مین کہے جاتے ہون گے، مگر افسوس ہے کہ اس کے علم کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہین،

البتہ بیجاپور کے شعرا مین سے مولانا نصرتی، ملا ہاشمی، اور میرزا ان مرثیہ گو کا ذکر بساتین السلاطین

مین زبیری نے کیا ہے، اور نصرتی کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہین،

نصرتی محمد عادل شاہ کے زمانہ کا شاعر ہے جو علی عادل شاہ کے اخیر زمانہ تک زندہ رہا، اس کی تصنیفات مین گلشنِ عشق ایک مثنوی ہے، اردو مین منوہر کنور اور مدمالتی کا قصہ اس مین نظم کیا ہے، دوسری کتاب علی نامہ اردو مین ہے، شاہ نامہ فردوسی کا جواب، اس مین علی عادل شاہ بیجاپوری کے فتوحات بیان کئے ہین، ایک مجموعہ قصائد ہے، ایک غزلون کا دیوان ہے،

ان کتابون کے علاوہ ایک پرانی بیاض میری نظر سے گذری ہے جس مین نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل ہے، تاریخ کتابت ۲۲ محرم سنہ ۱۰۸۳ھ اس مین درج ہے، اور اکبر آباد مین لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نصرتی کا کلام ان ہی کی زندگی مین اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس کی نقلین بیجاپور سے اکبر آباد پہونچ گئین، معراج نامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمد عادل شاہ متوفی سنہ ۱۰۶۷ھ کے عہد مین لکھا گیا ہے کیونکہ اس کو اسی بادشاہ کے مدحیہ اشعار پر ختم کیا گیا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو،

حمد ہے منعم کبیر الخلق پہ اس دور کے　　ہے جو سمیِ رسولؐ خسرو ملکِ دکن
منبعِ لطف و عطا، حامیِ دین باوفا　　معدنِ جود و سخا، ماحیِ کفر کہن
صاحبِ فضل و ہنر صف شکنِ بحر و بر　　ملجاءِ فتح و ظفر بادیِ شمشیر زن
غازیِ صفدر کے دل بل سون نکلتے تہین　　دھاک سون بھاری بہیا کرت تمت ترہن
زور سے
ہوئیں جلد جلد
شہ سا پچھن تول کون ہے جگ مین کہو　　یاد سے جس رسم کے جاے کدورت محن
دنیا　اچھا
راج سون شہ کے سدا حق بھی دعا من پا　　جیو سے منگے برت پسار دور کے سب مرد و زن
دل　مانگ　ہاتھ　پھیلا کر　تن
لطف سون وہر یا الہ شاہ کی شاہی تلک　　جگ مین چلاک برا چھین عیش دھرم کے
انجمن
جام سون عشرت جم بزم یہ معمور اچھو　　چرخ مین دن رین لک کرم مین جیون ا
شہ کی ثنا نصرتی نغز و نول یون لکھی　　دور کے دفتر اوپر پر اچھے ہر یک بچن

اسی دور کے دوسرے شاعر ملا ہاشمی تھے جو سید ہاشم حسینی کے مرید اور نظر یافتہ تھے، یہ بھی صاحب دیوان ہین، اور یوسف زلیخا کا مشہور قصہ اردو کی ایک مثنوی مین انھون نے نظم کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اُن کے کلام کا نمونہ زبیری نے بساتین السلاطین مین نہین دیا،

آصفی نے محبوب الزمن مین ان کا تذکرہ کیا ہے، مگر ان کا نام شاہ ہاشم بیجاپوری بتایا ہے، اور سنہ وفات سنہ ۱۱۹۰ھ ظاہر کیا ہے، یہ دونون باتین میرے نزدیک صحیح نہین، بیجاپور کی جو تاریخین پیش نظر ہین ان مین ان کا نام مذکور نہین، سید ہاشم یا شاہ ہاشم ان کے پیر و مرشد کا نام تھا، جو حضرت شاہ صبغۃ اللہ گجراتی مہاجر مدینہ طیبہ کی اولاد مین بہت عالی مرتبہ درویش تھے، سنہ وفات کی غلطی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ نصرتی کے معاصر اور علی عادل شاہ کے زمانہ کے شاعر اور سید ہاشم موصوف الصدر کے مرید ہین، کیا عجب ہے کہ سنہ ۱۰۹۰ھ کی جگہ سنہ ۱۱۹۰ھ غلطی سے درج کر دیا گیا ہو،

آصفی نے دو شعر بھی ایک جگہ نقل کئے ہین جو بجائے ریختہ کے ریختی مین ہین، ان شعرون کی زبان نصرتی کی زبان سے ٹکر نہین کھاتی، اس لئے عجب نہین کہ وہ شعر بھی کسی اور کے ہون،

اسی زمانہ کا ایک اور شاعر میرزان ہے، جو صرف مرثیے کہتا تھا، حمد و نعت و منقبت کے سوا کبھی اپنی زبان کو دوسری چیزون سے اس نے آلودہ نہین کیا، اس نے علی عادل شاہ کے عہد مین وفات پائی، اور افسوس کہ بساتین السلاطین مین زبیری نے اس کے کلام کا بھی نمونہ نہین دیا،

ان تینون کے سوا بیجاپور مین اور بھی شعرا گذرے ہین، مگر افسوس ہے کہ ان کے اتنے حالات بھی نہین ملتے جس سے بیان کا سلسلہ قائم رکھا جائے، بیجاپور کی تباہی سے ان سب کا نام بھی مٹ گیا، اور بچے کھچے حیدرآباد آبسے اور وہین کے ہو گئے،

ابو الحسن تانا شاہ کا زمانہ تھا، جو عبد اللہ قطب شاہ مذکور کا داماد و جانشین اور شعر و سخن کا شگفتہ

تھا اس نے ان لوگون کی سرپرستی کی، میر حسن اور مرزا علی لطف نے اپنے تذکرون مین صرف ایک ہی شعر تاناشاہ کا نقل کیا ہے جو پیش کرتا ہون،

کس در کہون جاؤن کہان مجھ دل یہیں بھراتا ہے
اک بات کے ہون گے سجن یہان جی بنی بارہ بات ہے

تاناشاہ[1] کے مصاحبون مین شاہ قلی خان شاہی ایک مرثیہ گو شاعر تھے، میر حسن کہتے ہین کہ ان کے اشعار دکن سے ہندوستان بڑے شوق سے لوگ لایا کرتے تھے ان کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو،

ملنا تمھنکا غیر سے کر کوئی جھوٹ کوئی سچ مجھ کہے
کس کس کا منھ موندون سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

ابوالقاسم مرزا ایک شاعر تھے جو تاناشاہ کے مصاحب اور معزز طبقہ کے لوگون مین تھے حیدر آباد کی تباہی کے بعد لباس درویشانہ پہن کر گوشہ نشین ہو گئے تھے، عبد اللہ گنج مین رہتے تھے اور وہین زیر خاک سوتے ہین ان کا بھی ایک شعر میر حسن کی زبانی سنئے،

عارض نہین چندر کا تری گال سون اچھا
سمجھین ہمن کلف کو نہ تجھ خال سُن اچھا

حیدر آباد کی تباہی کے بعد اورنگ آباد مین اکثر لوگون نے پناہ لی، عالمگیر مرحوم کی عمر کا بیشتر حصہ وہین بسر ہوا ہے اور اس تقریب سے دلی اور اکبر آباد کے ہر طبقہ کے امرا، علما، مشائخ جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا واسطہ اور تعلق تھا، اورنگ آباد آرہے تھے،

ایک مدت تک اردو شاعری کا مرکز اورنگ آباد رہا، بہت سے شعرا وہان جمع ہو گئے، شمس ولی اللہ کے عروج و اقبال کا ستارہ بھی وہین چمکا، ان کے سوا اور جو شاعر وہان ہوئے ان مین سے پچیس تیس شاعرون کا ذکر میر تقی میر نے اپنے تذکرہ مین سید عبد الولی عزلت کی بیاض سے نقل کر کے کیا ہے اور اس سے کچھ زیادہ میر حسن نے لکھا ہے، مگر افسوس ہے کہ ان دونون کو ان شاعرون کے

---

[1] تاناشاہ کی درسی کتابین لکھی ہوئی ہین، مین نے مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتب خانہ مین جلالین کا ایک نسخہ دیکھا ہے جس مین دو ایک مقامون پہ تاناشاہ کے حاشیے چڑھے ہوئے ہین،

حالات اور اشعار نہین ملے صرف ایک ایک دو دو شعر لکھدیئے ہین میر صاحب کی راے ان شعرا کے متعلق اچھی نہین ہے، گر ہم نے شعراے دکن کے ذکر مین یہ بات ثابت کی ہے کہ میر صاحب کی یہ راے ان کی ناواقفیت پر مبنی ہے[1]،

اُس زمانہ مین اردو شاعری نے اتنا اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ جو لوگ ولایت زا ہوتے تھے اور ان کو اردو زبان مین بولنا بھی نہین آتا تھا وہ بھی اس مین طبع آزمائی کرنا فخر سمجھتے تھے،

مرزا معز الدین فطرت عالمگیری امرا مین بڑے پایہ کے شاعر تھے موسوی خان خطاب تھا، اسی مناسبت سے معز، فطرت اور موسوی تین تخلص اختیار کئے تھے، انھون نے اُردو مین شوق پورا کیا ہے، ملاحظہ ہو،

از زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

قزلباش خان امید اسی زمانہ کے بڑے نامور شاعر ہین اور اہلِ ہند کے ساتھ اُن کے جلسون کی گرم جوشیان مشہور ہین، مگر اردو مین جو اظہارِ کمال کیا ہے[2] وہ یہ ہے،

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ مون پڑی
غصہ کیا دگالی دیا اور دگر لڑی

اُردو شاعری کا مرکزِ ثقل دکن سے دلی کو منتقل ہوتا ہے

عالمگیر مرحوم کے جنت نصیب ہونے کے بعد بیٹون اور پوتون مین سلطنت کے حصے بخرے کرنے مین خون کی ندیان بہنے لگین اور اس کا سلسلہ بیس پچیس برس تک قائم رہا بلکہ یون کہنا چاہیے کہ

---

[1] اب تک اورنگ آباد اور اس کے نواح کے قصبات کی زبان وشائستگی حیدرآباد و نواحِ حیدرآباد سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس مین دہلویت زیادہ محسوس ہوتی ہے، قزلباش خان امید کا یہ شعر غالباً اس زمانہ کا ہے جب ان کا قیام اورنگ آباد مین تھا، آخر عمر مین دلی آ رہے تھے وہان جو طبع آزمائی کی ہے اس کا نمونہ آگے چل کر آئے گا،

محمد شاہ کی مدت سلطنت کو چھوڑ کر آخر تک رہا اور اس نے سلطنت کا کھوج لگایا،

بہادر شاہ عالمگیر کے بڑے بیٹے نے تقریباً پانچ برس تک اور فرخ سیر بہادر شاہ کے پوتے نے چھ برس سلطنت کی، مگر بہادر شاہ ملایانہ مزاج کے آدمی مذہب کی دھن مین ایسے لگے کہ ان کا سر پیر اسی سے نہین چھوٹا، فرخ سیر بادشاہ گرون کے پنجۂ غضب مین گرفتار تھے اس عرصہ مین کسی کو چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع نہین ملا، محمد شاہ کے زمانہ مین سادات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اس وقت اِدھر اُدھر سے سمٹ کر دلّی مین سب لوگ مجتمع ہو گئے، محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا، امراے دربار برسون سے خانہ جنگیان کرتے کرتے تھک چکے تھے ہتھیار کھول کر سب عیش و عشرت مین پڑ گئے، "شاعری اور بے فکری" مثل مشہور ہے، قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان وداد، علی قلی خان ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خان فراق، میر شمس الدین فقیر، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو ایسے بڑے بڑے صاحبِ فضل و کمال دلّی مین مجتمع تھے، شمس ولی اللہ دکن سے آ گئے، فراقی، فخری، آرزو، وغیرہ بھی دکن سے آئے مگر واپس گئے، ولی کچھ دنون کو رہ گئے اور ان کا رنگ دلّی مین خوب جما، ہر طرف سے قدردانی کی گئی، معرفت کی محفلون مین قوال ان ہی کی غزلین گانے لگے، اور اربابِ نشاط یارون کو سنانے لگے، جو شعراء صرف فارسی مین اظہار خیال کرتے تھے، ان کو اردو مین بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، قزلباش خان امید کا ایک شعر تم اوپر دیکھ چکے، دو شعر ان کے اور سنو،

در و دیوار سے اب صحبت ہے — یار بن گھر مین عجب صحبت ہے

تیری آنکھون کو ڈرتا ہون — الحفیظ الحفیظ کہتا ہون

ایک شعر پہلے پڑھ چکے، دو یہ ہین، ان تینون کو ملا کر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر کسی اور کا ہے،

یا پچھلے دو شعر امید کے نہین ہین، مگر نہین یہ تینون شعر ان ہی کے ہین، پہلا شعر اس وقت کا ہے جب ان کو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا، اور یہ دکن مین تھے، ہندوستان مین رہتے رہتے زبان اتنی صاف ہو گئی تھی کہ یہ دو شعر نہایت صاف اور سادہ کہہ سکے، میر تقی میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونون شعر دلی کی کمائی ہین،

مرزا عبد القادر بیدل بھی دورِ عالمگیری کے شاعر ہین، یہ بھی فارسی مین اظہارِ کمال کرتے تھے، مگر جب اردو کی گرم بازاری دیکھی تو انھون نے اس مین بھی شوق پورا کیا، ان کے بھی دو شعر نکات الشعرا سے نقل کرتا ہون،

مت پوچھ دل کی باتین وہ دل کہان ہے ہم مین   اس تخمِ بے نشان کا حاصل کہان ہے ہم مین
جب دل کے آستان پر عشق آن کر پکارا   پردے سے یار بولا بیدل کہان ہے ہم مین

مرزا علی قلی خان ندیم بھی فارسی کے مشاق شاعر ہین، مگر اردو مین بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کی ہے ؎

جدائی مین تری ہم کیا کہین کس طرح جلتے ہین   بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہین

بیقرارِ عشق کو ہے زندگی نقصِ کمال   مر چکی سیماب تب کہتے ہین یہ اکسیر ہے

مرزا مرتضیٰ قلی فراق بھی فارسی کے کہنہ مشق شاعر ہین، اردو مین فرماتے ہین، اور خوب فرماتے ہین

تماشا اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے   کہ یان اک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے
اسیرون کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن مین   کوئی ان ہمنواؤن سے ہمین بھی یاد کرتا ہے

میر شمس الدین فقیر فرماتے ہین ؎

زندگی موجِ آب ہے گویا   دم کا آنا حباب ہے گویا

خال اس کی بیاضِ گردن کا نقطۂ انتخاب ہے گویا

سراج الدین علی خان آرزو بھی فارسی کے قادر الکلام شاعر ہیں، میر تقی میر نے ان ہی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی ہے، وہ بھی کبھی کبھی اردو میں طبع آزمائی فرماتے تھے، آزاد نے ان کو دوسرے دور کے اردو شعرا میں جگہ دی ہے، مگر یہ آزاد کی زبردستی[1] ہے مجھکو آرزو کے فضل و کمال میں کلام نہیں، مگر اردو کے دو چار شعر کہہ لینے یا شعرائے ریختہ کو عروض وقافیہ

---

[1] آزاد کی زبردستی اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑا ظلم انھوں نے یہ کیا ہے کہ میر اثر، قائم، یقین، ہدایت، حزین، بیان، بیدار ایسے اردو کے مشاق شاعروں اور استادوں کو تو کہیں جگہ نہیں دی، باوجودیکہ قائم کے ذکر میں خود فرماتے ہیں کہ ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے نیچے نہیں رکھ سکتے، پھر معلوم نہیں کہ اس غریب کو کیوں نظر انداز کیا، یہ عذر کہ قبول عام اور شہرت نہ پائی عذر بدتر از گناہ ہے،

مزہ یہ ہے کہ میر غلام حسین ضاحک کو میر و مرزا کی صف میں اور میر مستحسن خلیق کو ذوق و غالب کے دور میں جگہ دی ہے جن کے دو چار شعر بھی نہیں ملے کہ آب حیات میں درج کرتے، آزاد ہی پر موقوف نہیں ضاحک کے فرزند رشید میر حسن کو بھی اپنے تذکرہ میں درج کرنے کو باپ کے صرف تین شعر ملے ہیں، بات یہ ہے کہ میر ضاحک کی طبیعت جیسا کہ ان کے تخلص سے ظاہر ہے، ہجو اور ہزل پر فریفتہ تھی اور زبان ایسی نرالی ایجاد کی تھی جس کو وہ سمجھیں یا خدا سمجھے، میر حسن ان کے بیٹے بطور معذرت کے فرماتے ہیں کہ "باوجود قوت آن علم کہ در ہجو مولوی ساجد بکار بردہ چون طبائع سامعان، درخور سخن خود نیافتند بقدر حوصلۂ آنہا بہ طرف ہزل نوشتن قلم راندند لیکن زبان عجیب و غریب طرح کردہ اند کہ از آدم تا ایندم کسے نہ گفتہ چنانچہ یک مطلع رقم می نماید"

یا ایہا الناس نگہ کردیہان جہلانکہ

کل تو پچی پہ ابیہ فرو بکاسرہ

پڑھالینے سے اُن کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ اردو شعرا کی صف میں اُن کو جگہ دیجائے، اگر ایسا ہوسکتا ہو تو مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا معزالدین فطرت، قزلباش خاں اُمید، شمس الدین فقیر، اور علی قلی ندیم نے کیا قصور کیا ہے، اُنھوں نے بھی دو دو چار چار شعر اردو میں کہے ہیں اور اُردو شعرا کے کلام میں اصلاح دی ہے، اور اُن کو شاعری کے گر بتائے ہیں،

بہرحال سراج الدین علی خاں آرزو نے اردو میں طبع آزمائی فرمائی ہی جس کا نمونہ یہ ہے

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

میخانے بیچ جا کر شیشے تمام توڑے
زاہد آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

جن حضرات کا ذکر میں نے اس جگہ کیا ہے، ان کے سوا اور بھی چند لوگ ہیں جو باوجود فارسی میں کہنہ مشق ہونے کے اردو میں بھی کبھی کبھی شوق پورا کرتے تھے، مگر سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں،

مقصد اس تحریر کا یہ ہے کہ اردو شاعری کا آغاز بیجاپور یا حیدرآباد سے ہو اگر بیجاپور کو راس نہیں آئی، سر منڈاتے اولے پڑگئے، حیدرآباد نے کچھ دنوں اُس کی پرورش کی

آخر کار اس کو بھی وہی روزِ بد دیکھنا پڑا جو بیجاپور دیکھ چکا تھا،

حیدرآباد کی تباہی کے بعد ریختہ نے اورنگ آباد میں انہی مغلوں کے دامن میں پناہ لی جنھوں نے بیجاپور اور حیدرآباد سے اُس کو نکالا تھا،

عالمگیر مرحوم کے بعد چند دنوں اِدھر اُدھر آوارہ رہنے کے بعد دلی میں ریختہ سے اردوئے معلی کا خطاب پاکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی، اور دلی کی آب و ہوا میں پرورش پاکر دن دونی رات چوگنی ترقی کی، دوسری چیز جو میرے مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوئی ہوگی وہ یہ ہے کہ شمس ولی اللہ کے ظہور سے پہلے اردو میں قصیدہ خوانی اور غزل سرائی شروع ہو چکی تھی، اور مثنویاں لکھی جا چکی تھیں، اس لئے اس بات کا افسوس کرنا پڑتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے ولی کو اولیت کا تاج پہنایا ہے، اور آزاد نے آبحیات میں زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر جو بات نکالی ہے کہ

> ,,شمس ولی اللہ نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اُس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا...... انھیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو، اور فارسی میں رودکی کو، اور عربی میں مہلہل کو،،

معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اردو نظم کی تدریجی ترقی پر خوب غور نہیں فرمایا، اور جن شاعروں نے ولی سے پہلے اردو زبان کو ترقی دینے میں جانفشانیاں کی ہیں، اُن کی کاوشوں اور کاہشوں پر خاک ڈال دی ہے،

اردو نثر کی تاریخ

زیادہ چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فضلی شاعر نے ۱۱۴۵ھ میں دہ مجلس کے

نام سے ایک کتاب نثر اردو میں لکھی ہے، اور اُس کا بیان ہے کہ اردو نثر میں یہ پہلی کتاب ہے، سنہ ۱۱۴۱ھ میں شمس ولی اللہ نے ایک مثنوی شہدائے کربلا کے حالات میں لکھی تھی جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال — تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول — ولی کا سخن حق پاس مقبول

فضلی نے جب وہ مجلس لکھی ہے، اُس وقت ولی زندہ تھے، لوگوں نے سمجھا کہ فضلی نے ولی کی مثنوی کو نثر کا جامہ پہنا دیا ہے، اگر وہ مجلس کے دیباچہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کسی فارسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے، یہ بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی، یا لکھی ہو فضلی کی نظر سے نہ گذری ہو، نمونہ اس کی عبارت کا ملاحظہ ہو،

> "پھر دل میں گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل اور مدد کسو طرف کی ہووے شامل، کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد در رشتۂ امید میں نہ آوے لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوا مستمع پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبر میں سرگشتہ ہوا، لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ناگاہ نسیم عنایت الٰہی دل افگار پہ اہتزاز میں آیہ، بات آئینۂ خاطر میں منہ دکھائی"

اس تصنیف کے چند دنوں بعد میر محمد حسین دہلوی کلیم تخلص نے احمد شاہ بادشاہ دلی کے زمانہ میں فصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا، اور ایک کتاب اردو نثر میں لکھی، جسکی نسبت میر حسن تذکرۂ شعرا میں فرماتے ہیں کہ "در ہندی نثر کتابے ایجاد کردہ" معلوم ہوتا ہے کہ اردو

میں نثر نویسی کا اُس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا، اسی وجہ سے میر حسن اس کو ایجاد سے تعبیر کرتے ہیں، ایک فقرہ بطور نمونہ کے میر حسن نے پیش کیا ہے، احمد شاہ کو مکحول کرنے کے ذکر میں کلیم نے لکھا ہے۔

کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر۔ آج کے دن اندھے ہو بیٹھے بصیر
ایسی دولت سے زینہار زینہار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار،

تھوڑے دنوں بعد میر عطا حسین تحسین باشندہ اٹاوہ نے چار درویش کا قصہ امیر خسرو کی کتاب سے اردو میں ترجمہ کر کے نوطرز مرصع نام رکھا، سنہ ۱۲۱۳ھ میں تصنیف و ترجمہ سے فراغت پائی، اس کتاب کے نام سے بھی اس بات کا پہلو نکلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ نیا طرز سمجھا جاتا تھا،

سنہ ۱۲۱۵ھ میں مرزا لطف علی نے گلزار ابراہیم مصنفہ مرزا علی ابراہیم خاں بہاری کا ترجمہ اردو مسٹر گلگرسٹ کی فرمائش سے کیا، اور گلشن ہند نام رکھا، اس تذکرہ کو مولوی عبد اللہ خاں نے چھپوا کر حیدر آباد سے شائع کر دیا ہے،

یہ وہ زمانہ ہے کہ کلکتہ میں حکام کو اپنے مصالح ملکی کے لحاظ سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو انگریز ولایت سے تازہ وارد ہوتے ہیں، ان کو اردو زبان سکھائی جائے اردو میں اس وقت تک ایسی کتابیں موجود نہ تھیں، اس لئے ڈاکٹر جان گلگرسٹ کے زیر اہتمام اس کام کو شروع کیا گیا،

دلی اور لکھنؤ سے زبان داں مجتمع کئے گئے، اور اردو زبان کو وسعت اور ترقی دینے کے لئے قصوں اور کہانیوں کی کتابیں اردو میں لکھوائی گئیں،

سید حیدر بخش نے طوطا کہانی لکھی جسمیں ابن نشاطی کی طوطی نامہ کو اپنے زمانہ کی اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے، اور اصل میں اس کا ماخذ سنسکرت کی ایک کتاب ہی، ایک کتاب گلِ مغفرت

یا وہ مجلس اولیا، اللہ کے حالات میں لکھی، بہارِ دانش کا ترجمہ کر کے گلزارِ دانش نام رکھا، ایک اور کتاب تاریخ نادری لکھی جو کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے، آرائشِ محفل کے نام سے ایک کتاب لکھی جسمیں حاتم طائی کا قصہ بیان کیا ہے

میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نثر میں لکھا، اور اُس کا نام نثرِ بے نظیر رکھا اور ایک کتاب اخلاقِ ہندی کے نام سے لکھی جو فارسی کی مفرح القلوب کا ترجمہ ہے، اور اس کا ماخذ سنسکرت کی کوئی کتاب ہے،

میر امن دہلوی نے باغ و بہار آراستہ کیا، اس کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش نہیں بلکہ نوطرزِ مرصع ہے، یہ کتاب اُس زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دلی میں بولی جاتی تھی، ایک دوسری کتاب گنجِ خوبی کے نام سے لکھی جس کو اخلاقِ محسنی کا ترجمہ کہو یا اُسی طرز کی ایک کتاب سمجھو،

مولوی حفیظ الدین پروفیسر فورٹ ولیم کالج نے ابو الفضل کی عیارِ دانش کا ترجمہ کیا، اور خرد افروز اس کا نام رکھا، اس کتاب کا بھی اصلی ماخذ سنسکرت ہے، جو عربی میں کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے،

میر شیر علی افسوس نے شیخ سعدی کی گلستان کا ترجمہ کر کے باغِ اردو نام رکھا، اور ایک کتاب آرائشِ محفل لکھی جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں، اور لالہ سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ ہیں،

کاظم علی جوان نے شکنتلا کا قصہ لکھا، جو برج بھاشا کی کسی کتاب سے ماخوذ ہے، اور دستورِ ہند کے نام سے بارہ ماسہ تصنیف کیا، جس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے،

اکرام علی نے رسائلِ اخوان الصفا میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ اخوان الصفا کے نام سے کیا ہے، اس میں انسان و حیوان کا جھگڑا بیان کیا ہے، جو شاہِ اجنہ کے سامنے پیش ہوا ہے،

اصل کتاب عربی زبان میں ہے،

سری لالو گجراتی نے پریم ساگر، راج نیتی اور لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں، اور کاظم علی جوان کی مدد سے سنگھاسن بتیسی لکھی جو آدھی ہندی اور آدھی اردو ہے،

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مانند ہے اور خود ڈاکٹر جان گلگرسٹ نے اردو زبان کے قواعد قلمبند کئے اور اردو زبان کی لغت لکھی[1]

معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اردو زبان کی ہر دلعزیزی اتنی بڑھ گئی تھی کہ علما کو اُسی زبان میں مذہبی کتابوں کے لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا اور حضرت شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ نے سنہ ۱۲۲۲ھ میں قرآن شریف کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا، اور اُن کے بھائی شاہ رفیع الدین نے تحت اللفظ ترجمہ لکھا، اور اُن کے بھتیجے مولانا محمد اسمٰعیلؒ نے اپنی کتاب ردالاشراک کے باب اول کا ترجمہ اردو میں تقویۃ الایمان کے نام سے کیا، اور انصاف یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا موضح القرآن اور محمد اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان زبان کی صفائی اور سادگی میں اب تک بے نظیر ہیں، ان بزرگوں کے بابرکت ہاتھوں کے لگ جانے سے اردو زبان کا سکہ ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک رائج ہو گیا،

---

[1] مقدمۂ گلشن ہند،

اُردو شاعری پر تبصرہ

میں نے امتیاز کے لئے اس کتاب کے تین حصے کر دیئے ہیں، پہلا طبقہ متقدمین کے لئے مخصوص ہے، اور اس میں تین دور ہیں، دور اوّل کے شعرا میں سے صرف ایک شاعر کا میں ذکر کرسکا ہوں، دوسرے دور میں شعرائے دکن اور تیسرے میں شعرائے دلّی کا بیان ہے،

دوسرا حصہ متوسطین سے مخصوص ہے، اور اس میں بھی تین دور ہیں، پہلا دور میر و مرزا کا، دوسرا مصحفی اور میر حسن کا، تیسرا ذوق و غالب کا،

تیسرا حصہ متاخرین کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس میں بھی تین دور ہیں، پہلا دور ناسخ و آتش کا، دوسرا امیر و داغ کا، تیسرا حالی و اکبر کا، جنھوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی ہے

طبقہ متقدمین

اس طبقہ میں پہلا دور اُن شاعروں کا ہے جن کی نشوونما حیدرآباد اور بیجاپور میں ہوئی ہے، اس دور میں جو شعرا صاحبِ دیوان ہوئے ہیں، اُن میں سے محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، مولانا نصرتی اور مولانا ہاشمی کے نام اب تک معلوم ہوسکے ہیں،

ان لوگوں میں سے اوّل الذکر تین نام خاندانِ قطب شاہیہ کے تین بادشاہوں کے ہیں جن کے دیوان حیدرآباد میں موجود ہیں، اور اُن کے کلام کا بیشتر حصہ آصفی ملکاپوری نے تذکرۂ شعرائے دکن میں نقل کیا ہے، اُن کے زمانہ میں اردو زبان عالمِ طفولیت میں بھی دکنی

الفاظ کثرت سے اس میں پائے جاتے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ شمالی ہندوستان کے رہنے والوں کو اُن کے اشعار کا بیشتر حصہ سمجھ میں نہیں آسکتا،

طریقۂ بیان میں بھی کوئی ندرت نہیں ہے، سیدھے سادے انداز سے پیش پا افتادہ مضامین کو نظم کر دیا ہے، تاہم اگر کوشش کرکے اُن کا صاف اور سادہ کلام یکجا کر دیا جائے تو اردو زبان کی تاریخ کا سلسلہ مکمل ہو جائے گا،

دوسرے دور کے شعرا کا نشو ونما اورنگ آباد میں ہوا ہی، ان کی زبان منجھتے منجھتے بہت صاف ہوگئی ہی، تاہم دکن کا لب ولہجہ اور کہیں کہیں الفاظ و روابط جو اہلِ دکن کے ساتھ مخصوص ہیں، ان لوگوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں، مثلاً نکو بجائے نہیں کے، سٹیں بجائے ڈالیں، سٹ دیئے بجائے ملا دیئے، بیگی بجائے جلدی، دستا دیکھتا کے معنوں میں، آپس آپنے کی جگہ، سنگات، ہمراہ، دہانجہ دہن، باتاں، باتیں، ان کے سوا اور الفاظ و روابط ہیں، جو اس دور کے ساتھ مخصوص نہیں، شعرائے دلّی کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً سوں سیتی، بجائے سے کوں واو معروف کے ساتھ بجائے کو، ہمن کو بجائے ہم کو، نمن بجائے طرح، ہنوز ہمن، سر تجن، پی پیتم بجائے معشوق، جگت منے دنیا میں، بر منے بر میں یعنی گود میں، مجھ دل، میرا دل، تجھ لب، تیرا لب، جگت، دنیا، بچن، کلام، نت، ہمیشہ، مکھ، منہ، بھیتر، اندر، بھوان، بھویں، پلکاں، پلکیں، بویہ، بگانہ، بیگانہ، دوانہ، دیوانہ، مرض سکون رے کے ساتھ بجائے مرض کے جس کی رے کو فتحہ ہی، تسبی، تسبیح، سہی، صحیح ہیں، کہا میں نے کہا، ان کے سوا اور بھی الفاظ ہیں جو طبقۂ متوسطین کے شعرا بھی کلام میں لائے ہیں، ان کا ذکر وہاں آئے گا،

ان دونوں دور کے شاعروں کا انداز بیان بہت صاف و سادہ ہی، جو کچھ آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں اور اُس سے دل میں جو خیالات گذرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں، پیچ پیچ کے

خیالات دور دور کی تشبیہیں نازک استعارے نہیں بولتے اسی واسطے اشعار صاف و بے تکلف ہیں،

مگر چونکہ اردو شاعری کی ابتدا فارسی کی انتہا سے جا ملی ہے، لہذا بہت سے خیالات جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے ہیں، اس میں خود بخود آ گئے، مثلاً بجائے عورتوں کے لڑکوں کا عشق، ان کے خط کی تعریف، شمشاد، نرگس، سنبل، سوسن، بنفشہ وغیرہ کی تشبیہیں، لیلی، شیریں، شمع، گل سرو وغیرہ کا حسن، مجنوں، فرہاد، بلبل، قمری، پروانہ کا عشق، مانی و بہزاد کی مصوری، رستم و اسفندیار کی بہادری، زحل کی نحوست، سہیل یمن کی رنگ افشانی، نوروز کا جشن، جام جم خم افلاطون، راہ ہفت خوان، کوہ الوند، کوہ بے ستون، جوئے شیر، قصر شیریں، جیحوں، سیحوں اور خدا جانے کیا کیا الفاظ، ترکیبیں اور خیالات فارسی سے اُردو میں آ گئے،

ان خیالوں اور اشاروں نے اردو شاعری کو سنگلاخ بنا دیا جس کی ماں بھاشا سی شیریں زبان تھی، جو ہم کو وہ چیزیں بتاتی ہے جن کی کیفیت اُن کے دیکھنے سننے سونگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے، مثال کے طور پر خیال کرو بارش کا موسم ہندوستان میں بہار کا موسم ہے، بادلوں کا گھر گھر کر آنا، سرد ہواؤں کا چلنا، سرسبز اور شاداب درختوں کا جھومنا، ہلکی ہلکی پھواروں کا پڑنا، کوئل کا کوکنا، پپیہوں کا پی کہاں پی کہاں کی صدا لگانا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی دلکش باتیں ہیں، جن کو دیکھ کر دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے، اور انہی باتوں کو اگر شعر کے قالب میں ایک خاص انداز سے ڈھالا جائے تو اس کو سنکر دلوں میں جوش اور طبیعتوں میں اتنی اُمنگ پیدا ہو سکتی ہے، جو بہار فارس کو خواب میں نصیب نہیں،

مگر بدقسمتی سے اردو شاعری میں گل و بلبل کا دخل ہوا جو متقدمین کے ہاں کم کم ہے متوسطین کے ہاں کچھ زیادہ پایا جاتا ہے، اور متاخرین کی شاعری کا دارمدار اسی پر ٹھہر گیا، تحسین و آفرین کی ہوس میں کبھی صفت در صفت، کبھی استعارہ در استعارہ سے اُسے اتنا تنگ و تاریک

کردیا کہ شاعری گورکھ دھندا بن کر رہ گئی،

بہرحال متقدمین کے خیالات میں ندرت نہیں ہے تو نہ ہو، مگر اُن کا انداز بیان بہت بے تکلّف اور سیدھا سادا ہے، اس میں شعرائے دکن و دلّی میں باہم امتیاز نہیں، البتہ یہ حیرت کی بات ہو کہ شمس الدین ولی نے اپنے کلام میں ایہام اور ذومعنیین سے اتنا کام نہیں لیا جتنا شاہ مبارک آبرو اور اُن کے معاصرین کام لیتے ہیں، خدا جانے ان بزرگوں کو اس کا شوق کیونکر پیدا ہوا، میرے خیال میں آزاد کی یہ رائے صحیح ہے کہ دوہروں کے انداز نے جو ہندوستان کا سبزہ خودرو تھا اردو کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا،

طبقۂ متوسطین

میں نے اس حصہ کو تین دور پر تقسیم کیا ہے، دور اول میں مرزا مظہر، مرزا رفیع، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم، یقین، بیان، حزین، ہدایت، قدرت، بیدار، ضیا، جو اس دور کے اُن ممتاز شاعروں میں ہیں جنھوں نے زبان کی صحت و صفائی اور طرز بیان کی خوبی اور پاکیزگی میں نمایاں حصہ لیا ہے،

دوسرے دور میں میر اثر، بقا، حسرت، راسخ، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، رنگین اور فراق کا ذکر ہے جنھوں نے زبان کو پہلے سے زیادہ صاف کیا ہے، اور طرز بیان میں بھی کسی کسی نے نیا انداز پیدا کر دیا ہے،

تیسرے دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ کا ذکر ہے جنھوں نے زبان کو بہت زیادہ صاف و ستھرا کر کے کلام کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ کر دیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ صفائی اور سادگی کو بھی ایک حد تک قائم رکھا ہے،

دور اول (۱) سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری

کوشش کی اور بہت سے الفاظ و روابط جنھیں ولی اور اس کے ہمعصر بے تکلف کام میں لاتے تھے، نکال ڈالے، تاہم کچھ الفاظ ایسے رہ گئے جو اُن کے زمانہ میں فصیح سمجھے جاتے ہوں مگر آج ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، مثلاً کیا کیا بجائے کس کس، اُن نے جن نے بجائے اس نے جس نے، بھر نظر بجائے نظر بھر کے، دل آپنے کے بجائے اپنے دل کے، مجھ آنسو بجائے میرے آنسو کے، جن تس نے بجائے جس کسی نے، ایدھر اودھر بجائے اِدھر اُدھر، کہنے لاگا بجائے کہنے لگا، دو آنہ بیگانہ بجائے دیوانہ و بیگانہ، رقیباں بجائے رقیبوں کے، انکھڑیاں، آنکھوں کی جگہ، سجن معشوق کے معنوں میں، بیچ، اندر کے معنوں میں، دم کھا رہو، سانس نہ لو یعنی چپکے رہو، کنے پاس، آپ ہیں ناہیں، نہ آپ ہیں نہ تیں ہیں کہا میں نے کہا، اسی طرح کے اور چند الفاظ ہیں جو زیادہ تتبع کرنے سے مل سکتے ہیں،

تاہم زبان کے صاف اور ستھرا کرنے میں اس دور کے شعرا نے جو کوششیں کی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں،

(۲) دلپذیر اور دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انھیں کہیں ترجمہ کر کے اور کہیں بجنسہ لے لیا ہے، مثلاً تر دامن، پنبہ دہن، آتش زیر پا، کمر کوہ، دامن کوہ، گردن مینا، دست سبو، سرو آزاد، سوسن دہ زباں، نرگس شہلا، داغ جنوں، طفل اشک، یاد ایام، بر آمدن، در آمدن، بہ سر آمدن، گوش کردن، بو کردن، چراغ کشتن، دل دادن، دل از دست رفتن، از جاں گذشتن، از سر چیزے گذشتن، عرق عرق شدن، پیمانہ پُر شدن، از جامہ بیروں شدن، دامن افشاندہ برخاستن، خوشا بحال کسانیکہ حیف اناں یا حیف کسانیکہ اور اسی طرح سینکڑوں الفاظ اور محاورے ہیں جنھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا،

آزاد نے آبحیات میں اس بحث کو بہت پھیلا کر بیان کیا ہے، اور ہر ایک کی مثالیں

شعرا کے کلام سے نکال کر پیش کی ہیں، جو پڑھنے کے قابل ہیں،

(۳) اُنھوں نے یہ بھی بڑا کام کیا ہے کہ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھتے چلے آتے ہیں، ان کو بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھیئے اور مزے لیجیے، اُن کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز و دلکش ہیں، علاوہ اس کے قدیم جذبات و خیالات میں اپنے مبلغ فکر کے موافق جو نزاکتیں اور لطافتیں اُنھوں نے پیدا کی ہیں وہ باوجود پُرانے روزمرہ اور محاوروں کے بدل جانے کے اب تک ایسی ہیں کہ لوگ ان کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں، میں نے اس کتاب میں ہر ایک کے اشعار اسی قسم کے انتخاب کیے ہیں، جو اپنے اپنے موقع اور محل پہ آئیں گے، تاہم جی نہیں مانتا، یہاں بھی چند اشعار مثال کے طور پہ نقل کرتا ہوں،

مرزا مظہر علیہ الرحمہ

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آئی ہے بہار

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

کیا جوان مارا گیا خوباں کے ہاتھ
لاکھ حسرت کھیت آئیں جس کے ساتھ

مرزا رفیع

اے لالہ گو فلک نے دیئے تجھکو چار داغ
چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں　　یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر　　اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں　　اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات　　آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

میر تقی میرؔ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر　　تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں دم نکل گیا

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم　　کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوریِ بتاں سے　　آئے ہیں ابکی یارو پھر کر خدا کے ہاں سے

واعظ نا کس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ　　آؤ میخانے چلو تم کس کی باتوں پر گئے

آشیانے میں رات بلبل کے　　آتشِ گل سے رات بھول پڑا

خواجہ میر دردؔ

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے	معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے	یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کی کیا چلے

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں	دل میں ہے جو وہ بھی وفا پر جی وفا کرتا نہیں

قائمؔ

قائمؔ ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح	مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مرے حد عمر نوح	دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اُتر گیا

یقینؔ

شب ہجراں کی وحشت کو تو اے ہمدرد کیا جانے	جو دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے
گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح	ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

۴۔ ان بزرگوں نے تشبیہ و استعارہ سے بھی کام لیا ہے، مگر اعتدال کیساتھ متاخرین کی طرح صنعت در صنعت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی، تشبیہ و استعارہ کو محاوروں کی رنگینی سے اس طرح چھپایا ہے کہ شعر سُن کر اسکی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تشبیہ و استعارہ کی طرف فوراً ذہن

منتقل نہیں ہوتا، اور یہی بات اُن کی شاعری کی جان ہے،

تشبیہ و استعارہ ایک فطری چیز ہے، ایک عامی بھی جوش و خروش میں غیظ و غضب کی حالت ہو یا رنج و غم کی جب کوئی بات کہتا ہے تو بے ساختہ اُس کے منھ سے تشبیہ و استعارہ کے قالب میں ڈھل کر بات نکلتی ہے اور وہ سننے والے کے دل پر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو کہنے والے کے دل پر اُس وقت طاری ہے،

اگر شاعر اسی نکتہ کو پیش نظر رکھے گا، تو اس سے سلیقہ مندی ظاہر ہو گی، اور اگر وہ بے اعتدالی سے کام لیگا تو اس شعر کو سن کر بجائے اس کے کہ اُس کے جوش و خروش کا دل پر اثر ہو تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگی اپنی طرف متوجہ کرے گی، اور اس طرح سے اس کا مقصود فوت ہو جائے گا،

اگر تم یہ کہنا چاہو کہ فلاں شخص بہادر ہے، اور اسی لفظ سے اسکو ادا کر دو تو ادائے مطلب کا یہ ایک معمولی طریقہ ہو گا، اور اگر اسی بات کو یوں کہو کہ وہ شیر کے مانند ہے، تو یہ تشبیہ ہو گی اور اس میں زور پیدا ہو جائے گا، اور یوں کہو کہ وہ شیر ہے تو زور اور بھی بڑھ جائیگا اور اگر اس شخص کا نام نہ لو اور یوں کہو کہ میں نے ایک شیر دیکھا، اور اس سے مراد اسی شخص کو لو تو یہ استعارہ ہے، اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے کہ شیر کا نام ہی نہ لیا جائے بلکہ اُس کے جو مخصوص اوصاف ہیں اُس شخص کی نسبت استعمال کئے جائیں، مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہلچل پڑ گئی، تو یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ لطیف ہے،

تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اور استعارہ میں مستعار لہ اور مستعار منہ میں کسی قسم کی مناسبت کا ہونا ضروری ہے، خواہ ایک صفت میں ہو یا چند اوصاف میں، خواہ ظاہری

سے محسوس ہوتی ہو یا عقل سے اس کا ادراک ہوتا ہو، یہی ایک چیز ہی جس میں سلیقہ سے کام لینے کی حاجت ہی، اور اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ طبقۂ متوسطین کے شعرا نے عموماً اور اس کے دور اول نے خصوصاً بہت سلیقہ سے کام لیا ہے، میں چند اشعار پیش کرتا ہوں، کچھ ضرور نہیں کہ اپنی طرف سے حواشی چڑھاؤں تم اپنے مذاق سلیم کی مدد سے اُن پر غور کرو اور یہ دیکھو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ اُن میں ہے یا نہیں،

میرزا مظہرؒ

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہی
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

مرزا رفیع

چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نگہت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

ساقی ہے یک تبسم گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سی بھر کہیں

میر تقی میر

صیاد دل ہی داغ جدائی سے رشک باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

فلک کو منہ نہیں اس فتنے کے اُٹھانیکا
ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

خواجہ میر دردؒ

مثل نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا
ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

دل بھی اے درد قطرۂ خون تھا   آنسوؤن مین کہین گرا ہوگا

قائم

مجھ سا جہان مین کوئی آشفتہ سر نہین   ہے یون تو زلفِ یار مگر اس قدر نہین
دل ڈھونڈھا سینہ مین مرے بو العجبی ہے   اک ڈھیر ہے یان راکھ کا اور آگ دبی ہے

یقین

نظر آتا نہین ثابت گریبان ایک غنچے کا   چمن مین یہ ستم کرتا ہی اے بادِ صبا کوئی
یقین ہوا مجھے قطرہ سے اشک کے معلوم   نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہووے

بیان

ہم سرگذشت کیا کہین اپنی کہ مثلِ خار   پامال ہوگئے ترے دامن سے چھوٹ کر
فرشتون کی عبادت کا مصلّی ہو مرا دامن   اگر آلودگی دنیا کی اس کو پاک رہنے دے

(۵) اس دور سے پہلے شعرائے ریختہ، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ سب کچھ کہتے آئے ہین اور قصیدے بھی برائے نام لکھے ہین، مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کو قصیدہ نہین کہہ سکتے، دو چار شعر مین کسی کی مدح کر دینے یا تشبیب، گریز، مدح اور دعا جو قصیدہ کے لوازم قرار پا گئے ہین اُن سے تعرض نہ کرنے سے کوئی کلام قصیدہ نہین بن سکتا،

سب سے پہلے اسی دور کے شعرا نے قصائد دھوم دھام سے لکھے اور اُن کو اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پہ پہنچایا، خصوصاً مرزا رفیع سودا اس میدان مین فارسی شعرا سے بھی بعض باتون مین آگے بڑھ گئے ہین، ان کے کلام کا زور و شور انوری کے کلام سے نہین دبتا، اور نزاکتِ مضمون مین عرفی کو بھی شرماتے مثنویان دکنی اور ان کے متبعین نے بھی لکھی ہین، مگر عاشقانہ مثنویان جس شان کی میر تقی میر نے لکھی ہین ان کی نظیر اس دور سے پہلے نہین ملتی،

مرثیہ کے متعلق میرا یہ خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے،

حیدرآباد اور بیجاپور کے شعرا اکثر مرثیہ گو تھے، اور اُن مین سے بعض ایسے خوش گو تھے جن کے مرثیے آگرہ اور دلی تک قدردانون کے ہاتھ پہنچتے تھے، مگر اس زمانے مین چومصرعے کہنے کا رواج تھا، سب سے پہلے اسی دور کے ملک الشعرا مرزا رفیع سودا نے اُسے مسدس کیا جس سے اس مین وسعت پیدا ہو گئی

واسوخت قدماء کے ہان دیکھنے مین نہین آیا، سب سے پہلے اسی دور کے شاعر بے نظیر میر محمد تقی میر نے اس مین طبع آزمائی کی اور اس کوچہ مین جو کمال دکھایا، اُس کا طرۂ افتخار ہمیشہ ان ہی کے سر رہے گا

ہجو گوئی شاعری کے گلشن کا ایک خار دار پھل ہے، مگر جس طرح سے گل کے ساتھ کانٹون کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح شاعرانہ جوش و خروش کی تکمیل مین اس کو بہت کچھ دخل ہے، اسی وجہ سے عربی اور فارسی کی شاعری بھی اس سے نہین بچ سکی، مگر ریختہ گو شعرا کے اول طبقہ مین اس کا سراغ نہین ملتا، اگر کہین ایک دو شعر ہون تو وہ شاعرانہ نوک جھونک سے زیادہ نہین، اس دور کے شعرا مین مرزا رفیع اس کے بھی مرد میدان ہین، گرمیِ کلام کے ساتھ شوخی اور ظرافت ان کے حصہ مین آئی ہے، اس کی نظیر دوسری جگہ نہین مل سکتی،

اُن کے ہمعصرون مین سے میر تقی میر، میر ضاحک، فدوی، ندرت اور بقا نے بھی اس کوچہ کی خاک اُڑائی ہے، ع

مگر وہ بات کہان مولوی مدن کی سی

علاوہ ان چیزون کے مخمس، مربع، مثلث اور مستزاد، غرض کہ جتنے اصنافِ سخن ہین، سب مین ان لوگون نے طبع آزمائی کی ہے، اور اُردو شاعری کو ہر طرح سے مکمل کر دیا ہے،

(۶) ایک بڑا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ تناسبِ لفظی اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمین خصوصاً ایہام اور ذو معنیین جو قدما کی شاعری کا مایہ ناز ہین، اُن کے دور کرنے مین انھون نے

بڑی کوشش کی، خصوصاً مرزا جانِ جاناں مظہر رحمۃ اللہ علیہ نے اس خارزار کو ایسا چھانٹا کہ شاعری ساحری بن گئی، پھر اپنے زورِ طبع اور خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمونوں اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا، اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائعِ لفظی جو ہندی دوہروں کی بنیاد تھے اُسے سب بھول گئے، یقین، حزین، بیان، حسرت اور فقیہ دردمند نے اُن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرکے اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کرکے اُردو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا، یہ اردو شاعری کے مورخ کی سخت بے انصافی ہے کہ اس نے مرزا صاحب کے اس احسان کا اعتراف نہین کیا بلکہ ان کے کمالِ شاعری کو دبانے کی ہر جگہ بے سود کوشش کی ہے،

مولوی قدرت اللہ شوق طبقات الشعرا مین لکھتے ہین:-

اول کسی کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ در زبان اردوے معلّی شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشفِ کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر مردے است فرشتہ صفت، الخ

شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرہ مین فرماتے ہین:-

،، در ابتداے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ وجود نیامدہ بود در دور ایہام گویان بود، اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ اوست۔،،

کچھ دور آگے چل کر کہتے ہین:-

،، فی الحقیقۃ نقاش اوّل زبان ریختہ بہ اعتقاد فقیر مرزا است بعدہ تتبعش بدیگران رسیدہ،،

بہرحال، ایہام گوئی کو ترک کرکے شعر کو بلند مضامین اور لطیف خیالات کے قابل بنانا اس دور کے شعرا کا بہترین کارنامہ ہے، جو بھولنے کے قابل نہین،

(۷) سلسلۂ بیان مین یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اصنافِ سخن مین ہر چیز کو جس سلیقہ سے اس دو

کے بزرگون نے بیان کیا ہے، وہ اُن ہی کا حصّہ ہے، قصیدون مین پرشوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبین استعمال کین، غزلون مین بے تکلف زبان مین نرم نرم باتین، عاشق و معشوق کے خیالات، وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انھون کی اس کی نظیر قدما کے کلام مین نہین مل سکتی، میر تقی، میر درد، یقین، بیان، حزین، ہدایت اور بیدار کی غزلین پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ دھر کر دیکھو:

یا جوش و خروش، کلام کی گرمی اور دل آویزی، دلچسپ اور دل پسند بحرون مین جن مین سے اب تک بہت سی اُردو مین نہین آئی تھین، پھر سنگلاخ زمینون اور مشکل مشکل ردیف اور قافیون مین شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو مرزا رفیع سودا اور قائم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو، اس کا دھندلا سا عکس بھی قدما کے کلام پر نہین پڑتا، اگر روزمرہ اور محاورے مین بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا ہو تو میر تقی میر، درد اور میر سوز کی غزلین پڑھو جس پر ہزارون طرح کی بناوٹین قربان ہوتی نظر آئین گی،

تصوف کا رنگ جو شعر کی جان ہے اور جس کے بغیر کلام روکھا پھیکا نظر آتا ہے، اس کو خواجہ میر درد سے پہلے سراج کے سوا کسی نے چھوا ہی نہین، اس کی آمیزش سے جو تڑپ اُن کے کلام مین پیدا ہوگئی ہے، اس کا اثرا ہوا تھا کہ بھی ان کے پیشرؤون مین نظر نہین آتا،

بسا ہے کون ترے دل مین گلبدن اے درد کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

اس کے خیالِ زلف نے سب سے چھڑا دیا گرچہ پھنسے ہین دام مین دل کو فراغ ہے
گذرا ہے صبا کون بتا آج ادھر سے گلشن مین ترے پھولون کی یہ باس نہین ہے

قاصد ترا یہ کام نہین اپنی راہ لے اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

ایک ہی جست مین لی منزلِ مقصود اس نے رہروو! رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ
اے درد یان کسو سے نہ دل کو لگائیو ٹک چلیو سب سے یون تو پہ جی مت پھنسائیو

دورِ دوم

(۱) سب سے نمایان کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ انھون نے زبان کی صحت اور صفائی مین ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور بہت سے ناگوار الفاظ و روابط جن کو دور اوّل کے شعرا نے قدما سے ترکہ مین پایا تھا، انھون نے نکال ڈالے اور وہ ایک حد تک صاف و شستہ ہو گئی، تاہم انکھڑیان، جھگڑا، لکھڑا، ٹک، نت، زور، آتیان، جاتیان، جاؤں ہون، کھینچون ہون، آپنے سے کہتا تھا، ایدھر، اودھر، تیسر، گئے، اور اسی قسم کی اور الفاظ باقی رہ گئے،

سید انشا کے کلام مین کچھ ناگوار الفاظ اپنے ہمعصرون سے زیادہ ملتے ہین مثلاً اچھڑتے، بھلے رے، مگر اُن کی سند نہین، وہ ہر جگہ دھینگا مشتی کرتے ہین، کہین آزادون کے لہجہ مین بولنے لگتے ہین، کہین ڈنڈیون کی زبان مین گفتگو کرتے ہین، کبھی پورب مین ہین، کبھی پچھان مین اور کسی جگہ ان کا رفیقِ زندگی یعنی تمسخر اُن سے جدا نہین ہوتا،

(۲) طرزِ بیان مین کوئی حسن و خوبی اس دور کے شعرائے نہین پیدا کی، ان ہی پھولون سے گلدستے تیار کئے، جو ان کے پیشرو جمع کر چکے تھے، صرف اتنا کیا کہ شوخی اور ظرافت کے ساتھ عاشقانہ شاعری مین حقیقت کے منھ سے نقاب کو ہٹا کر مجاز کو زیادہ نمایان کر دیا،

اس کی حقیقت یہ ہے کہ عاشقانہ شاعری کی دو قسمین ہین، اوّل وہ جس مین عاشقانہ جذبات کی صحیح کیفیت حق شناس آنکھون مین خدا نمائی کا جلوہ دکھاتی ہے، اس کی حد ایک طرف تصوف یا معرفت یا عشقِ حقیقی سے ملتی ہے، دوسری طرف پاک محبت اور عشقِ مجازی سے ڈانڈا مل جاتا ہے،

پہلی صنف مین خواجہ میر درد اور دوسری مین میر تقی میر نے نمایان حصہ لیا، اور اس دور کے شعرا مین سے سودا، قائم، ہدایت، یقین اور بیان وغیرہ زیادہ نہین تو کچھ کچھ اسی راستہ پر چلے ہین،

اس دور کے شعرا مین سے میر اثر اور راسخ خواجہ میر درد کا تتبع کرتے ہین، میر حسن، مرزا رفیع وغیرہ کے راستہ پر چلتے ہین، اور مصحفی کا انداز کہین کہین پر میر سے ملتا ہے،

دوسری قسم وہ ہے جس میں پاک اور بے لوث عشق کی جگہ پر ہوس پرستی کے جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہو، اس کا افسوس ہے کہ اس دور میں جراٴت، انشا اور رنگین نے ترقی دے کر اس ناپاک طریقہ کی بنیاد ڈال دی جس پر متاخرین نے بلند عمارتیں کھڑی کر دیں، اور یہ رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیال دم بخود ہو کر رہ گئے، تھوڑی دیر سنجیدگی کو بالائے طاق کر ان کا بھی اندازہ دیکھ لو،

پہلے جراٴت کی دلیری دیکھو:-

در تک اب چھوڑ دیا گھر سے نکل کر آنا   یاد وہ راتوں کو سدا بھیس بدل کر آنا
کیا گیا وہ خفا مجھ سے ہو گھر سے نکل کر   جب میں نے پکارا اُسے آواز بدل کے
چھینٹے غیروں سے جو کل آپ لڑے پانی کے   پڑ گئے سینکڑوں بس ہم پہ گھڑے پانی کے
کل واقفِ راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات   جراٴت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر   جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

سید صاحب کی گل افشانی کچھ اُن سے بھی بڑھ کر ہے،

اب تو اگلی سی طرح کا نہیں گہرا پردا   رہ گیا آپ میں اور ہم میں اکہرا پردا
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت   ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کے وقت
نہ لگی مجھ کو جو اُس شوخ طرحدار کی گیند   اُس نے محرم کو سنبھال اور ہی تیار کی گیند
جاڑے میں کیا مزا ہو وہ تو سمٹ رہے ہوں   اور کھول کر رضائی ہم بھی لپٹ رہے ہوں
جی چاہتا ہے اے دل اک رات ایسی آوے   مطلع ہو صاف ستھرا بادل بھی پھٹ رہے ہوں
سوتے ہوں چاندنی میں وہ منہ لپیٹے اور ہم   شبنم کا وہ ڈوپٹہ بیٹھے الٹ رہے ہوں

(۳) ان لوگوں کی طبیعت کی رنگینی نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ ریختہ سے ریختی کے شاخسانے کھڑے کر دیئے، آزاد کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رنگین اور انشا اس کے موجد ہیں، کیونکہ قدما کے ہاں بھی اس

کا سراغ ملتا ہے، مولانا ہاشمی بیجاپوری طبقۂ متقدمین کے دور اوّل کے مشہور شاعر ہین جنھون نے یوسف زلیخا ریختہ مین لکھی ہے، اُن کے یہ دو شعر آصفی ملکاپوری نے اپنے تذکرہ مین لکھے ہین،

رضا گر مجھکو دیتی ہے کرون گی گھر مین جا وارد   اگر مجھ ہوے گی فرصت صبح پھر آؤن گی چھوڑو
اگر کوئی آ کے دیکھے گا تو دل مین کیا کہے گا   مجھے بدنام کیا کرتے کہین مین جاؤن گی چھوڑو

مولانا ہاشمی کے بعد سید محمد قادری ایک باکمال شاعر گذرے ہین جو غالباً ولی کے ہمعصر تھے ان کا تخلص خاکی تھا، اور ان کا مکمل دیوان سنہ ۱۱۸۲ھ کا لکھا ہوا مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتب خانہ مین موجود ہے، اس مین ایک دو ریختیان بھی ہین جو ہندی شاعری کا نمونہ ہین، مگر اس مین شک نہین کہ ان کے سوا اور کسی کا کلام اس طرح کا نظر سے نہین گذرا، اس کے زندہ کرنے اور رواج دینے کا طرۂ افتخار مرزا سعادت یار خان رنگین اور ان کے دوست سید انشاء اللہ خان کے حصہ کا تھا، جو انھین حاصل ہوا انشاء اللہ خان ارشاد فرماتے ہین،

مین ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ   بندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ

چبھتی ہے یہ نگوڑی مسلس کی اوڑھنی   لا دے وہی دوا مجھے ململ کی اوڑھنی

رنگین

مین وہ تو اوڑھنے کی نہین کل کی اوڑھنی   باجی! مجھے منگا دے جھلاجھل کی اوڑھنی
ہئی لچک کمر مین مری لوگو دوڑیو   گھٹنے تلک تو سر سے مرے ڈھلکی اوڑھنی
گرمی کے مارے ناک مین آگئی ہے میری جان   تہ کرکے رکھ پٹاری مین آنچل کی اوڑھنی
ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو   یہان سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

(۴) اس عہد کا بہترین کارنامہ میر اثر کی مثنوی خواب وخیال اور میر حسن کی مثنوی گلزار ارم اور

اس سے بھی بہتر اُن کی دوسری مثنوی سحر البیان ہے، جس نے اتنی قبولیت حاصل کرلی تھی کہ آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہین ہوئی،

اس مثنوی مین روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، قافیون کی نشست، ترکیبون کی چستی اور مصرعون کی برجستگی کے علاوہ ربط کلام کی خوبی اور ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا گہرا تعلق ہے جیسا زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے، اور مطالب ایسی صفائی سے ادا کئے ہین کہ اگر ان ہی کو نثر کردیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ صاف اور مربوط نہ ہوگا.

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان کی بیان کی ہے وہ لفظاً و معنیً اس قدر عادت کے موافق ہے جیسی فی الواقع ہوا کرتی ہے؛

وقت عاشق و معشوق اتفاقاً ایک دوسرے سے روشناس ہوتے ہین، پھر جب ان مین جدائی ہو جاتی ہے، پھر جب وہ ملتے ہین، غرض کہ جس جس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ صفائی اور سادگی کے ساتھ اس قدر مؤثر اور دلگداز ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے،

مین نے اس مثنوی کی دو ایک داستان میرحسن کے ذکر مین انتخاب کی ہین، اس لئے یہان اُن کا دہرانا ضرور نہین، انتخاب کے وقت مین نے بہت کوشش کی کہ ہر داستان مین سے بہت بہت سے اشعار نکال کر اس کو مختصر کرون. مگر ربطِ کلام کی خوبی نے مجھ کو کامیاب نہین ہونے دیا،

دور سوم

اس دور مین نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین، اور شیفتہ کا ذکر کیا گیا ہی.

(۱) ان لوگون کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے، جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے اُن کو انہون نے دور کر کے روزمرہ اور محاورون کے ساتھ فارسی زبان کی نہایت لطیف اور خوشنما ترکیبون سے اُردو مین شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کردی جو دیکھنے کے قابل ہے،

نصیر کی شاعری کی ابتدا دور دوم کی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہے اس واسطے ان کے کلام

ہیں آتیاں، جاتیاں، ٹک، نت اور بعض جگہ اسی طرح کی اکھڑی اکھڑی بندشیں ہیں جو مصحفی اور انشا کے کلام میں پائی جاتی ہیں، مگر اخیر اخیر میں ان کا کلام بھی صاف ہو گیا ہے،

اس گروہ میں ذوق و ظفر روزمرہ اور محاورہ بندی میں سب سے فائق ہیں، مومن اور غالب کے ہاں خیال آفرینی کے ساتھ فارسی ترکیبیں زیادہ داخل ہو گئی ہیں اور بول چال کا لطف ذوق و ظفر کے نسبت ان کے ہاں کم ہے، تاہم اور لوگوں کے کلام میں کسو، کبھو، نہیں، آن کے، ہمرت، مت، آئے ہے، جائے ہے، دیکھیو، کیجیو، لیجیو، ورے، پرے، بیٹھانا، بٹھانا، سدا بمعنی ہمیشہ، زور بمعنی عجیب یا نہایت بہت بے تکلفی سے کلام میں لائے گئے ہیں،

(۲) ولی سے لیکر مصحفی تک عموماً انداز بیان میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے، اس دور میں نصیر نے مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی اور بعید الفہم استعاروں سے کام لیکر اور مشکل و سنگلاخ زمینوں میں شعر کہکر اس کو تنگ و تاریک کر دیا ہے، اگرچہ ان کے ہاں بھی محاورہ جہاں آجاتا ہے، شعر میں تڑپ پیدا کر دیتا ہے مگر بیشتر حصہ ان کے کلام کا بے لطف و بے رنگ ہے،

ذوق کے کلام میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین سے زیادہ ہے، مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں یکساں ہے لیکن اسمیں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے،

ممنون، مومن، غالب اور اُن کے متبعین تسکین و شیفتہ کے ہاں تازگی خیالات کے ساتھ فارسی ترکیبوں کا اثر غالب ہے، خصوصاً مومن اور غالب نے جہاں بے اعتدالی سے کام لیا وہاں ان کا کلام رتبہ سے بہت گر گیا ہے، نمونہ کے طور پر چند اشعار اس دور کے شعرا کے پیش کرتا ہوں جس میں روزمرہ اور محاورہ بہت خوبصورتی سے کام میں لایا گیا ہے،

ذوق

لگے ہے خنجرِ قاتل سے یوں گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

تو جان ہی ہماری اور جان ہی تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

ظفر

سر تلک دستِ ستم جوں ہی ترا قاتل بڑھا
خونِ جسمِ ناتواں تِل تِل گھٹا، تِل تِل بڑھا

برسوں گذرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
اب تو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں

ہمارے ہی آگے ہی ذکر اگلے دوستداروں کا
پرانے مردوں کی وہ ہڈیاں اکھاڑتے ہیں

جنوں میں کیا مرے پیوند پیرہن کو لگے
کہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن کو لگے
نعل شکلِ مہِ نو جب ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہِ روشن کو لگے

ممنونؔ

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی
بس جفا زور آزمائی ہو چکی دلبروں سے ہاتھا پائی ہو چکی

اس مرگ پہ سو جان مری صدقے کہ دم نزع گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھئے کیا ہو

نصیرؔ

نصیرؔ اس کج ادا کی کج ادائی کوئی جاتی ہے مثل مشہور ہے رسی جلی لیکن نہ بل نکلا

خیالِ زلفِ بتاں میں نصیرؔ پیٹا کر گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

سرِ مژگاں سے وقتِ نالہ آنسو کو ترستے ہیں یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

مومنؔ

کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

تسلی دم واپسیں ہو چکی ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالبؔ

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

شیفتہ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے
کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

(۳) بعض مضامین ایسے دلچسپ و دلکش ہوتے ہیں کہ انکو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے، مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان انکو نہیں ادا کر سکتی، اور معمولی اسلوب اُن میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، ایسے موقعوں پر تشبیہ اور استعارہ یا کنایہ اور تمثیل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو شعر شعر نہیں رہتا، معمولی بات چیت ہو جاتی ہے،

اِس میں شاعر کی سلیقہ مندی کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اس کو صفت در صفت یا استعارہ در استعارہ کر کے بعید الفہم نہ کر دے، دوسرے یہ کہ جس چیز کے ساتھ تشبیہ دیجائے یا استعارہ کیا جائے وہ اس خاص صفت میں جس میں تشبیہ یا استعارہ مقصود ہے کمال رکھتا ہو تاکہ اُس کے ذکر کرتے ہی سننے والے کی طبیعت میں جوش اور اثر پیدا ہو، تیسرے یہ کہ ان دونوں میں مناسبت پوری پوری پائی جائے،

نصیر دہلوی کا شعر ہے جو اس دور کے استاذ الاساتذہ ہیں،

چرائی چادر مہتاب جب میکش نے کھینچ کر
کوڑا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

اس میں چاندنی کے لطف اٹھانے کو چادر مہتاب کے چرانے سے استعارہ کیا ہے، مگر بعید الفہم ہونے کی وجہ سے شعر میں کوئی لطف نہیں نہ اس کے پڑھنے یا سننے سے دل میں کوئی اثر پیدا ہوتا ہے

نصیر مرحوم کے کلام میں اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، بلکہ بعض مقاموں پر ان کے استعارہ یا تمثیل پر پھبتی کا دھوکہ ہوتا ہے، البتہ ذوق نے خیال آفرینی کے ساتھ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کئے ہیں اور اُن سے بہت زیادہ حکیم مومن خاں اور مرزا غالب نے اس میں کاوش کی ہے، اور بعض مقاموں پر جدت سے بھی کام لیا ہے،

میں اس دور کے شعرا کے دو دو چار چار شعر نقل کرتا ہوں جن سے ناظرین کتاب خود اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ اس خاص انداز میں ان لوگوں نے کیا کیا کام کئے ہیں اور باوجود اس کے شعر کی لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا،

مرزا غالب

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے　　خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہر گردوں ہے چراغ رہگذار باد میں

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے　　اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

مومن خاں

جوں شاخِ گل اے جوشِ جنوں زار ہوں یعنی جب چاک ہوا جامہ تو بس ٹوٹ گئے ہاتھ

میرا قلق بھی قبلہ نما سے نہیں ہے کم باور نہیں تجھے تو ذرا منھ کو موڑ دیکھ

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی، ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

کیوں ہو رنگِ زرد پر گلگونہ اشکِ سرخ کا کس لئے ملنے لگی رنگت ہماری آپ کی

ان کو گمان ہے گلۂ چینِ زلف کا خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہو

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

ذوقؔ

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا بہ رنگِ بوئے گل وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

سب کو دیکھا اس نے اور اسکو نہ دیکھا جو نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

ریشِ سفیدِ شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

فلک کیا فتنہ سازی میں ہے ہمسرِ چشمِ فتاں سے
گرا تھا یہ بھی اشکِ سرمہ آلود اسکی مژگاں سے

نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیرِ قضا اس کو پرِ تیرِ قضا سمجھے

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

ہر اک گردش میں سو اندازِ نازِ فتنہ زا سمجھے
فلک کو ہم کسی کافر کی چشمِ سرمہ سا سمجھے

(۴) میر و مرزا سے لیکر مصحفی تک جتنے شعراء گذرے ہیں ان کا ایک محدود دائرہ ہے، جس سے وہ بہت کم نکلتے ہیں، اُن کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو مضمون پہلے کسی طرح بندھ چکا ہے، اسے ایسے بلیغ اسلوب سے ادا کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے، برخلاف اس کے اس دور کے شعراء میں سے مومن و غالب اور ان کے متبعین نے معمولی معمولی مضمونوں کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے، جو سب سے نرالا ہے،

علاوہ اس کے ان کے طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں کم دیکھی جاتی ہے، ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد ایک دوسرے ہی نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں،

جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے، اور اس کے بار بار پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی،

ان دونوں کے طرز ادا میں ایک خاص بات اور بھی ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا کو چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والوں کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے،

مومن خاں کے بعض اشعار کی پیچیدگی اکثر اسی پر مبنی ہوتی ہے، مثلاً

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کہنا یہ ہے کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، اسلئے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں، مگر جب تک یہ جملہ کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، بڑھایا نہ جائے عام ذہن معنی مقصود کی طرف منتقل نہیں ہوتا، مگر شاعر نے اس کے ذکر نہ کرنے میں لطافت رکھی ہے کہ اس نے گویا قصداً ذکر نہیں کیا، اسلئے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اسکے جتانے کی کچھ ضرورت نہیں،

اب میں ان لوگوں کے چند اشعار ایسے نقل کرتا ہوں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ انھوں نے طرز ادا میں کیسے کیسے اسلوب پیدا کئے ہیں، اور ان میں کیا کیا جدتیں کی ہیں

مرزا غالب

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

گرتی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام سبو میخانہ خالی ہی

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہئے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہی گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

حکیم مومن خاں

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

نو فلک ہیں کیا کرے یہ نالۂ آتش فشاں
ایک دشمن سر سے کھویا دوسرا پیدا ہوا

اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں
بدنام ہو جہاں میں تیری بلا عبث

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں
سچ ہے کہ مجھ میں طاقتِ جور و ستم نہیں

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

ذوق

ہاں تا اہل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیِ دوراں سے

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سن سن اپنے کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے

طبقہ متاخرین

اس طبقہ کو میں نے تین دور پر تقسیم کیا ہے، دورِ اول ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کا، دوسرا دور امیر و داغ اور ان کے معاصرین کا، تیسرا دور حالی و اکبر کا جنھوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی ہی

دورِ اول (۱) دورِ اول کے شعرا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان میں تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ کو نکال دیا، جو اُن کے مذاقِ سلیم میں گراں اور ثقیل معلوم ہوتے تھے، مثلاً آئے ہے، جائے ہے، کہے ہے، کھوئے ہے، دوں ہوں، لوں ہوں، ٹک، بنت، کبھو، کسو، تئیں، آن کے، ہمیت مت، زور بمعنی بہت یا عجیب یا جمع مونث کے معنوں کو الف نون کے ساتھ آئیاں، جائیاں، اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بولنا جیسے بھاریاں،

مگر ناسخ کے کلام میں کہیں کہیں زور کا لفظ بمعنی بہت، یا عجیب، پایا جاتا ہے، اور آتش کے ہاں بعض بعض موقعوں پر رقیباں، خوباں، انگڑیاں، زور، بل بے بن

بجائے بغیر، میرے شامل بجائے میرے ساتھ، پسارے، بجائے پھیلائے، شراکت بجائے شرکت، فی الواقعی بجائے فی الواقع، ایک آدھ جگہ موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بھی کر دیا ہے، مثلاً، ع

بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں

اسی قسم کے اور بھی الفاظ پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعضے پرانے روزمرہ کے جرم میں نکالے جا چکے ہیں اور بعضے غلط ہیں، کچھ عجب نہیں کہ یہ اُن کا ابتدائی کلام ہو،

(۲) افسوس ہے کہ ان لوگوں نے زبان کو صاف کرنے پر بھی غزل میں سادگی کا خیال نہیں رکھا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک حد تک ترقی کی تھی، منطق، حکمت، طب اور علم کلام کی گرم بازاری میں عربی الفاظ زبانوں پر کثرت سے چڑھ گئے تھے،

ادھر اس بات کا حوصلہ تھا کہ قدماء سے بڑھ کر کام کیا جائے تا کہ اپنا انداز اُن سے نرالا ہو، نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ایسی صنف لطیف میں عربی الفاظ رفتہ رفتہ کثرت سے داخل ہو گئے اور بجائے اس کے کہ پہلے سے زبان میں زیادہ شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوتی زیادہ ثقیل ہو گئی، اور سیدھی سادی زبان بازاریوں کی زبان قرار پا گئی، ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے اصنافِ سخن میں سے صرف غزل کو پسند کیا، اگر یہ لوگ قصیدے بھی لکھتے ہوتے تو ان کا حوصلہ بہت کچھ اس میں نکل جاتا، اور وہ ایسے ثقیل الفاظ کے متحمل ہو جاتے، اگر تم جرأت اور ناسخ کے دیوان کو ملا کر دیکھو تو اس کا کافی ثبوت ملے گا کہ ان دونوں کی زبانوں میں کتنا فرق ہے، چونکہ شیخ امام بخش ناسخ اس دور کے بہترین شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں، اس لئے میں انہی کے کلام کو مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں،

تن پروروں کی تیغِ زباں سے نہ تھی پناہ
گو درعہ تھا دراعہ نقوشِ حصیر کا

کیونکر اے ناسخ خوارِ عجل دشمن نہ ہو خوار
کیسے موسیٰؑ کا علیؑ شیرِ خدا ہارونؑ ہوا

زیست بھر سوجھا نہ مجھکو چارۂ سودائے عشق
بارے کافور حنوط اب داغ کو مرہم ہوا

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر
دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰؑ مار پر

دیکھیو ناسخ سرِ شیخِ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

قمر ہی کیا ترے آگے محاق میں آیا
کہ آفتاب بھی تو احتراق میں آیا

مل گیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے
ہوں جو عیسیٰؑ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

سوے کعبہ تیرے عاشق سجدہ کرتے ہیں کوئی
تیری ابرو کی طرف قبلہ محوّل ہو گیا

بڑا کال ہے ناسخ غمِ عالم فراہم کر
ارادہ ہے اگر اے چرخ اُس کی میہمانی کا

غیر کو نذر کسی جدیا کا میں سیاح نہیں
بیشۂ شیرِ خدا بن کہیں سیاح نہیں

ظلم طولِ شبِ فرقت کے تطاول نے کیا
دادرس کوئی بجز فالقِ الاصباح نہیں

سکانِ خرابات ہیں مطلق متواضع
ثابت مژۂ نرگسِ میگوں کے ہے خم سے

۳۔ بدنصیبی سے اُس زمانہ میں قابلیت کا معیار صنائع و بدائع اور اس میں مخصوص صنعت "مراعات النظیر" پر آکر ٹھہر گیا تھا، اور بعضوں نے اس رعایتِ لفظی کا پردہ اتنا باریک کر دیا تھا کہ وہ ہوا کے جھونکے سے ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئے، اور شاعری اچھا خاصہ سوانگ بن گئی،

اس میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اگر نازک خیالی کی بنیاد کسی لفظی تناسب پر ہوگی اور اسی لفظ کے تمام اوصاف و لوازم پر عمارت کھڑی کی جائیگی، وہ عمارت یقیناً ناپائدار ہوگی، اور اگر اس شعر کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کر دیا جائے تو ساری نکتہ آفرینیاں بیکار ہو جائیں گی،

افسوس ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ اس میں بھی سب سے آگے ہیں اور ان کے بعض شاگردوں نے اس میں اپنی تمام قوت صرف کی ہے،

شیخ صاحب فرماتے ہیں،

مشرقِ خورشید تیرے نور سے ہے، ورنہ نہیں
کون ہے بارہ دری میں آج جو ششدر نہیں

جس جگہ چلتا ہے میٹھی پڑیوں تیرا فرس
ذائقہ میں وال برابر خاک ہے شکر نہیں

وہ بتِ شیریں ادا کرتا ہے مجھ کو سنگسار
یہ شکر پارے برستے ہیں جنوں پتھر نہیں

کیا ہی اے طفلِ پری تابِ کمر کا ہے اثر
تیری ٹکری کے کبوتر بھی کمر کرتے ہیں

بس نہ ترسا بہت اے کافرِ ترسا مجھ کو   لبِ جاں بخش دکھا بہرِ مسیحا مجھ کو

چنپا کلی کے پھول نہ گل کی کلی میں بو   جیسی ترے گلے کی ہے چنپا کلی میں بو

خواجہ وزیر شاگرد ناسخ

سوکھ کر کانٹا ہوا دستِ جنوں   خار دار اب ہاتھ کی مچھلی ہوئی
بے ہوا اڑنے لگا مشتِ غبار   طبع اپنی خاک کی یادی ہوئی

دیکھ چھپ جائیگا او بت مرے ترسانے سے   اٹھ کے کعبہ کو چلا جاؤنگا بتخانے سے

زلف کی چال صبا چلتی ہے   کیا پریشان ہوا چلتی ہے

کھا گیا مجھ ناتواں کو غم مرے خوش چشم کا   ہو کے کاہیدہ اسی آہو کا چارہ ہو گیا

الفتِ چاہِ زنخداں میں وہ لاغر ہوں وزیر   روزنِ مور مری نظروں میں اندارے ہیں

بھر دے عوض شراب کے ساغر کو بھنگ سے   گاڑھی چھنی ہے ساقی اب اک سبز رنگ سے

میر وزیر علی صبا شاگرد آتش

کولھو میں گردشِ نگہِ یار سے پسا   تل تیل ہو کے بہ گیا چشمِ غزال کا

کھائیں گے زہر اُن کے خط سبز فام پر   سر سبز ہونگے خضر علیہ السلام پر

بک گئے ہیں آپ تو غیروں کے ہاتھ   بندہ پرور اب غلام آزاد ہو

مرزا دبیر

شامی کباب تھے یہ ہوئی جب شرر فشاں   اہلِ تتار بن کے ہرن رن سے تھے رواں

مصری نہ بات کر سکے سب بولے الاماں   بت بن کے گبر رہ گئے پتھرائیں پتلیاں

زردار زرد ہو کے گلِ اشرفی بنے   نصرانی خاک ہو کے گلِ ارمنی بنے

امانت کی شاعری کا دارومدار اسی ضلع جگت پر ہے، مشکل سے کوئی صاف شعر انکے یہاں مل سکتا ہے، خصوصاً واسوخت کی شہرت کی بنیاد اسی پر ہے، جس کی ہمارے بچپن میں بڑی دھوم تھی، نمونہ کے طور پر صرف ایک بند اس کا بھی سن لو،

چکنی باتوں سے اسے چھالیا سب نے ایسا   حال دہرایا کوئی میں نے تو منہ پھیر لیا
جی میں کٹتا رہا کچھ صاف زباں سے نہ کہا   بات کی ایسی چبا کر کہ ہوا دل چورا
عطر کی بو سے معطر ہوئے گھر گلیوں کے
خاصدان آنے لگے عطر لگی ڈلیوں کے

یہ داستان بہت دراز ہے، ان لوگوں میں سے جس کا دیوان جی چاہے اٹھا کر دیکھو بغیر کاوش کے بہت سے اشعار اسی قسم کے مل رہیں گے، میں دو چار شعر اور نقل کر کے اس قصہ کو ختم کرتا ہوں،

رشک

مرغ دل کو توڑ گئی بلی اگر دروازسے کے　　رخنۂ تن کو کتر یگا چوہا تمھاری ناک کا

مہندی نے شعلہ پاؤں تمھارا بنا دیا　　کیا گرم ہے کہ بونٹ کو ہولا بنا دیا

عید بھی وصل سے گئی خالی　　کچھ گلے لگنے کا لگاؤ نہیں

ع　بیریوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں

ع　بھیڑیئے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر

(۴۴) تشبیہ یا استعارہ بجائے خود نہایت عمدہ چیز ہے، جس وقت گفتگو کا معمولی انداز جوش پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اسی کے ذریعہ سے کلام میں زور اور قوت پیدا کرنی پڑتی ہے، علاوہ اس کے یہ چیزیں کلام کو خوبصورت بھی کر دیتی ہیں، جیسا کہ زیور سے حسینوں کے جمال میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے، مگر بقول آزاد یہ رنگ اگر اس حد تک رہے جیسا چہرہ پہ غازہ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید ہے، اور اگر حد اعتدال سے گذر جائے تو اسکی شدت سے زبان خیالی باتوں سے فقط تہجات کا سوانگ بنجاتی ہے،

ایک بات اور بھی ہے کہ تشبیہیں اور استعارے قریب لماخذ ہوں یعنی پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں لطافت و نزاکت پیدا ہو جائے گی، اور اگر دور پڑ جائیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت پیدا ہو جائے گی، اسی طرح اگر اس خاص صفت یا ان مخصوص اوصاف میں جن میں کسی چیز کو کسی سے، تشبیہ دی گئی ہے یا استعارہ کیا گیا ہے، پوری پوری مناسبت نہ ہوگی، تو کلام بد رنگ، اور بے مزہ ہو جائیگا،

افسوس ہے کہ متاخرین نے استعاروں اور تشبیہوں سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں وہ حد اعتدال سے گذر گئے ہیں اور ان باتوں کا لحاظ بہت کم رکھا ہی، صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کر کے کلام کو اتنے اینچ پینچ میں ڈالدیا ہی کہ اس گورکھ دھندے کو کھولتے کھولتے مطلب غائب ہو جاتا ہی اور اکثر کوہ کندن و کاہ بر آوردن کی مثل اس پر ٹھیک اترتی ہے، میں پہلے صاف تشبیہوں اور استعاروں کے نمونے پیش کرتا ہوں، اسکے بعد انکی پیچیدہ تشبیہوں اور استعاروں کی گرہیں کھولنے کی کوشش کرونگا،

خواجہ حیدر علی آتش

صبحِ بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب
سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہی

نیلوفر آنکھ ہی مرے دریائے حسن کی
شب رنگ مردمک نہیں بھونرا کنول میں ہے

غنچے شگفتہ ہوتے ہیں آئی ہی فصلِ گل
کپڑوں کے پھاڑنے کی بہار آجکل میں ہی

زیرِ زمیں سے آتا ہی جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا
ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑیگا اوڑیگا نشانہ کیا

یہ گلرنگ ہی جھلکی جو سرخی پان کی آئی
گلوے یار پر عالم ہوا شیشہ کی گردن کا

صیادِ حسن کو ملتا ہی جب شکارِ عشق
بلبل کو پھانستا ہی رگِ گل کے دام سے

اے مرغِ دل ہے فاصلہ اس زلف و خال میں
دانہ ترے نصیب کا باہر ہے دام سے

فصلِ بہار آئی مبارک ہو اے جنوں
خار اور آبلہ سے ملاقات راہ کی،

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

خواجہ آتش کے دیوان میں اس طرح کی صاف تشبیہیں، استعارے اور حسنِ تعلیل کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں، مگر ان کے حریف شیخ امام بخش ناسخ جو اپنی دقت پسندی کی وجہ سے بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں، سیدھی بات بہت کم کہتے ہیں، کہتے بھی ہیں تو بے مزہ بات کہتے ہیں مثلاً

ابھی ہر چند وہ بت نوجواں ہے
سفید اس کا مگر موے میاں ہے

حسبِ معمول کمر کو بال سے تشبیہ دی، پھر بال کے اوصاف اس کے لئے ثابت کر کے بدن کے لحاظ سے کمر کو سفید قرار دیا، پھر کمر کا بال سے استعارہ کر کے اسکی سفیدی پر اظہارِ تعجب کر دیا، ان نکتہ آفرینیوں کے بعد مطلب یہ نکلا کہ بال بڑھاپے میں سفید ہوا کرتے ہیں، مگر تعجب ہے کہ معشوق کا بال جوانی میں سفید ہو گیا ہے،

اس بدمزہ مضمون کو دیوان میں بیسیوں جگہ متعدد طریقے سے ادا کیا ہے، مثلاً ایک جگہ یوں فرماتے ہیں،

آرائشِ جمال خداداد عیب ہے
موے کمر کو ذوق نہیں ہے خضاب کا

ایک جگہ چاند کو کہ سات سیاروں میں سے ایک وہ بھی ہے، خانہ نشین بنا کر اس کو ثابت فرض کیا، پھر گھر سے نکال کر اس کے سیارہ ہونے پر اظہارِ تعجب کرتے ہیں،

وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا
اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارہ ہوا

معشوق کی آنکھ کو بہ لحاظ وحشت چشم غزال سے تشبیہ دیجاتی ہی، انھوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ پہلے تو آنکھ کا استعارہ غزالِ چشم سے کیا، چونکہ وہ جانور ہے، اسلئے اسکے واسطے چارے کی بھی فکر کرنی پڑی،

چشم بد دور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف
سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارہ ہوا

اسی مضمون کو خواجہ آتش نے بھی باندھا ہے، مگر طرز ادا نے انکے شعر کو کسی قدر مزیدار کر دیا،

خط پر جو آئینہ میں پڑے ہیں نگاہ یار
آہوے چشم مست ہیں سبزہ چرے ہوئے

رنگ اڑنے کو طیر اور رنگِ حنا کو طائر سے تشبیہ دینا ایک معمولی بات ہی، شیخ صاحب نے اس سے یہ بات نکالی ہی کہ طائر بھی تو جانور ہے، ذبح ہوتے وقت تڑپنا لوٹنا اس کا خاص وصف ہی، یہ وصف اُنھوں نے طائر رنگ کے لئے بھی ثابت کر چھوڑا،

اس ادا سے باڑھ دیکھی آپ نے تلوار کی
طائرِ رنگِ حنا بھی طائرِ بسمل ہوا

اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے، تاہم ع

انصاف شیوہ ایست کہ بالاے طاعت ست

جہاں کہیں دقت آفرینی سے کام نہیں لیتے تشبیہ و تمثیل میں اچھے اچھے شعر بھی نکالتے ہیں، مثلاً

آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک
اڑتا پھرا شجر سے جو برگِ خزاں گرا

خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کے سر بلند
آسماں پیشِ زمیں بہرِ تواضع خم ہوا

طرفہ گل اس باغ میں ہیں اور شبنم ہی عجب
ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا

کیا روزِ بد میں ساتھ رہے کوئی ہمنشیں   پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

مشک میں خوشبو ہی پیچ و تاب مثلِ مو نہیں   پیچ ہیں سنبل میں مثلِ مو مگر خوشبو نہیں

عشق میں بدمست ہوں میں پر کوئی واقف نہیں   نشہ ہے جامِ مئے الفت میں لیکن بو نہیں

مستی آلودہ لب پر رنگِ پان ہے،   تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

۵ - سب سے بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ شاعری کے اس فطرتی جذبہ کو جس کا تہذیب و تمدن سے اس قدر مضبوط تعلق ہے کہ جس قوم میں کوئی روشنخیال اور باریک بیں شاعر نہ ہو تو وہ متمدن نہیں کہی جاسکتی، اسکو ضلع جگت کے ساتھ فحش اور گندے مضامین سے اس دور کے شعرا پاک نہیں رکھ سکے، عشق کو فسق اور آوارگی کا مرادف بنا دیا، گویا ہماری اخلاقی حالت پستی کی انتہائی حد تک پہونچ گئی، نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی قوت باقی نہ رہی، بلکہ قوم کا مذاق سر سے بگڑ گیا، اور قبولِ عام حاصل کرنے کو جامۂ عریانی اختیار کرکے بے پردہ مضامین، سوقیانہ محاورے اور مبتذل الفاظ سے کلام کو ناپاک کردیا اور ایڑی چوٹی میں پھنس گئے،

متوسطین میں جرأت، انشا اور رنگین نے جس کام کی ابتدا کی تھی اور کھل کر نہ کر سکے تھے اُس کو طبقۂ متاخرین کے شعرا نے پورا کر دکھایا، زمانہ بھی انکو بدقسمتی سے ناہموار ملا، غازی الدین حیدر نواب وزیر سے بادشاہوں کو باپ کی جمع کی ہوئی دولت ملی، اس سے جن مشاغل کی بنیاد ڈالی، اس پر نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ نے شاندار عمارتیں کھڑی کر دیں اور

ایسا رنگ اچھلا کہ ہولی کا سوانگ اور گنواروں کی کبیر مات ہو گئی،

شیخ امام بخش ناسخ کی گل افشانی ملاحظہ ہو،

دانے ہیں انگیا کی چڑیا کو بنت کی چنیاں
بلبلتی ہیں بالے کی مچھلی موتیوں کی آب میں

دمکتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک حلقے سے
تری جالی کی کرتی میں ہے عالم کامدانی کا

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو

اڑ نہیں سکتی تری انگیا کی چڑیا اے پری
جالی کی کرتی کا اس پر اے پری رو جال ہے

تصور میں ہے اک انگیا کی چڑیا
یہ دل گنجشک کا اب آشیاں ہے

رات کو چوری چھپے پہونچا جو میں
غل مچایا اُس نے دوڑو چور ہے

یہ التجا ہے پیر مغاں کی جناب میں
رکھوں میں ساقِ ساقیِ گلفام دوش پر

نواب سید محمد خاں رند

یوں تو جایا کئے ہر سال ہمیشہ لیکن
اب کی نوچندی میں اک چاند سا مکھڑا دیکھا

کھولئے شوق سے بند انگیا کے
لیٹ کر ساتھ نہ شرمائیے آپ

کیونکر نبھے گی ہم سے ملاقات آپ کی   واللہ کیا ذلیل ہے اوقات آپ کی
یاں ہم ہیں اور داغ غم و حسرت وصال   کٹتی ہے عیش باغ میں اوقات آپ کی
کیا آسمان پہاڑ کے ٹھگلی لگائے گی   صاحب اُبھر علی ہے بہت گات آپ کی

مرزا محمد رضا برق

اودی کرتی لال چکن اور اس پہ سنہری گوٹ لگی   ابر سے نکلا چاند کا ٹکڑا برق کے دل کو چوٹ لگی

خیر گذری کہ چلے آئے کہا مان لیا   ورنہ تم دیکھتے اس وقت کہ پھر کیا ہوتا

عشق اگر منظور ہے اس سیم تن سے آپ کو   پہلے رکھ لیجے منگا کر برق توڑے زر کے پاس

حکیم مسیحا

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی   آج ہم عنقا کو لائے دام میں

تیرے پستاں پر نظر آتا ہے عالم نور کا   اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا

امداد علی بحر

ڈوپٹے کو آگے سے دُہرا نہ اوڑھو   نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

۴- اس دور کی نسبت جو کچھ اب تک کہا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ اس دور کے شعرا نے اردو کی کسی حیثیت سے بھی کوئی مفید خدمت نہیں کی، میں نے خود نمبر ۱ میں اصلاحِ زبان کے متعلق اُنکی مساعیِ جمیلہ کا جو ذکر کیا ہے، وہ اُنکے افتخار کیلئے کچھ کم نہیں ہے،

علاوہ اس کے اس دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کر کے زبان میں زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت و صفائی پیدا کر دی ہے، مرزا دبیر اور میر انیس کا ذکر میں نے ضمیمہ نمبر ا میں کیا ہے، اس لئے کہ ان کی شاعری کی جولانگاہ ایک دوسرا میدان ہے، مگر حقیقت میں وہ اسی دور کے شاعر ہیں،

ان دونوں نے مرثیہ گوئی کی صنعت میں ایسی ترقی کی ہے کہ جس کے آگے قدم بڑھانا نظر بحالاتِ موجودہ دشوار معلوم ہوتا ہے، ان لوگوں نے بھی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے، اور مبالغہ کی تو حد کر دی ہے، مگر باوجود اس کے زبان میں وہ لوچ اور وسعت پیدا کی ہے جو انہی کا حصہ ہے، ایک ایک مضمون کو سینکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے، اور ہر قسم کے خیال کا ایسا طلسم باندھا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، صبح کا عالم دیکھو رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شامِ غریباں، رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں، کبھی اندھیری راتوں کی ظلمت، دن کو کڑاکے کی دھوپ، لوؤں کی لپٹ، آفتاب کی آتش فشانی، غرضکہ قوتِ تخیل سے ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی شاعری سے اردو زبان کو گلہائے رنگا رنگ سے مالا مال کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اردو زبان ہمیشہ ان کی منت پذیر رہے گی،

نواب مرزا شوق خواجہ آتش کے شاگرد اور اسی دور کے شاعر ہیں، انھوں نے زہرِ عشق بہارِ عشق وغیرہ چند مثنویاں اس صفائی اور سادگی سے لکھی ہیں جو اخلاقی حیثیت سے کتنی ہی کم رتبہ ہوں، مگر زبان اور بیان کے لحاظ سے اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں،

مرزا نسیم دہلوی کو بھی میں نے اسی دور کے شعرا میں شمار کیا ہے، اس واسطے کہ جو زبان اس دور کے شعرا کی ہے وہی ان کی بھی ہے، انھوں نے اپنے استاد حکیم مومن خاں کی دقت پسندی کو دور کر کے

انکی نادر ترکیبوں کی میناکاری کو اس قدر صاف اور روشن کر دیا ہی، جو قابلِ تحسین ہے،

دورِ دوم

اس دور میں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، اُن میں سے بیشتر شعرائے دورِ اوّل کے منت پذیر ہیں، زبان اور بیان دونوں چیزوں کو انھی سے سیکھا ہے، اور انھی کے کلام کا تتبع کیا ہے، اس وجہ سے ان کا انداز وہی ہے جو اُن بزرگوں کا تھا،

تاہم انھوں نے اپنے اساتذہ کی زبان میں زیادہ صفائی اور سادگی پیدا کر دی ہے، اور جو قواعد ان لوگوں نے وضع کیے تھے ان پر عملدرآمد پورے طور پر ان کے زمانہ میں نہیں ہوا تھا، انکو انھوں نے اچھی طرح سے نباہا، جس کثرت سے ثقیل لفظوں اور فارسی ترکیبوں پر ان لوگوں نے شاعری کی بنیاد رکھ دی تھی، یا تشبیہوں اور استعاروں میں جو پیچیدگیاں ڈال دی تھیں ان سے بہت کچھ انھوں نے اپنا دامن بچایا ہے،

اس دور میں بھی خصوصیت کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کو اول درجہ پر رکھنا چاہیے جنھوں نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت، صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے، انکے ہمعصروں میں کوئی بھی زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی اور محاوروں کی فراوانی میں اُن کا مثل نہیں،

دوسرے درجہ پر حکیم ضامن علی جلال کا درجہ ہے، جن کی زبان اور طرزِ ادا کو لکھنؤ کی روزمرہ اور طریقۂ بیان کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے،

۲- جیسا کہ ہر زمانہ میں ہوا کرتا ہی، اس دور کے شعرا میں بھی ہر ایک کا رنگ اور انداز علیحدہ ہی، شکوہِ الفاظ، مضمون آفرینی اور ہر رنگ کے شعر کہنے میں منشی امیر احمد امیر کو خاص قسم کی قدرت حاصل ہی، روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ طرزِ ادا کی شوخی اور بانکپن داغ کا حصہ ہے، طرزِ ادا میں ایک قسم کا لوچ جو اہلِ زبان کے ساتھ مخصوص ہوا کرتا ہے جلال کے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے، الفاظ کی رنگینی اور مضمون کی دلآویزی میں تسلیم سب سے بڑھے ہوئے ہیں

اور تشبیہوں اور استعاروں کی برجستگی میں محسن کا کوئی ہم پلہ نہیں، اصنافِ سخن کے لحاظ سے مثنوی کے سوا ہر صنف میں امیر کو قدرت حاصل ہے، مثنوی میں تسلیم کو جو مرتبہ حاصل ہے اس میں اُن کے ہمعصروں میں سے کوئی بھی اُن کا شریک و سہیم نہیں، قصیدے میں یہ دونوں بھی کچھ کم نہیں، مگر محسن نے جس زور و شور کے قصیدے لکھے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے، غزل میں داغ کو اور ان کے بعد جلال کو ان سب پر مزیت ہے،

بات یہ ہے کہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، مگر شروع ہی سے شعراء نے اس کو جذباتِ انسانی کے ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے، خواہ اُن کا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا دنیا کی بے ثباتی، یا موت کا خیال یا اور کسی قسم کا جذبہ، یہاں تک کہ اخلاق و مواعظ کو بھی اس میں داخل کر دیا ہے، اسی لحاظ سے جب تک غزل کو جذباتِ انسانی کے ظاہر کرنے کا آلہ بنائے رکھو گے، غزل غزل رہیگی ورنہ نری لفاظی ہوگی،

(۳) خیالات کے اعتبار سے اس دور کے شعراء کا کلام پڑھو تو ان میں کسی طرح کی تازگی نہ پاؤ گے، وہی گل و بلبل کی داستان، شمع و پروانہ کا قصہ، لیلیٰ و مجنوں کی کہانی، جفائے یار، رشکِ اغیار، شوقِ وصل، رنج و فراق، زلفِ پریشان، چشمِ فتاں، نرگسِ بیمار، سیبِ زنخداں، رندی و بادہ خواری، اور زاہدوں پر طعن و تعریض کے مضامین کو الفاظ کی اُلٹ پھیر، اور ردیف و قافیہ کے ادل بدل سے باندھ کر مختلف شکلیں پیدا کر لی ہیں،

چاہو تو اسی کو اُن کی شاعری کا کمال سمجھ لو کہ ان کے اساتذہ نے جن مضمونوں کو اپنے خاص انداز سے باندھا ہے، انھوں نے اس میں فی الجملہ صفائی اور سادگی پیدا کر کے شکل بدل دی ہے، یا یوں سمجھو کہ سانچہ بدل دیا ہے، پہلے جو چیز ایک شکل پر ڈھلی تھی وہ اب دوسری شکل پر ڈھل گئی ہے، جس میں بہ نسبت شعرائے دورِ اوّل کے کلام کے کسی قدر صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے،

یہی وجہ ہے کہ متاخرین کے کلام میں کسی قسم کا ولولہ اور جوش بہت کم پایا جاتا ہے، اگر یہ لوگ اپنے کلام کو خود اپنے خیالات اور جذبات کا آرگن بناتے تو اس کا بہت عمدہ اثر پڑتا، اور ان کو اپنے اساتذہ کی پیروی کرنے پر قناعت نہ کرنی پڑتی، اور آسیر کا یہ شعر ان کے حسبِ حال نہ ہوتا،

شاعرانِ حال کیا مضمونِ نو پائیں اسیر
ڈھونڈھتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں

حصّۂ اوّل

طبقۂ متقدمین

اس طبقہ کے شعرا کو تین دور پر تقسیم کرنا چاہیئے، پہلا دور قطب شاہ اور مولنا نصرتی وغیرہ کا، جن کا نشو و نما حیدرآباد اور بیجاپور میں ہوا ہے، ان کی زبان عالم طفولیت میں ہے دکنی زبان کے الفاظ و روابط کثرت کے ساتھ ان کے اشعار میں پائے جاتے ہیں،

یہ دور ابو الحسن تاناشاہ اور اس کے معاصرین پر ختم ہو جاتا ہے، اس دور کے جن شاعروں کا حال مجھے معلوم ہوا ہے، ان کا ذکر مقدمہ میں کر چکا ہوں،

دوسرا دور ان شعرا کا ہے جن کا نشو و نما اورنگ آباد کی آب و ہوا میں ہوا ہے جو عالمگیر مرحوم کے پایہ تخت ہونے کی وجہ سے اہلِ فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا، اور ہندوستان و ایران کے نامی گرامی خاندانوں کے لوگ وہاں مجتمع تھے، اسی وجہ سے اُن کی زبان اور ان کے محاورے دور اول کے شعرا کی زبان اور محاوروں سے زیادہ صاف ہیں،

تیسرا دور شعرائے دہلی کا ہے جو فرخ سیر کے عہد سے شروع ہو کر احمد شاہ کے زمانے پر ختم ہو جاتا ہے، اس چالیس پچاس برس میں ریختہ نے کافی طور پر ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی، خصوصاً محمد شاہ کے عہدِ دولت میں جو لوگ فارسی میں بجا طور پر شعر کہتے تھے، وہ بھی تفنن کے خیال سے ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے،

دورِ اوّل

دور اول کے شعراء کا ذکر مقدمہ میں کافی طور پر ہو چکا ہے، مگر قصداً ان کے وہی اشعار

نقل کیے گئے ہیں، جو زیادہ صاف ہیں، زیادہ حصہ اس دور کے کلام کا ایسا ہے جس میں دکنی زبان شریکِ غالب ہے،

یہاں پر صرف مولانا نصرتی کا ذکر کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں جو اپنے زمانہ کے ملک الشعرا تھے، اگر مولانا ہاشمی یا ابو الحسن تاناشاہ کے زمانہ کے لوگوں کے حالات ملتے تو وہ بھی اس دور میں نمایاں جگہ لیتے، مگر افسوس ہے کہ تاریخ اور تذکروں سے ان کے حالات کا کافی مواد بہم نہیں پہنچا، اس وجہ سے مجبوراً ان کو نظر انداز کرتا ہوں،

مولٰنا نصرتی

یہ محمد عادل شاہ اور اس کے بیٹے علی عادل شاہ کے زمانہ کے شاعر ہیں اور اپنے وقت کے ملک الشعرا تھے، افسوس ہے کہ ان کے حالات گمنامی کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں، نام و نسب تک کا ہم کو علم نہیں،

زبیری نے بساتین السلاطین (تاریخ بیجاپور) میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ان کی تصنیفات میں گلشنِ عشق ایک مثنوی ہے جس میں منوہر کنور اور مدمالتی کی عشق بازی کا قصہ نظم کیا ہے، دوسری کتاب علی نامہ ہے، شاہنامۂ فردوسی کا جواب جو ۱۰۷۶ھ میں لکھا تھا، جس میں علی عادل شاہ کی فتوحات اور اس کے زمانہ کے کارنامے نظم کیے ہیں، تیسرا مجموعہ قصائد کا ہے، چوتھا غزلوں کا دیوان ہے،

میری نظر سے ایک پرانی بیاض گذری ہے، جس میں مولانا نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل ہے، تاریخ کتابت ۲۲ محرم ۱۰۸۳ھ اس میں لکھی ہے، اور اکبر آباد میں یہ لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا کلام اس وقت اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اسکی نقلیں انہی کی زندگی میں اکبر آباد پہنچیں، اور شائقین نے اپنی بیاضوں پر اتار لیا، میرے نزدیک کسی کلام کی

مقبولیت کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی،

اکتیس
معراج نامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ محمد عادل شاہ کے عہد میں لکھا گیا ہے، اکیس شعر اس میں ہیں، بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے،

زبان اس کی زیادہ سخت ہے، کیونکہ دکنی زبان کے الفاظ بکثرت اس میں استعمال کئے ہیں، زبیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے عیب جو ان کی زبان پر، ہنستے اور اعتراض کرتے تھے، نصرتی نے علی نامہ میں اس کا جواب دیا ہے،

خریدار کو خوب سودے سے کام نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام

مضامین سوں جا بجا بات بول دکھایا سکت فیض کا حق کے کھول
طاقت
یلگ فن میں کی سحر کی بہت چھند خبیثاں کے جیباں کو کینا ہوں بند
ہے بات خبیثوں زبانوں گیا
کیا ہوں سخن مختصر بے گمان کہ یو شاہنامہ دکن کا تو جان
یہ
کہ ہر اک زباں حضرت غیب داں سکھایا سب آدم کو سو تھے نہاں
ہوئی تسپہ جو نسلِ آدم کی اصل کلاماں اُنہی کے ہوئے فصل فصل
انوں میں جو تھے شہر کے اوستاد گیا وہ زمانہ رہے شعر یاد
ان
سخن بن نزاکت کے نا دیکھ بھول کہ خوش باس سوں قدر پایا ہے پھول
ہے
نہ کہتا ہوں میں بے وقوفوں کی بات نہ کم ہوں مثالیں تو حاسد نے ہات
بات
وے جو سخنداں ہیں صاحب تمیز کہ رکھا اس سخن کو رکھیں نت عزیز
ہمیشہ پسند کرکے

نقل ایک دن علی عادل شاہ خاص محل میں فوارہ کے چھوٹنے کا تماشا دیکھ رہا تھا، اس وقت پانی کے قطرے موتی کی طرح چمک رہے تھے، بادشاہ کے دل پر اس نظارہ کا ایسا اثر

پڑا کہ اس کے منھ سے بیساختہ یہ مصرع نکل گیا، ع

ابرا سو یو فوارہ پانی پے کیا نچھل ہے
ابھرا یہ پر صاف

مولانا نصرتی حاضر تھے، انھوں نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پہنچایا،

تجھ شہ او پر اڑانے کا ایک مورچھل ہے

علی نامہ کا ایک قلمی نسخہ نواب عماد الملک کے کتب خانہ میں موجود ہے، آصفی نے محبوب الزمن میں لکھا ہے کہ نصرتی نے ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی ہے،

دور دوم

شعرائے دکن

میر محمد تقی میر نے نکات الشعراء میں شعرائے دکن کا ذکر میر عبد الولی عزلت کی بیاض سے نقل کیا ہے، حال تو کچھ لکھا نہیں، کسی کے ایک دو شعر، کسی کے کچھ زیادہ لکھے ہیں، اور ان کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے،

"یکے ازیں شاعران سمتِ دکن کہ پر بی رتبہ اند مگر بعض چنانچہ ولی و سید عبد الولی و سراج و آزاد کہ معاصرِ ولی بود سر رشتہ مضبوط گوئی بدست ایشان یافتہ می شود، باقی سر کلافہ داشت اھ"

میر صاحب نے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے، اور جو کلام ان کا انھیں ملا ہے اس کے لحاظ سے یہ رائے ان کی صحیح ہو تو ہو مگر اصلیت اور واقعہ کے اعتبار سے غلط اور بالکل غلط ہے، میر صاحب نے دکن کے سینکڑوں شعراء میں سے کم و بیش پچیس شاعروں کا ذکر کیا ہے، ان سینکڑوں میں بیسیوں ایسے ہیں جو میر عبد الولی عزلت سے بہتر شعر کہتے ہیں،

کسی کے ایک دو شعر پڑھ کر اس کی نسبت جو رائے قائم کی جائے گی وہ اصلیت سے دور ہوگی، مرزا داؤد کا صرف ایک شعر میر صاحب کو ملا ہے، حالانکہ ان کے دیوان میں پانسو شعر سے کم نہیں، اگر تم اسی ایک شعر کو پڑھ کر سارے دیوان کو خرافات کہدو تو اس سے زیادہ زبردستی کیا ہو سکتی ہے،

جن لوگوں کی خبر میر صاحب کو نہیں ہوئی، ان میں سے میر عاشق علی خاں ایما، میر غلام علی ارشد، مرزا علی نقی خاں ایجاد، میر عبدالحیٰ خاں صارم، عارف الدین خاں عاجز، میر اولاد محمد ذکا، بچھمی نراین شفیق اور بہت سے ایسے شعرا ہیں جن کے ہاں زبان کی صفائی، خیالات کی رنگینی اور پختگی کلام کے تمام لوازم موجود ہیں،

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ چھاپہ خانوں کی کثرت سے نایاب کتابیں کوڑیوں کے مول بک رہی ہیں، ان کے دواوین اور پرانے تذکرے اب تک گمنامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں،

شمس الدین ولی[1]

شمس الدین لقب، ولی اللہ نام، ولی تخلص اورنگ آباد میں تقریباً سنہ ۱۰۷۰ھ میں پیدا ہوئے خاندان کا حال معلوم نہیں، آزاد نے آب حیات میں ان کو گجرات کا باشندہ اور علامہ وجیہ الدین علوی کی نسل سے بتایا ہے، مگر اس کی کوئی تاریخی سند نہیں بتائی، صرف تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کا حوالہ دیا ہے، یہ تذکرہ میری نظر سے نہیں گذرا، مگر میر محمد تقی میر اور میر حسن کے تذکرے پیش نظر ہیں، وہ ان کو اورنگ آباد کا باشندہ ظاہر کرتے ہیں،

---

[1] اختلاف است درینکہ اول کسے کہ بہ ریختہ سخن کردہ او ست یا پیشتر ہم فکر دریں زبان شائع بود بہ تحقیق تقدیم ثانی بر اول است و توفیق آن ست کہ تا زمانش دیگرے بہ تبہ او نہ رسیدہ و موجد گفتنش را علت ہمیں باشد اھ گلشن بیخار

آصفی ملکاپوری نے حال میں ایک بسیط تذکرہ شعرائے دکن کا شائع کیا ہے اسمیں بھی ولی کو اورنگ آباد کا ظاہر کیا ہے، اور خود ان کے کلام اور ان کے لب و لہجہ سے اسکی سند بہم پہنچائی ہے، کہ وہ دکن کے رہنے والے تھے،

علامہ وجیہ الدین کا خاندان گجرات میں اپنے فضل و کمال اور فیض رسانی کے لحاظ سے بہت معزز و ممتاز سمجھا جاتا تھا، گجرات پر مغلوں کے قبضہ ہو جانے کے بعد اچھے اچھے گھرانوں کے لوگ پریشان ہو کر بیجاپور، احمد نگر، برار اور برہان پور کو چلے گئے تھے، انہی نقل مکان کرنے والوں میں شاہ اسد اللہ علامہ وجیہ الدین کے پوتے بھی تھے، جنھوں نے بیجاپور میں بود و باش اختیار کی تھی، اگر یہ صحیح ہے کہ ولی کو علامہ وجیہ الدین کے خاندان سے نسبت تھی تو کیا عجب ہے کہ یہ شاہ اسد اللہ سے کوئی واسطہ رکھتے ہوں،

آصفی کہتے ہیں کہ بیس برس کے سن میں تحصیل علم کے لئے گجرات گئے اور علامۂ مذکور کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، چند روز کے بعد اسی خاندان کے ایک سجادہ نشین کے ہاتھ پر طریقہ قادریہ شطاریہ، میں بیعت کی،

سید ابو المعالی احمد آباد گجرات کے ایک بزرگ زادے سے ولی کو ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اس کو دیکھنے والے عشق سے تعبیر کرتے تھے، انھوں نے بزرگانِ دین کی زیارت کی نیت سے دلی، سرہند کا سفر اختیار کیا، ولی بھی ان کے ساتھ ہو لئے،

دلی میں شاہ سعد اللہ گلشن نقشبندیہ سلسلہ کے ایک بڑے بزرگ اور بہت پر گو شاعر تھے ولی نے اُن کے فیضِ صحبت سے فائدہ اٹھایا، اور اپنے شعر سنائے، میر تقی میر نکات الشعراء میں لکھتے ہیں کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے ان کے شعر سن کر فرمایا کہ "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"

آزاد کہتے ہیں کہ خود ولی نے ایک رسالہ نور المعرفۃ تصوف میں لکھا ہے، اس میں کہتے ہیں کہ میں نور الدین محمد صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاکِ پا اور شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد ہوں، ولی، محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں دلی آئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں ان کا جی لگ گیا تھا، چنانچہ ولی کی تصنیفات میں سے ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دلی سے اورنگ آباد واپس آئے، یہاں ۱۱۴۱ھ میں وہ مجلس شہداے کربلا کے حال میں ایک مثنوی لکھی، اس کے خاتمہ میں کہتے ہیں ؎

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال
تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول
ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

ایک چھوٹی سی مثنوی ان کی سورت کی تعریف میں بھی ہے، قیام گجرات کے زمانہ میں یہ سورت گئے تھے، وہیں یہ مثنوی تصنیف کی، اس کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں،

عجب شہر داں میں ہے پر نور یک شہر
بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
رہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت
ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

ولی کو گجرات سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی، اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر اپنے پیر و مرشد اور اساتذہ کی زیارت کو پھر احمد آباد چلے گئے اور تقریباً ۱۱۵۵ھ میں وہیں وفات پائی،

ان کا دیوان یورپ میں بھی چھپ گیا ہے، اس میں علاوہ ردیف وار غزلوں کے، رباعیاں، قطعے، دو تین مخمس، قصیدے اور دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں،

ناواقفیت کی وجہ سے عام طور پر یہ خیال چلا آتا ہے کہ ریختہ میں سب سے پہلے ولی نے

دیوان مرتب کیا ہے، اسی بنا پر مولوی محمد حسین آزاد نے اردو نظم کی اولیت کا تاج اُن کے سر پر رکھدیا ہے، اور اردو شاعری کی نسل کا آدم ان کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہی کہ اردو میں ان کو وہ رتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو، فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو حاصل ہے، حالانکہ ان سے سو سوا سو برس پہلے ریختہ میں شاعری اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ اُس میں بے تکلف دیوان مرتب ہونے لگے تھے، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دیوان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں، مولانا نصرتی کا دیوان مفقود ہے، مگر زبیری نے بساتین السلاطین میں اس کا ذکر کیا ہے،

قصائد میں مولانا نصرتی کا قصیدہ میری نظر سے گذرا ہے، جس پر تاریخ کتابت ۲۲ محرم سنہ ۱۰۸۳ھ لکھی تھی، اور قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ محمد عادل شاہ (متوفی سنہ ۱۰۶۳ھ) کے عہد حکومت میں تصنیف کیا گیا ہے،

مثنویوں میں مولانا نصرتی کا شاہنامہ، مولانا ہاشمی کی یوسف زلیخا، اور ولی کے ایک ہمعصر مولوی سید محمد کی فیض عام جو سنہ ۱۱۴۱ھ میں لکھی گئی ہے، جس سال ولی نے وہ مجلس لکھی تھی، مراثی میں میرزان مولانا نصرتی کا ہمعصر اور شاہ قلی وغیرہ ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں ایسے خوشگو شاعر تھے کہ ان کے مرثیے ہاتھوں ہاتھ دلی اور آگرہ پہونچے اور لوگ انکو شوق سے پڑھتے تھے، غرضکہ اصنافِ سخن میں سے ہر ایک صنف ولی سے سو سوا سو برس پہلے ریختہ میں آچکی تھی، مگر زبان کی حیثیت سے دستور کے موافق عالمِ طفولیت میں تھی،

ولی کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے زیادہ صاف ہوگئی، ولی، آزاد، سراج اور داؤد کے اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی ایک زبان ہے،

تاہم اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ولی اپنے ہمعصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور

اس کے کلام کو قبولِ عام حاصل ہو جانا اس کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے،

کلام کا رنگ ملاحظہ ہو۔

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا
ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا
مت جا چمن موں لالہ بلبل پہ مت ستم کر
گرمی موں تجھ نگہ کے گل گل گلاب ہوگا
مت آئینہ کون دکھلا اپنا جمال روشن
تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا
مجکو ہوا ہے معلوم اے مستِ جامِ خوبی
تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا
ہاتف نے یوں دیا ہے مجکو ولی بشارت
اسکی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اس مخزنِ اسرار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحۂ و زنّار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سرو رعنا کے حضور
خود بخود رسوا ہی اسکو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب صفت تیرے جامۂ گلرنگ کا
جامۂ زیبا کو رنگِ جامۂ دیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیورِ لب کر سبحان الذی اسریٰ کروں
آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کے ولی
سرو قد کو دیکھ کر سیرِ عالمِ بالا کروں

مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہر جائی ہے
چمن حسن پری رو کا تماشائی ہے
گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع
جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے
شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور
گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے
اے ولی رہنے کوں دنیا میں مقام عاشق
کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

تا حشر رہے بوئے گلاب اسکے عرق سے
جس بر میں یک بار وہ گل پیرہن آوے
سایہ ہو مرا سبز بہ رنگ پر طوطی
گر خواب میں وہ نوخطِ شیریں بچن آوے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُسکو
کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لیجاوے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن
باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

دشمنِ دین کا دین دشمن ہے
راہزن کا چراغ رہزن ہے

فقیر اللہ آزاد

حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے بچپن میں یتیم ہو گئے، مزاج میں اہلیت وغربت اتنی تھی کہ اہلِ محلہ ان کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے،

کچھ معلوم نہیں کہ کس خاندان کے چشم وچراغ تھے اور تعلیم وتربیت کیسی ہوئی، قرینہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے رواج کے مطابق فارسی کی پوری اور عربی کی بقدر ضرورت کتابیں پڑھی ہونگی،

تعلیم پوری نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ جوان ہوتے ہی کسی پری پیکر کو دل دے بیٹھے، اور تنکے چننے لگے، ایک حال اور ایک مقام پر قرار نہیں آتا تھا، بیتابانہ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے، اسی حالت میں اپنے دوست وہموطن فراقی کے ساتھ دلی آئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی نہیں ٹھہرے،

میر محمد تقی میر نے نکات الشعراء میں انکا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ "ہمعصر ولی بود بسیار بہ صفا حرف میزد" میر حسن نے بھی اسکی تصدیق کی ہے، مگر دونوں نے ایک ہی شعر انکا نقل کیا ہے، ولی نے ان کی غزل پر غزل کہی ہے، اور ان کی غزل کے ایک مصرع کو تضمین کیا ہے اور اپنے معمول کے موافق ان پر نوک جھونک نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزاد کی شاعری کا ایک حد تک معترف ہے، ؎

آزاد سے سنا ہوں یہ مصرعِ مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا یہ شعر ہے،

آئیں جہاں کی ساری آزاد صنعتیں پر
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

میر سراج الدین سراج

از مردم اورنگ آباد در وقت عالمگیر اول بود، از شاگردانِ سید حمزہ علی دکنی روشن طبع معلوم می شود، خدایش بیامرزد اھ تذکرہ میر حسن،

سراج الدین نام، سراج تخلص، اورنگ آباد کے سادات صحیح النسب تھے، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کا نشو و نما ہوا، اس زمانہ کا اورنگ آباد آج کا ایسا نہ تھا، عالمگیر مرحوم کے پایہ تخت ہونے کی وجہ سے مرجع اہلِ کمال بنا ہوا تھا، ہر علم و فن کے اہلِ فضل و کمال وہاں مجتمع تھے، ان کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی،

میر محمد تقی میرؔ نے نکات الشعراء میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سید حمزہ کے شاگرد تھے، مگر اس کی تصدیق اہلِ دکن نہیں کرتے، خود سراج نے شعرائے فارس کے دیوانوں کا انتخاب کیا ہے، اس کے دیباچہ میں کچھ اپنے خیالات بھی لکھے ہیں، مگر اس میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا، عنفوانِ شباب میں غلبۂ شوق سے از خود رفتگی کی کیفیت پیدا ہوئی، سات برس تک برہنہ پا و برہنہ سر مولانا برہان الدین غریب کے روضہ کے اطراف میں چکر کاٹتے رہے، اور اسی حالتِ مستی میں فارسی میں شعر کہتے، مگر لکھتے نہیں تھے، خود فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے اشعار جمع کئے جاتے تو ایک ضخیم دیوان تیار ہو جاتا،

سات برس گذرنے پر سید عبدالرحمن چشتی (متوفی ۱۱۶۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر طریقۂ چشتیہ میں بیعت کی اور عرصۂ دراز تک انکی صحبت سے مستفید ہوتے رہے اپنے پیر بھائی عبدالرسول خاں کے کہنے سے ریختہ کی طرف توجہ کی، اور عرصہ تک ریختہ میں فکرِ سخن کرتے رہے، عبدالرسول خاں نے دیوان مرتب کیا، جو پانچ ہزار شعروں پر مشتمل ہے اس دیوان کی اشاعت سے دکن میں ان کی دھوم مچ گئی، اور اس پر اتفاق ہو گیا کہ ولی کے بعد دکن میں اس پایہ کا کوئی شاعر نہیں ہوا، خود سراج کو بھی اسکا دعویٰ تھا، فرماتے ہیں،

تجھ بنا اے سراج بعد ولی   کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

اے سراج آرزوے قند نہیں   شعر تیرا ہے جوں نباتِ لذیذ

شاید کہ بعد مرگ کریں خاص و عام یاد   مشہور نہیں سراج کا شیریں سخن ہنوز

مصنفینِ دکن نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ریختہ گوئی میں سراج ولی کا قائم مقام تھا۔

ولی نے زمینِ شعر پر جو پودے لگائے تھے اُن کو سراج نے سرسبز و شاداب کیا، اور اہلِ دکن نے مزے لے لے کر اُن کے پھل کھائے،

اورنگ آباد کی محفلوں میں سراج ہی صدر نشین ہوتے تھے، اور خود اپنے یہاں بھی ہفتہ میں دو بار مجلسِ سماع منعقد کرتے، اس میں شہر کے علماء و مشائخ اور ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے تھے، قوال انہی کی غزلیں گاتے اور وجد و حال کا ہنگامہ دیر تک گرم رہتا،

فارسی میں بھی اچھے اور صاف شعر کہتے تھے، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

گلِ بے رنگِ حقیقت کہ بہ دامانم بود ہمچو اشک از مژہ خویش چکیدم دیدم

نماز عشق ادا کردنی است عاشق را خوشم کہ دست ز جاں شستم و وضو کردم

آتشی در دلِ واسوختہ افتاد سراج باز سیماب ز خاکستر اکسیر چکید

سراج بہت خوش فکر، سنجیدہ مزاج، شگفتہ پیشانی، صاحبدل اور پاکیزہ مشرب بزرگ تھے، آخر عمر میں شعر گوئی ترک کر دی تھی، اور ہمہ تن تزکیۂ باطن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، مگر احباب سے بے تکلف ملتے اور لطفِ صحبت حاصل کرتے تھے، مولٰنا غلام علی آزاد سے زیادہ رسم تھی

ایک دیوان فارسی کا، ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار شعر ہیں، ایک منتخب فارسی شعراء کے دیوانوں کا ۱۱۶۱ھ میں تیار کیا تھا، اس کا تاریخی نام منتخب دیوانہا ہے، ایک مثنوی ۱۱۶۳ھ میں لکھی تھی جس میں گل و بلبل کے افسانے میں جذباتِ معرفت کی ترجمانی کی ہے،

ان کے شاگردوں میں خواجہ ابوالبرکات عشرت، خواجہ عنایت اللہ فتوت، اشرف علی خاں فغاں، مرزا محمد جان نثار، مرزا عطا ضیا، تخلص، جگشن داس بیجان بہت خوشگو شاعر ہیں

۴ شوال روز جمعہ ۱۱۷۷ھ میں وفات پائی، میر غلام علی آزادؔ، میر اولاد محمد ذکاؔ، اور لچھمی نراین شفیقؔ نے تاریخیں لکھیں، میر اولاد محمد کی تاریخ نقل کرتا ہوں،

چراغ دودۂ آلِ عبا سراج الدین
کہ بود روشن ازو محفلِ سخندانی
نمود چارم شوال و صبحِ آدینہ
بہ شمع انجمنِ عمر دامن افشانی
ز تیرہ بزمِ جہانِ فنا بہ دارِ بقا
فروغ ناصیۂ خویش کرد ارزانی
کشید شعلۂ تاریخ سر ز طبعِ ذکاؔ
سراجِ بزمِ ارم را نمودہ نورانی

کلام کا رنگ ملاحظہ ہو،

ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشم مست میں
شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

شکر للہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا
شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

آہ سوزاں سے مرے دامنِ صحرا میں سراجؔ
قبرِ مجنوں پہ چراغاں ہوا تھا سو ہوا

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں
کہاں سراجؔ کہاں آفتابِ عالمتاب

نہیں حقیقت میں حسن و عشق جدا
طوقِ قمری ہے طرۂ شمشاد

ہائے رہ گئی دل میں دامنگیریوں کی آرزو
سبزۂ تربت ہرا ہے پنجۂ گیرا ہنوز

عجب وہ سروِ گلزار ادا خوش قد ہوا واقع
پر بلبلِ نہالِ گل کو دستِ رد ہوا واقع

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں
لوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

مجھ نگینِ داغِ دل پر نقش ہے حرفِ وفا
عشق کی امت میں ہوں مہرِ نبوت کی قسم

نہ پوچھو خود بخود ذکر تا ہوں تعریف اسکی قامت کی
کہ یہ مضمون مجھکو عالمِ بالا سے آتے ہیں

یاد رکھ اے دلِ خوں گشتہ کہ جوں تکمۂ لعل
جامۂ سیوکے گریباں کا گلوگیر نہ ہو

مدت سے گم ہوا دلِ بیگانۂ سراج
شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

تم پہ فدا ہیں سارے حسن و جمال والے
کیا خط و خال والے کیا صاف گال والے

بہار ساقی ہے بزمِ گلشن میں مطربانِ چمن شرابی
پیالہ گل، سرو شیشہ، شراب بو اور گل گلابی

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی
شہِ بیخودی نے عطا کیا، مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرو کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں — کہ شرابِ حسرت و آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا — کہ کتابِ عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وُہ دھری رہی
ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اسقدر سیں یہاں ہوا — کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بینوائے سراج کو
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا جو رہی سو بے خطری رہی

مرزا داؤد داؤد

مرزا داؤد نام، داؤد تخلص، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پائی، اس زمانہ میں اورنگ آباد فضل و کمال کا گہوارہ تھا، علما و شعرا کی صحبت میں داؤد نے علمی استعداد ایسی پیدا کر لی تھی کہ شعر و سخن کی ضرورتوں سے پورے طور پر آگاہ ہو گئے تھے،

یہ معلوم نہیں کہ وہ کس کے شاگرد تھے، میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے، "شاگرد سید" خدا جانے سید سے مراد سید حمزہ ہیں، یا سید عبدالولی عزلت،

عزلت نے اورنگ آباد میں مستقل بود و باش جس زمانہ میں اختیار کی ہے، اس سے بہت پہلے داؤد کی شاعری زوروں پر تھی، اس لئے عزلت کی شاگردی قیاس میں نہیں آتی،

آصفی نے لکھا ہے کہ یہ ولی کا تتبع کرتے تھے، خود بھی جا بجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کو سنکر — تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

کم و بیش پانسو شعروں کا ان کا دیوان ہے، ۱۱۶۸ھ میں وفات پائی، لچھمی نراین شفیق نے تاریخ کہی ؎

بلبلِ گلزارِ معنی، طوطیِ رنگیں زباں — از غمِ آبادِ جہاں بگذشت چوں تیر از کماں
مصرعِ تاریخ فوتش گفت با من ہاتفے — گو برفتہ میرزا داؤد فانی از جہاں

داؤد کے کلام کا انتخاب،

عزیزاں خواب میں دیکھا ہوں آج اُس سروِ قامت کو   ہوا معلوم وقت آیا ہی میری سرفرازی کا

قانونِ شفا نطق میں ہے یار کے موجود   اے دل نہ ہو محتاج طبیبانِ دوا کا

ہوا ہے ابرِ گریاں دیکھ میری چشمِ گریاں کو   پڑا ہے شور دریا میں مرے اس اشکِ جاری کا

مجھ بزم میں رقیب عبث سرکشی نہ کر   شعلہ پڑا ہے شمع پہ مجھ سوزِ آہ کا

اُس صنم کے خیالِ ابرو نے   ناتواں مجکو جوں ہلال کیا

دستِ رنگیں کو دیکھ کر تیرے   رنگِ مہدی چھپا ہی پاتوں پات

کہتے ہیں عاشقاں مرا حال دیکھکر   شاید تو دل دیا ہی کسی بیوفا کے ہات

مجھ برسوں بوسے وے اگر آوے عجب نہیں   اُس چشمِ پرخمار کو دیکھا ہوں خواب میں

تیمم اُن کا اوروں کے وضو کرنے سے افضل ہے   کیا ہے جن نے حاصل خاکساری کی عبادت کو

مرا احوال چشم یار سے پوچھ　　حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

مرے حالِ پریشاں کی حقیقت　　صنم کی زلف کے ہر تار سے پوچھ

آئے زاہدان اٹھاؤ اجبیں کو زمیں سے　　جو سرنوشت ہے اُسے کاں تک مٹاؤ گے

میر عبد الولی عزلتؔ

نسبتے تمام بہ سخن دارند از اسالیبِ کلامِ شاں واضح می گردد کہ بہرۂ بسیارے از دردمندی دارند، اھ (نکات الشعراء)

میر عبد الولی نام، عزلتؔ تخلص، سید سعد اللہ سلونی کے بیٹے، وہ شاہ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، سلون ضلع رائے بریلی میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، شاہی زمانہ میں صوبہ الہ آباد میں شامل تھا، اب اودھ میں اس کا شمار ہے،

سید سعد اللہ علوم و فنون میں فاضلِ یگانہ اور علامۂ وقت تھے، سفرِ حج سے واپس ہوتے وقت سورت میں بود و باش اختیار کر لی تھی، میر عبد الولی کا نشو و نما سورت میں ہوا، اپنے والد سے علوم و فنون کی تعلیم پائی، اور مدتوں درس دیتے رہے، طبیعت میں تیزی و چالاکی خداداد تھی، اول فارسی میں شعر کہنے کا شوق ہوا، اس کے بعد ریختہ پر طبیعت مائل ہوئی، اور اس میں ایسی ترقی کی کہ استاد سمجھے جانے لگے،

بھاشا میں بھی فکر کرتے تھے، دوہے، کبت، جھولنے، سوال و جواب، بارہ ماسے، مکرنیاں، پہیلیاں، سبھی چیزوں میں طبع آزمائی کی، اور ہر ایک چیز کو سلیقہ سے کہا، موسیقی کا شوق ہوا تو زیر و بم اور تال و سر میں مہارت پیدا کی، ساز و قانون و سرود وغیرہ میں

سب سے آگے نکل گئے، اور اس زمانہ کے اچھے اچھے گوّیّے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے،

مصوری میں وہ کمال دکھایا اور رنگ و روغن میں ایسی صفائی پیدا کی کہ اس فن کے مبصر اُن کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھکر محوِ حیرت ہو جاتے تھے،

غرضکہ جامعیّت اور ہمہ دانی میں اپنے بہت سے ہمعصروں سے ممتاز تھے، اسی وجہ سے جہاں جاتے قدرشناس اُن کی عزت کرتے تھے،

سنہ ۱۱۶۴ھ میں دلّی آئے، سراج الدین علی خاں آرزو کا زمانہ تھا، اُن سے ملے اور عرصہ تک دلّی میں رہے، میر محمد تقی میر سے زیادہ رسم ہوگئی تھی، میر صاحب نے نکات الشعرا میں شعرائے دکن کا کلام انہی کی بیاض سے نقل کیا ہے، اور ان کا ذکر خوبی سے کیا ہے،

دلّی سے مرشدآباد گئے۔ نواب مہابت جنگ علی وردی خاں کا زمانہ تھا، نواب تپاک سے ملے، اور جب تک زندہ رہے، ان کی عزت کرتے رہے،

نواب کے مرنے کے بعد دکن گئے، اور اورنگ آباد میں بود و باش اختیار کی، نواب ناصر جنگ نظام الدولہ بہادر کا زمانہ تھا، انھوں نے تنخواہ مقرر کر دی، ان کی شہادت کے بعد حیدرآباد گئے، نواب صلابت جنگ آصف الدولہ بہادر نے دو گانوں جاگیر میں عنایت فرمائے، غرضکہ جب تک جیتے رہے فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے،

میر غلام علی آزاد، میر اولاد محمد ذکا، مرزا علی نقی خاں ایجاد، عبدالقادر سامی اور لچھمی نراین شفیق سے صحبتیں گرم رہتی تھیں،

۱۲ رجب سنہ ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی، حیدرآباد میر مومن کے دائرے میں مدفون ہوئے

جلایا مصحفِ دل تو نے کیوں برقِ تغافل سے
جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں
اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیگا

اس کو پہونچی خبر کہ مرتا ہوں
کسی دشمن سے سنا ہوگا

عزلت گمان یوں تھا کہ جل کر ہوا ہے راکھ
پھر دود آہ دل میں مرا دیدہ تر کیا

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا
سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

جس خوش نگہ کو بیچوں غفلت کی نیند لیوے
میں خفتہ بخت شب کا افسانہ ہو رہا ہوں

تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں
تجھ آنکھوں کے ساغر کا میخوار میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم
کہ آنکھوں سے تیرا خریدار میں ہوں

صحیح اپنا مرض الفت کا جب میں عرض کرتا ہوں
جلے دل کی تشفی کو مجھے آنکھیں دکھاتا ہے

چینِ ابروے سجن میں مرا دل الجھا ہے
دل کھلے گر کبھی دونوں میں گرہ پڑ جائے

سدھارے گل کہاں سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے
گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنا

دیکھ مت رنگیں چمن کو دل مرا غمناک ہے
گل کے ہاتھوں خونِ بلبل کا گریباں چاک ہے

خاطرِ یاراں میں ہے ہم خاکساروں کا غبار
صاف ہے شکوہ دلوں میں کیا محبت خاک ہے

اے بلبل اتنی رو کے دعا ہر سحر تو مانگ
حق تیری آہِ سرد چمن کی صبا کرے،

عارف الدّین خاں[1] عاجزؔ

عارف الدّین نام، عاجزؔ تخلص تھا، باپ دادا بلخ کے باشندے تھے، عالمگیر مرحوم کے عہدِ دولت میں ان کے والد ہندوستان آئے، نواب فیروز جنگ کی عنایت سے شاہی منصب حاصل ہوا،

عاجزؔ ہندوستان میں پیدا ہوئے، بہت چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، مگر خدا کے فضل نے دستگیری کی، نواب لشکر خاں (رکن الدولہ نصیر جنگ) نے ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا، اُن کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی، اور انہی کے ساتھ اورنگ آباد آکر نواب آصفجاہ اوّل کی سرکار میں منصب و خطاب سے سرفراز ہوئے،

منصب زیادہ نہیں تھا، مگر مزاج میں قناعت تھی اور نواب لشکر خاں نے رسالہ کی بخشی گیری کو منصب کا ضمیمہ کر دیا تھا، اس لئے اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے، مزاج میں ظرافت اور شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا، اورنگ آباد پہنچ کر شوق بڑھ گیا،

---

[1] دہ دوازدہ سال باشد کہ در شاہجہان آباد تشریف داشت، بندہ شور او شنیدہ بودم از چندیں بسمت دکن رفتہ، اکنوں از زبان بیسند کو بوضوح می پیوندد کہ در برہان پور است (از نکات الشعراء)

فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے کرتے دونوں زبانوں میں بہت اچھا شعر کہنے لگے،

تاریخ کہنے میں بھی سلیقہ تھا، ایک روز مرزا افضل قاقشال مؤلف تحفۃ الشعرا کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ مکان نیا بن کر تیار ہوا تھا، افضل نے کہا کہ آپ کو تاریخ گوئی میں دعویٰ ہے، اس مکان کی فی البدیہہ تاریخ کہیے، کہا کہ آپ کیا دیں گے، انھوں نے کہا جو کچھ کہیے حاضر ہے، تھوڑی دیر نہیں گذری تھی کہ یہ تاریخ کہہ کر سنا دی، ؎

منزلِ عیش بہ از چار محل　　کرد بنیاد چو مرزا افضل
گفت تاریخ بنائش ہاتف　　منزلِ جاہ و مکانِ افضل

کبر سنی میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے، نواب موسوی خاں سے کہلا بھیجا کہ میں مرتا ہوں تاریخ کی فکر کیجیے، انھوں نے جواب دیا کہ تاریخ گوئی میں خود آپ کو مہارت ہے، آپ ہی تکلیف کیجیے، یہ سنکر مسکرائے اور اپنے نام و تخلص کے اعداد جمع کیے، ایک عدد بڑھتا تھا، فرمایا کہ کاش ایک سال کی مہلت اور مل جاتی تو نام کا نام اور تاریخ کی تاریخ ہو جاتی، خدا کی قدرت دیکھو دو چار روز کے بعد اچھے ہو گئے،

اچھے ہو کر کسی ضرورت سے ناندیڑ گئے، وہاں چند روز رہے تھے کہ وعدہ پورا ہو گیا، اور ناندیڑ میں مدفون ہوئے، میر اولاد محمد ذکا کو توارد ہوا، انھوں نے "عارف الدین خاں عاجز" تاریخ وفات نکالی جس سے سنہ ۱۱۶۸ھ نکلتے ہیں، یہی سنہ ان کی وفات کا ہے،

ایک دیوان فارسی میں، ایک اردو میں یادگار چھوڑا، ایک مثنوی لکھی ہے جس میں لال و گوہر کا قصہ نظم کیا ہے، ایہام اور ذو معنیین کا شوق تھا، مگر مثنوی بہت صاف و سادہ ہے، چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں،

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی　　عطا کر مجھکو یاقوتِ بیانی

سخن کے در کا مجھکو جوہری کر   سخن سنجوں کو میرا مشتری کر
سخن کا لال دے میری زباں کو   دُرِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

جنوں کے دشت کا بنکر بگولا   خرد کی راہ کو وحشت سے بھولا
سحر سے شام تک مانندِ خورشید   طلب کے فرق پر رکھ پاے مالید
غزالوں کی طرح سرگرمِ رم تھا   بیاباں اس کو گلزارِ ارم تھا
برس دو جب چلا جب راہ میں آہ   نظر میں اس کے آیا دشتِ جانکاہ
کروں اس دشت کی کیونکر صفت کو   زباں پر کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار   اجل کا کھیت تھا وہ دشتِ خونخوار
بیابانِ عدم کے تھا برابر   وہاں تھا جانِ عزرائیل کو ڈر
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی   وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی گرد تھی پانوں کی دارو   وہاں کی خاک تھی دوزخ کی بالو

غزلوں کے منتخب اشعار

دیکھکر دامنگیر محشر میں ترے ہوئینگے ہم   خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ لے قاتل چھڑا

عاجز ہوں شاہِ ملکِ جنوں میرے واسطے   سورج کلاہ و چترِ فلک ہے زمیں ہے تخت

ہے ہمارے بت کا دل پتھر کے چیرے کی طرح   کیا کروں اسکی صفت ہے سخت ہیرے کی طرح

ہر سحر کیا دیکھتی ہو آرسی اے سادہ رو   ہے تمہارے حسن کی دفتر کی دونوں صاف فرد

جب سے اے رنگیں ادا تیرا ہے رنگِ گل میں نقش   تب سے میری آہ کا ہے سینۂ بلبل میں نقش

عاجز بھی شمع آہ جلاتا ہے باغ میں   روشن اگر گلوں سے ہوا ہے چراغِ باغ

باغ میں اُس لالہ رو کے آہ جب جاتے ہیں ہم   دل کے داغوں کو گلوں کے تازہ کر آتے ہیں ہم
عشق سے خوش قامتوں کی سبز پوشی کر پسند   سرو کے بوٹے قبا پر اپنی چھپواتے ہیں ہم

خوش نگہ کی یاد میں ساغر کو جب گرداں کروں   بے تکلف گردنِ مینا کو نرگس واں کروں
اُس حنائی ہاتھ کی تعریف خونِ دل سے لکھ   ریشۂ نخلِ قلم کو پنجۂ مژگاں کروں

چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے   گلوں سے رنگ اُڑ کر لال سا جنگل کو جاتا ہے
ہمارا اشکِ خونیں یاد میں گلرو کے بہ بہ کر   نگہ کو رشتۂ تسبیحِ یاقوتی بناتا ہے

تیسرا دور

متقدمین شعرائے اردو کا

شاہ مبارک آبرو

شاعر نادرہ گوے ریختہ، می گویند کہ طبعی شوخی داشت، غرض مستغنیِ وقتِ خود بود کہ عہدِ محمد شاہ باشد (از نکات الشعرا)

نبیرۂ حضرت محمد غوث گوالیاری نور اللہ مرقدہٗ از ابتدائے جوانی مشقِ سخن می کرد شاعرِ خوش گو در وقت خود بود (از تذکرۂ میر حسن)

آبرو تخلص، نجم الدین نام، شاہ مبارک لقب تھا، اور اسی لقب سے مشہور تھے حضرت محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں اور سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار، باوجودیکہ بڑے شاعر اور کہنہ مشق تھے، مگر خان آرزو کو اپنا کلام ہمیشہ دکھاتے رہے،

علمی استعداد کا حال معلوم نہیں، کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے، اُن سے بے بہرہ نہ تھے عنفوانِ شباب میں یہ دلّی آگئے تھے اور ساری عمر یہیں بسر کر دی،

ایک آنکھ ان کی جاتی رہی تھی، مگر جو کمال اُن کو خدا نے عنایت فرمایا تھا، اُس نے اس عیب کی پردہ پوشی کر دی تھی، ابنائے وطن نے دل کھول کر ان کی قدر دانی کی، اور حق یہ ہے کہ دلّی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز انہی سے ہوا ہے،

طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی، اس زمانہ کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام اچھا ہوا ہے، مگر محاورہ دن کی چاشنی نے اس کو بامزہ کر دیا ہے، دیوان انکا غدر میں ضائع ہو گیا، ایک مختصر دیوان اب بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے، شاید اسی کا انتخاب ہو،

کلام ملاحظہ ہو،

آیا ہی صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا
کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگِ زرد
سونا وہ ہے جو ہووے کسوٹی کسا ہوا
اندازہ سے زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
جو خال اپنی حد سے بڑھا سو مسا ہوا

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے
کہ اُس ظالم کی جو ہم پہ گھڑی گذری سو جگ بیتا

یہ سبزہ، یہ آبِ رواں اور ابر یہ گہرا
دیوانہ نہیں گھر میں رہوں چھوڑ کے صحرا

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اُس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

دل تو دیکھیو آدمِ بے باک کا
عشق سے پتلا بھرا ہے خاک کا

کچھ بھڑتی نہیں کہ کیا ہوئے گی
اس دلِ بے قرار کی صورت

نہ تھا کچھ اور میرے شوق کا حُسنِ صفا باعث
یہی پیاری طرح موجب، یہی کافر ادا باعث

مجلسِ رنداں میں مت لیجا دلِ بے شوق کو
شیشۂ خالی کی کیا عزت ہی میخواروں کے بیچ

جلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے کے رشک سے
ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گل

نکلے تم آ صبا کی طرح جب چمن میں بھول
گلشن کے دیکھ تجکو گئے ہاتھ پانوں پھول

حسن ہی پہ خوبرویوں میں وفا کی خو نہیں
پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

کریں جو بندگی ہو ویں گنہگار
بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد
روح پتھر سے سر ٹپکتی ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وہ ہائے عاشقی کے زمانے کدھر گئے

ٹک چلنا سجن کا بھولتا اب تک نہیں مجکوں
طرح وہ پانوں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے

شیخ شرف الدین مضمون

حریف ظریف ہشاش بشاش ہنگامہ گرم کنِ مجلسہا، ہرچند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ، دیوانش بہ ہمہ جہت دو صد بیت خواہد بود" (از نکات الشعراء)

شیخ شرف الدین مضمون جاج مئو صوبہ اکبرآباد کے رہنے والے حضرت شیخ فرید الدین مسعود اجودھنیؒ کی اولاد میں تھے، عنفوانِ شباب میں دلّی گئے، اور زینۃ المساجد میں قیام کیا، اُس زمانہ میں جیسا دستور تھا کہ اکثر شریف زادے پڑھنے کو باہر نکل جاتے تھے، یہ دلّی ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے، اور مر کر بھی نہ نکلے،

ساری عمر زینۃ المساجد میں بسر کر دی، سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے، نزلہ سے اُن کے دانت گر گئے تھے، اس لئے خان آرزو ان کو شاعرِ بے دانہ کہتے تھے،

مرزا رفیع سودا اُن کے حق میں فرماتے ہیں،

بنائیں اُٹھ گئیں یارو! غزل کے خوب کہنے کی   گیا مضمون دنیا سے رہا سودا دیوانہ

مضمون کا کلام ملاحظہ ہو:-

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا   صبر ایوبؑ کیا گریۂ یعقوبؑ کیا

افسوں ہیں یار جھٹ پٹ لیتے ہیں دل کو اٹکا   کن ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا
چھپ کر لحافوں سے اس طرح آ پلنگ پر   کوئی سنے نہ پیارے تیرے قدم کا کھٹکا

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج   ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج

نہیں ہیں ہونٹھ تیرے پان سے سرخ   ہوا ہے خون میرا آ کے لبریز

تیرِ مژگاں برستے ہیں مجھ پر   آپ پیکار کا اس طرف ہو ڈھال

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اُسے جدا کر کے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

میر محمد شاکر ناجی

"مردے ظریف طبع بود، اکثر از لطائف و ظرائف مردماں را بہ خندہ می آورد و خود نمی خندید مگر تبسمے می کرد، متوطن شاہجہاں آباد بود، تلاش صنعت ایہام بسیار داشت۔" (از تذکرہ میر حسن)

سید محمد شاکر ناجی عمدۃ الملک امیر خاں[1] محمد شاہی کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے، تیز مزاج، شوخ طبع، راہ چلتے سے اُلجھتے، اور جس کے گرد ہوتے اُسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا

---

[1] عمدۃ الملک نواب امیر خاں محمد شاہی عمدۃ الملک نواب امیر خاں عالمگیری کے بیٹے تھے، امیر خاں عالمگیری نواب علی مردان کے داماد اور میر میران شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد میں تھے، ان کے ایک بھائی روح اللہ خاں عالمگیر بادشاہ مرحوم کے مصاحب خاص تھے، امیر خاں محمد شاہی کا نام سید اسحٰق، والد کا نام میر میراں تھا، ان کے والد عالمگیر مرحوم کے زمانہ میں بائیس برس کابل کے صوبہ دار رہے اور وہیں وفات پائی، انھوں نے خود ترقی کرتے کرتے محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بخشی گیری کے کام تک ترقی کی اور اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بادشاہ سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ بادشاہ کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا، سنہ ۱۱۵۲ھ میں محمد شاہ بادشاہ کی کچھ آنکھیں کھلیں تو آصفجاہ اول نظام الملک میر قمر الدین خاں بہادر یاد آئے، ان کا آنا اس بات پر موقوف تھا کہ نواب امیر خاں دربار سے دور رہیں، چار و ناچار بادشاہ نے

میر صاحب فرماتے ہیں "مزاجش بیشتر مائل بہ ہزل بود، بندہ با او یک دو ملاقات کردہ بودم، ہزلِ خود می خواند و مردماں را بخندہ می آورد" افسوس ہے کہ میر شاکر ناجی کا نوجوانی میں انتقال ہو گیا، طبیعت ان کی شعر و سخن سے بہت مناسب تھی، اگر عمر طبعی کو پہنچتے تو تبدیلی مزاج کے ساتھ کلام کی گرمی بہت بڑھ جاتی،

نہ پوچھو خود بخود ہے عارضِ خورشید کی خوبی   ہویدا ہے ذرہ ذرہ حسن مہرویاں سے کر پیدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱) ان کو الہ آباد کی صوبہ داری دے کر رخصت کر دیا، مگر جب آصفجاہ واپس گئے تو پھر امیر خاں دلی آگئے، اُن کی طبیعت نہایت بذلہ سنج و لطیفہ گو واقع ہوئی تھی، وقت پر ان کو ایسی سوجھتی تھی کہ دوسروں کو پہروں کاوش کرنے سے وہ مضمون ہاتھ نہ آتا تھا،

یہ شاعر بھی تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اور انجام تخلص تھا، افسوس ہے کہ سنہ ۱۱۵۶ھ میں ایک سنگدل نے ایوانِ شاہی میں ان کو قتل کر دیا،

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم   پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم
کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر   کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم   مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ تمکنت   شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

میں بلا لائے بھیڑ میں یہ مجھ سے نادانی ہوئی   دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی
نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے   کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہرگز رفو   سوزنِ تقدیر بھی گو سو برس سیتی رہے

مجکو باتوں میں لگا کیا جانئے کیا کہہ گیا   لے چلا جب دل تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم   لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

اغنیا کے در بدر مقدور جب تک ہو نہ جا   سخت حاجت ہو تو جا لاچارگی ہے جا ضرور

انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی   جنھوں کی آن پہنچے لڑ موے وہ ایک چھلے پر

نرگس کے تئیں میں ہرگز لاتا نہیں نظر میں   دیکھی ہیں میں نے آخر پیاری تمہاری آنکھیں

نہ سیر باغ، نہ ملنا نہ میٹھی باتیں ہیں   یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

عید ہوتی جو کوئی افطار کرتا جس کے گھر   اب بتاویں سٹے کا روزہ دیکھ کر مہمان کو
آج تو ناحق بھی سے کرلے اپنا عرض حال   مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہونی ہو سو ہو

نادر شاہ کی چڑھائی کے وقت موجود تھے، اس وقت دربار دہلی کا رنگ، شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور ہندوستانیوں کی آرام طلبی و نازپروری کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے، آزاد کو صرف دو بند یاد آئے ہیں، انہی کو ضیافت طبع سمجھو،

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے   دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے   نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے

گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلا کی تال
قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانہ تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا ملے تھے وہاں جو لشکر تمام چھاٹا تھا
نہ ظرف و مطبخ و مکاں نہ غلہ و بقال

مصطفےٰ خاں یکرنگ

"شاعر ریختہ، معاصر میاں آرزو، می گویند کہ بسیار چپیاں اختلاط و آشنائے درست بود" (از نکات الشعرا)

کہن سال اور کہنہ مشق تھے، مگر باوجود اس کے حضرت مرزا مظہر رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا کلام دکھاتے اور اُن سے مشورۂ سخن کرتے تھے، مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک قول کے موافق وہ خانِ آرزو کے اور ایک قول کی بنا پر شاہ مبارک آرزو کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں مگر خود اُن کے فحوائے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے شاگرد تھے،

آزاد کہتے ہیں بزرگوں سے سنا اور تذکروں میں بھی دیکھا، بڑے مشتاق تھے، اور اپنے وقت میں سب انھیں خوش فکر و باکمال مانتے تھے، اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالمِ آشنائی میں بھی یکرنگ یکتا تھے،

اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن جب سے تیرا وہ دوستدار ہوا

سنتا نہیں ہے بات کسی کی تو اے سجن
تجکو ترا غرور نہ جانوں کریگا کیا

کم نہیں کچھ بوئے گل سینی فغانِ عندلیب
برگِ گل سے ہیگی نازک تر زبانِ عندلیب

سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

پھر گیا ہائے ہم سے وہ ہمدرد
سرد مہری سہی ہوا کی طرح

کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن
گر غیر سے ملوگے تو دیکھوگے ہم نہیں

ہرگز تم اب کسو کے سخن آشنا نہیں
سب خوبیاں ہیں تم میں پر اک وفا نہیں
یکرنگت نے تلاش کیا ہے بہت ولے
مظہر سا اس جہان میں کوئی میرزا نہیں

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے
گر خبر لینی ہے تو اے صیّاد
ہاتھ سے شکار جاتا ہے

کیا جانیے کہ وصل ترا کس کے ہو نصیب
ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

محمد حسین کلیم

،، اگرچہ کلیم در فارسی گذشتہ است ،، اما کلیم ریختہ بیش فقیرا نیست ، قطع نظر بندہ ملا

بخدمت او قرابت قریبہ است یک اخلاص تہ دلی دارم و اکثر بہ حالِ ایں ہیچمداں شفقت می فرماید“ (از نکات الشعرا)

در فنِ شعر و شاعری استادِ سخن بحرِ زخار طبعش در نثر و نظم موجزن، رسالۂ در عروض و قافیہ ہندی تصنیف فرمودہ و فصوص را کہ کتاب عربی است بہ زبانِ ریختہ ترجمہ کردہ کتابے در نثرِ ہندی نیز ایجاد نمودہ“ (از تذکرۂ میر حسن)

میر محمد حسین کلیم دلّی کے رہنے والے تھے نظم و نثر دونوں میں ان کو قدرت تھی، میر محمد تقی میر اُن سے قرابت قریبہ رکھتے تھے[1]

میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فصوص کا اُنھوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے، فصوص الحکم شیخ محی الدین بن عربی کی حقائق و معارف میں بڑی دقیق اور مشکل کتاب ہے جس کا سمجھنا معمولی مولویوں کے بس کی بات نہیں، انھوں نے اردو میں اُس کا ترجمہ کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ علوم عربیہ میں مہارت کے ساتھ حقائق و معارف میں بھی بہت بلند پایہ شخص تھے،

عروض و قافیہ میں بھی ایک رسالہ لکھا ہے، غالباً ہندی عروض و قافیہ کا یہ پہلا رسالہ ہوگا، اسی طرح اردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھی ہے، اس کی نسبت میر حسن کہتے ہیں کہ ”در ہندی نثر کتابے نیز ایجاد کردہ“ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اُن سے پہلے کسی نے نثر اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی، مگر یہ صحیح نہیں، مقدمہ میں میں نے بیان کیا ہے کہ فضلی نے دہ مجلس ۱۱۴۵ھ میں لکھی تھی، اُن کی کتاب کا سنہ تصنیف معلوم نہیں، مگر یقیناً احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا کئے جانیکے بعد لکھی گئی ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل فقرہ سے معلوم ہوتا ہے جس کو میر حسن نے نقل کیا ہے،

کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر
ایسی دولت سے زینہار فاعتبروا یا اولی الابصار

میر حسن کی رائے ہے کہ ان کے کلام میں نمک نہیں تھا، اسی وجہ سے اس کو شرفِ قبول حاصل نہیں ہوا، میر محمد تقی میر فرماتے ہیں کہ میرزا عبد القادر بیدل کی روش پر شعر کہتے تھے، اسی وجہ سے ان کے تہ دار شعر سمجھنے سے لوگ عاجز رہتے، وہ اپنے طرز کے آپ مالک ہیں، اُن کے قصیدوں، غزلوں، رباعیوں اور مخمس کا رنگ کسی کے رنگ سے ملتا نہ تھا،

صاحبِ دیوان تھے، مگر افسوس ہے کہ ان کا دیوان نظر سے نہیں گذرا، تذکروں میں ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار درج ہیں، ان کو پڑھ کر اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا،

سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ ایسے بڑے فاضل شخص کے حالات اب تک نہ تذکرۂ مشایخ میں ملے نہ اور کسی کتاب میں معلوم نہیں کہ کس خاندان میں پیدا ہوئے، کب پیدا ہوئے، کس سے تعلیم پائی، کس کی صحبت میں حقائق و معارف کا چسکا پڑا، کس سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور کس سنہ میں وفات پائی،

حقیقت یہ ہے کہ دلی عجب مردم خیز جگہ تھی، جہاں سے ایسے بڑے بڑے محدث، فقیہ، صوفی اور شاعر اُٹھے کہ جس زمانہ میں آج کا ایسا قحط الرجال نہیں تھا اس وقت دوسری جگہ ان کا نظیر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل سکتا تھا،

کلیم کا کلام ملاحظہ ہو۔

کس پریشانی نے قدم رکھا ہے پیچ و تاب سے
جادہ آتا ہے نظر جوں زلفِ کج برہم ہوا

عمر رفتہ کا نہ پایا کھوج ہرگز اے کلیم
آپ کو جوں شمع میں ہر انجمن میں گم کیا

لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

پاسِ ناموسِ محبت ہی مجھے اُن سے کلیمؔ
باغ میں جاؤں نہ ہرگز بے رضائے عندلیب

رکھتا ہے زلفِ یار کا کوچہ ہزار پیچ
اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ

زلف کو خواب میں دیکھا تھا جنوں سے شب کو
صبح بیدار ہوا پائی گلے میں زنجیر

سو زخم کھا چکا ہی دل اُس پہ جگر جلا
کہتا ہے زخم مجکو ہے اک آرزو ہنوز

ہو گیا حشر، گئی دوزخ و جنت کو خلق
رہ گیا میں ترے کوچہ میں گرفتار ہنوز

ہم ہو گئے ہیں ضعف سے جوں بو بیانِ باغ
پھرتا ہے رنگِ گل کہ ہمارا کرے سُراغ

طریقِ عشق میں مجنوںؔ و کوہکنؔ کو نہ کہہ
ہزاروں ہو گئے غارت سو ایک دو معلوم

درازیِ شبِ ہجرانِ زلفِ یار کلیمؔ
نہ مجھ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

مانندِ سرو ہوں کہ نہ گل ہے نہ بر مجھے
بیکارِ باغ ہوں نہ سزاوارِ باغ ہوں

نے اور طنبور میں یہ سوز تو معلوم اے مطرب
کسی کا دل ہوا ہی شاید اس پردہ میں آنالاں

غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہونچے
غرض تم سُن چکے احوال ہم فریاد کو پہونچے

تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہے برسات
پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے

شاہ ظہور الدّین حاتم

صاحبِ کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمت، معاصر میاں آبرو و دو دیوان ترتیب دادہ یکے بہ زبانِ قدیم بطور ایہام و دوم بہ زبانِ حال ادائیہ، شہرۂ اشعارش بسیار است، اکثر غزلہائے او را نغمہ سرایانِ ہند می خوانند (از تذکرۂ میر حسن)

ظہور الدین نام حاتم تخلص، والد کا نام فتح الدّین تھا، عمدۃ الملک نواب امیر خاں محمد شاہی کی سرکار میں ملازم تھے، اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے،

میر بادل علی شاہ کا تکیہ دلی میں قدم شریف کے پاس رند مشرب لوگوں کا ٹھکانا تھا، یہ بھی وہاں جایا کرتے اور پہر دو پہر دل بہلا کر چلے آتے تھے، کچھ فقیر کی صحبت، کچھ زمانہ کے انقلاب کا پھیر، وہاں آتے جاتے یہ بھی فقرائے آزاد منش میں شامل ہو گئے،

شعر و سخن کا شوق شروع ہی سے تھا، مشقِ سخن کرتے کرتے استاد بن گئے، پہلے رمز تخلص کرتے تھے، پھر حاتم ہو گئے، کلیات ان کا بہت بڑا ہے، جو قصائد، غزلیات، رباعی اور مثنوی پر مشتمل ہے، آخر عمر میں کلیاتِ مذکور سے منتخب کر کے ایک دیوان مرتب کیا، اس کا نام دیوان زادہ رکھا، آزاد کہتے ہیں کہ "وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے"

ولادت ان کی بقول آزاد سنہ ۱۱۱۱ھ میں اور وفات سنہ ۱۲۰۷ھ اور بقول مصحفی سنہ ۱۱۹۶ھ

میں ہوئی ہے، دیوان زادہ عزیز الدین عالمگیر ثانی کے زمانہ میں مرتب کیا ہے، میر محمد تقی میر حسب معمول ان سے سخت ناخوش ہیں نکات الشعرا میں ارشاد فرماتے ہیں:-

"مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع، دیر آشنا غنا نہ دارد، دریافتہ نمی شود کہ ایں گہن بسبب شاعری است کہ ہجو من دیگرے نیست یا وضع او ہمین است"

چونکہ مرزا رفیع حاتم کے شاگرد تھے، اور وہ میر صاحب کے حریف تھے، کیا عجب ہے کہ شاہ حاتم میر صاحب کو خیال میں نہ لاتے ہوں،

آب حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا　　مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند　　جراح زخم عشق کا آکر سیا تو کیا
محتاجگی سوں مجکو نہیں ایک دم فراغ　　حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

زندگی درد سر ہوئی حاتم　　کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی　　کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

ستم سے تیرے میں جاتا ہوں پھر نہ کہیو تو　　کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا

ایک دن ہاتھ لگایا تھا ترے دامن کو　　آج تک سر ہے خجالت سے گریباں کے بیچ

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک　　تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

دلوں کی راہ خطرناک ہوگئی آیا
کہ چند روز سے موقوف ہے سلام پیام

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں
دور ہو پہلو سے صحبت کے مرے قابل نہیں

پیری میں قائمؔ اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

بے مدد زلفوں کے اُس کے حسن نے قیدی کیا
صیدِ دل بے دام کرنا صنعتِ استاد ہے

اے خردمندو مبارک ہو تمھیں فرزانگی
ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

اشرف علی خاں فغاںؔ

"بسیار جوانِ قابل و ہنگامہ آرا، شعرِ ریختہ را بہ خوبی می گوید، و گاہے فکرِ غزل فارسی می کنند، شاگردِ قزلباش خاں امیدؔ مرحوم است" (ماخوذ نکات الشعرا ؔ)

"شعر بہ صفائی می گوید و نسبتِ شاگردی بہ ندیمؔ می رساند: چنانچہ خود گفتہ،

ہر چند اب ندیمؔ کا شاگرد ہے فغاںؔ
دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہو دیگا" (مصحفی)

اشرف علی خاں فغاںؔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے، علی قلی ندیمؔ سے مشقِ سخن کی، آزادؔ نے آبِ حیات میں تذکرہ مصحفی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قزلباش خاں کے شاگرد تھے، میں سمجھتا ہوں کہ آزادؔ نے مصحفی کا تذکرہ نہیں دیکھا،

میر تقی میرؔ نے بھی ان کو قزلباش خاں امیدؔ کا شاگرد لکھا ہے، ممکن ہے کہ پہلے اُن سے

اصلاح لیتے ہوں، پھر ندیم کے شاگرد ہوئے ہوں یا فارسی میں ان کے شاگرد ہوں اور اردو میں ندیم کے، جو کچھ بھی ہو، مصحفی نے ان کو ندیم ہی کا شاگرد بتایا ہے، اس لئے آزاد کا حوالہ غلط ہے،

فغاں شعر و سخن ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے، احمد شاہ نے اسی لئے ان کو "ظریف الملک" کا خطاب دیا تھا، درانیوں کے حملوں نے دلی کیا ہندوستان کو تہ و بالا کر رکھا تھا، یہ پریشان ہو کر اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد چلے گئے، وہاں سے لوٹتے ہوئے فیض آباد ٹھہر گئے، نواب شجاع الدولہ نے اعزاز و اکرام سے لیا، مگر ایک دفعہ جوشِ اختلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا ڈالا، یہ جل کر عظیم آباد چلے گئے، راجہ شتاب رائے نے ان کی قدر دانی کی یہ وہیں رہ پڑے اور باقی عمر خوشحالی سے بسر کر کے ۱۱۸۶ھ میں دنیا سے انتقال کیا،

آزاد کہتے ہیں کہ "ایک دن اختلاط میں نواب کے ہاتھ سے ان کا کپڑا جل گیا، یہ نازک مزاج بہت تھے، رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے"، معلوم نہیں کپڑے جلنے کی روایت کہاں سے لی ہے، مصحفی نے ہاتھ جلنے کا ذکر کیا ہے، اور یہی صحیح ہے،

مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا
ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا

اس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گذر گئی
دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنا نہیں
خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

وابستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے
گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا

کیا تو شبِ فراق میں جیتا رہا فغاں   یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار پر

تا حشر کم نہ ہووے گی ظالم تپشِ دل   کافر ہوں اگر گور میں آرام کروں میں

نے زندگی میں وصل میسّر نہ بعدِ مرگ   عاجز ہوا ہوں اے دلِ ناشاد کیا کروں

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں   لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

صیاد راہ باغ فراموش ہو گئی   کنجِ قفس سے مت مجھے آزاد کیجیو

آخر فغاںؔ وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا   وہ کیا ہوا تپاک وہ الفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھیے تو بہر حال شکر ہے   یوں بھی گذر گئی مری ووں بھی گذر گئی

صنم نامہرباں ہے اس قدر اے میرے رب کیا ہے   مری تقصیر کچھ ثابت نہیں جہ غضب کیا ہے
قدم پر ہاتھ جب رکھتا ہوں یوں کہتا ہے جھنجھلا کر   یہ گستاخی مجھے بھاتی نہیں اے بے ادب کیا ہے

بھر لیجیو دامن میں فغاںؔ لختِ جگر کو   ہم خانہ بدوشوں کا سر انجام یہی ہے

تیرے ہی دل سے پوچھیے اس غم کو ہاں فغاںؔ   اُلفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

حصّہ دوم

طبقۂ متوسطین

دورِ اوّل

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ

و می گویند که اول کسے که طرزِ ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبانِ اردوے معلّی شاہجہان آباد که احوال پسندِ خاطرِ عوام و خواص گردیدہ مروج ساخته زبدة العارفین، قدوة الواصلین، واقفِ رموزِ جنابِ اکبر، کاشفِ کنوزِ طریقهٔ پیغمبر مرزا جانجاناںؒ متخلص به مظہر، مردے است فرشته صفت علوی نسب، ہندی مولد، حنفی مذہب، نقشبندی مشرب۔ از طبقات الشعرا مصنفهٔ مولوی قدرت اللہ صدیقی، تالیف ۱۱۸۸ھ

"در ابتدائے شوقِ شعر که ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصه نیامدہ بود، و دورِ دورِ ایہام گویاں بود، اول کسے که شعرِ ریخته به تتبّعِ فارسی گفته اوست، چوں دراں روز ہا میر عبدالحئی تاباں دوستی از حد داشت چند غزلیات متعددہ از خامهٔ فکرِ ایشاں بر صفحهٔ کاغذ ریخته بود، زکه مشار الیه مانع آمدہ آخر ایشاں را اقرارِ شعر گفتن بر زبانِ فارسی داد، و بعد ازیں بر ریخته زبان نیالودند، اگرچه ہماں قدر که به اصلاح درسه شاگرداں بکار آید، چنانچه تربیتِ انعام اللہ خاں یقین، نسبت به محمد فقیه دردمند که ساقی نامهٔ ایشاں شہرت دارد، متوجه بودند، در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان

استاد جلوۂ ظہوری دید، فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ بہ اعتبار فقیر مرزاست بعدہ متتبعش بہ دیگراں رسیدہ۔" (از تذکرہ مصحفی تالیف سنہ ۱۲۰۹ھ)

لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعراء پہلے گزرے تھے، انھیں پیچھے ہی چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش دیا، جس سے پرانا رستہ ایہام گوئی کا زمین شعر سے مٹ گیا، انکے کلام میں مضامین عاشقانہ عجیب ترتیب دکھاتے ہیں، اور یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے، اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں، انکے اصلی حالی۔" (از آب حیات صفحہ ۱۲)

شمس الدین جانجاناں نام مظہر تخلص، والد کا نام مرزا جان تھا، عالمگیر مرحوم کے دربار میں صاحب منصب تھے، نسب اُن کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے، ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں، دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے، دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں، پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں، ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے، کالا باغ علاقہ مالوہ میں ۱۱ رمضان سنہ ۱۱۱۱ھ کو پیدا ہوئے، عالمگیر مرحوم کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ "پسر جان پدری باشد"، اس کا نام ہم نے جان جان رکھا، کثرت استعمال سے جانجاناں ہو گیا،

اٹھارہ برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے، منصب کے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، مگر توفیق خداوندی نے رہبری کی، اور سعی بے حاصل کو چھوڑ کر مدرسوں اور خانقاہوں کی جاروب کشی شروع کی، شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے جو اس زمانہ میں شیخ المحدثین تھے، باقاعدہ حدیث پڑھی اور تیس برس تک مشایخ نقشبندیہ سے کسب کمال کیا،

خدا نے مرزا صاحب کی طبیعت عجب باغ و بہار بنائی تھی، مشیخت و ارشاد سے اس وقت

بحث نہیں، ان کے اوضاع و اطوار اور ادب و آداب پر غور کرو کتنے سنجیدہ و برجستہ تھے، جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا تھا ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا، لطافتِ مزاج اور سلامتیِ طبع کی نقلیں ایسی ہیں کہ آج سن کر تعجب آتا ہے، خوش تقریر ایسے تھے کہ بات کہتے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے، ان کے کمالاتِ گوناگوں کی وجہ سے ہر ایک کو ان سے ملنے کی تمنا رہتی تھی، میر صاحب نکات الشعراء میں فرماتے ہیں: ”بندہ بخدمت اور رفتہ سعادت اندوز گشتہ است ..... خوش تقریر بہ مرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد“، انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں:

”ازبسکہ آوازۂ فصاحت و بلاغت جناب فیضمآب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمہ گوش راقم را مقر خود می داشت دل با دیدۂ مستعد ستیزہ شد کہ چہرا نہ دیدہ ام مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم می پسندی از دولتِ جاودانی و عیشِ روحانی کہ در کلام معجز نظام آنحضرت است باز میداری“

شیخ علی حزیں ہندوستان میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ایک بار دلی میں لبِ سڑک ایک کوٹھے پر بیٹھے ہوئے تھے، مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ہوا اسی سڑک سے گذرے، شیخ علی حزیں نے دیکھ کر پوچھا ”ایں کدام جوان است“ سامع ایک شاعر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے کہا مرزا جانجاناں، شیخ نے کہا ”چشم بد دور ہمہ دانی و ہمہ جانی“[۵۱]

استغنا اور بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سرِ نیاز خم نہیں کیا، ایک بار محمد شاہ نے نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا ہے، اس میں سے جو کچھ چاہئے قبول فرمائیے، ہنس کر فرمایا، ”قُل مَتَاعُ الدُّنیا قَلِیلٌ“ خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے۔[۵۲]

---

[۵۱] معمولات مظہریہ [۵۲] مقامات مظہریہ،

نواب فیروز جنگ نے خانقاہ، مسجد، کنواں، یومیہ اور گاؤں فقراء کے لیے پیشکش کئے، قبول نہ کئے، اور فرمایا کہ موت قریب آپہونچی ہے، اس کی تدبیر کرنا ضروری ہے، معلوم نہیں کہ شب تک حیات وفا کرے یا نہ کرے[1]،

نواب آصفجاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا، نواب نے کہا کہ لے کر محتاجوں کو بانٹ دیجئے، فرمایا کہ مجکو اس کا سلیقہ نہیں، یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جائیے، گھر تک پہنچتے پہنچتے تقسیم ہو جائیگا، نہ ہو تو وہاں ہو رہے گا[2]،

حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب جس طرح زندگی بسر کرتے تھے، اس کے لئے اس ذکر کو گوارا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، اُنھوں نے زندگی بھر کہیں گھر نہیں بنایا، کسی دوست کے گھر یا کرایہ کے مکان میں رہتے، ایک جوڑے سے زیادہ کپڑا نہ رکھتے، کھانا کسی کے گھر نہ کھاتے نہ پکواتے، وقت کے وقت بازار سے منگوا کر کھا لیتے، عام دعوتوں کو قبول نہ فرماتے، دوسرے مشایخ کی طرح عرس اور فاتحہ نہ کرتے، جس کے لئے روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے[3]

نذر و نیاز کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں کہ مشکل سے پوری ہوتی ہونگی، (۱) یہ کہ پیش کرنے والا شریف و نجیب ہو (۲) دنیاداروں سے اختلاط نہ رکھتا ہو (۳) فی الجملہ صالح و پرہیزگار ہو (۴) حلال و حرام میں تمیز کرنے کا علم رکھتا ہو (۵) ایسے ملک سے تازہ وارد نہ ہو، جہاں لوٹ مار ہوتی ہو (۶) اخلاص و عقیدت سے پیش کرتا ہو[4]،

سچ یہ ہے کہ نازک مزاجی اور مرزائیت کے ساتھ درویشی کا بلند پایہ پر قائم رکھنا ہر کسی کا کام نہیں ہے، مولانا نعیم اللہ نے ٹھیک کہا ہے کہ: "احوال اجتماع اوضاع اکی منتکل بود باوجود مرزائیت و نازک مزاجی کہ بہ اطوار درویشی موافقت نہ دارد بمیزان تقریر نمی سنجد"

---

[1] مقامات مظہریہ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] معمولات مظہریہ،

خود مرزا صاحب نے بھی جا بجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے، ؎

در جنوں ہم میرزائی از دماغِ ما نہ رفت
کہ برائے خویش حمامے ز گلخن داشتیم

بجائے سنگِ طفلاں پارہ ہائے شیشہ باید زد
چو مظہر میرزا دیوانۂ نازک طبیعت را

مظہر ز ما بریدہ دگر یاد ما نہ کرد
دیوانہ خوش نہ بود ز وضعِ کرخت ما

افسوس ہے کہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے، جس میں بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں...... کچھ تو اس اعتقاد سے ع،

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

اور کچھ..... میں روسیاہ، بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں" (انجر ص۱۴۸) تاباںؔ[1] کا حال جیسا چمکا کر لکھا ہے اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح سے بیان کیا ہے وہ بھی ملاحظ طلب ہے، (ص۱۳۶) شعر مندرجہ ذیل ؎ ۱۰ کو پڑھیے، پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو

---

[1] میر عبد الحئی تاباں رضوی سید تھے، دلی میں پیدا ہوئے ایسے حسین و جمیل تھے کہ لوگ انکو یوسف ثانی کہتے تھے، اس حسن و جمال کے ساتھ عشق مزاج بھی تھے، اور شعر و سخن سے ان کو خداداد مناسبت تھی، شاہ حاتم نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں انکو اپنا شاگرد لکھا ہے اور شیفتہ نے گلشن بیخار میں انکو مرزا رفیع سودا کا شاگرد لکھا ہے، مگر خود تاباںؔ کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ میر محمد علی حشمت کے شاگرد تھے، (بقیہ ص۱۲۹ پر)

اور آزاد کی معذرت کو دیکھئے، فرماتے ہیں کہ "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے، مگر کیا کیجئے، ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور طراری کا نمک ہے" (صفحہ ۱۴۱) مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی" (صفحہ ۱۴۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶) میر صاحب نکات الشعراء میں فرماتے ہیں "نسبت بہ شعراء استاد اور ارتبہ شاگردی او نہ بود" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشمت ہی کے شاگرد تھے، ممکن ہے کہ شاہ حاتم سے بھی اصلاح لی ہو، سودا کی شاگردی صحیح معلوم نہیں ہوتی، تاباں مرحوم کو عنفوانِ شباب میں مے گساری کی عادت پڑ گئی تھی اور وہ اتنی بڑھی کہ ان کے لئے بلائے جان ہو گئی، ہر وقت مدہوش رہنے کی وجہ سے دوستوں نے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا، میر صاحب فرماتے ہیں کہ مرنے سے سات آٹھ روز پہلے یکبار گی اسکو چھوڑ دیا، اور اپنے دوستوں کو اس مضمون کے رقعے لکھ بھیجے: "عزیزان من توبہ کردم شما شاہد و خبر گیران من باشید، چرا کہ شراب بسبب کثرتِ استعمال مزاج من شدہ بود، از گذاشتنِ ایں از خود گذشتن من پر نزدیک می نماید، غافل از احوالِ من بودن از عقل بسیار دور است" آخر کار وہی ہوا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے،

میر تقی میر اور میر حسن نے انکے اور مرزا مظہر علیہ الرحمہ کے تعلقات کا کچھ ذکر نہیں کیا، تاہم کچھ شبہہ نہیں کہ تاباں کو مرزا صاحب سے عقیدت تھا اور مرزا صاحب کو ان سے محبت تھی بعضوں نے لکھا ہے کہ مرزا جانجاناں صاحب ان پر عاشق ہو گئے تھے مگر جو شخص پیر و مرید کے تعلقات خصوصاً مرزا صاحب کے انداز اور اطوار و طریقہ سے واقف ہو گا وہ کبھی ان خرافات باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا، جن کو آزاد نے آبحیات میں بیان کیا ہے،

تاباں مرحوم کے چند اشعار،

کس کس طرح کی دل میں گذرتی ہیں حسرتیں ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

ہنستا ہے گل چمن میں، تو نالاں ہے عندلیب دو دل خوشی نہ دیکھے کبھی اس جہاں کے بیچ

کسی واقعہ کی صورت بنانے کا نمونہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ "ایک نواب صاحب انکے خاندان کے مرید تھے، ملاقات کو آئے، اور خود صراحی لیکر پانی پیا، اتفاقاً جو آبخورہ رکھا ٹیڑھا رکھا، مرزا صاحب کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہو سکا، اور بگڑ کر کہا کہ عجب بیوقوف احمق تھا، جس نے تمھیں نواب بنا دیا، آبخورہ بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا ہے" میں پوچھتا ہوں کہ اس میں لطیفہ کیا ہوا، جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس میں بجاے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، مرزا صاحب کی نازک مزاجی نہیں، آتش مزاجی، ضبط و تحمل کی کمی اور بد تہذیبی کی بین مثال ہو سکتا ہے، نواب کے قصور پر بادشاہ کو بیوقوف اور احمق مرزا صاحب کی زبان سے کہلانا کتنی دور از قیاس بات ہے،

واقعہ یہ ہے کہ ایک نواب زادے ملنے کو آئے جن کا تمام خاندان مرزا صاحب سے عقیدت رکھتا تھا، اور خود یہ صاحبزادے مرزا صاحب کے شاگرد تھے، اُن کو پیاس معلوم ہوئی ادھر اُدھر دیکھنے لگے، کوئی آدمی نظر نہیں آیا، مرزا صاحب سمجھ گئے، فرمایا کہ پیاس ہو تو خود اُٹھ کر پی لو، گھڑا اور آبخورہ قرینہ سے ایک طرف کو رکھا ہوا تھا، اُنھوں نے اُٹھ کر پانی پیا اور آبخورہ جو رکھا ٹیڑھا رکھا، گھڑے کو بھی سیدھا نہیں کیا اور آکر بیٹھ کر گئے، اور جوش عقیدت میں آکر عرض کیا کہ بغیر کسی پیش خدمت کے آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی، اگر ارشاد ہو تو دو ایک خدمتگار میں متعین کردوں، مرزا صاحب نے ہنس کر گھڑے کی طرف دیکھا، اور فرمایا کہ تم کو آبخورہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶

انجان ہو تو اس سے کوئی درد دل کہے
جو جانتا ہو، میں اُسے آگاہ کیا کروں

اے باغباں اتو جانتے ہیں ہم قفس میں
چھوٹے تو پھر ملیں گے گر بال و پر رہیں گے
جاتی ہے عمر ہر دم ہم کو خبر نہیں ہے
کیا جانئے کہ کب تک ہم بے خبر رہیں گے

رکھنے کا سلیقہ نہیں تو تمہارے خدمت گار کو کیا ہوگا۔"

اصل یہ ہے کہ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو آبحیات میں ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے جیسا کہ اُن کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ جوش و خروش اور کثرتِ کلام ڈھونڈھتے ہیں جو یہاں نہیں[1] ملتا، اس کا حال مصحفی سے سنو وہ کہتے ہیں: "ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصۂ وجود نیامدہ بود و در ہمہ دور ایہام گویاں بود۔ اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ اوست۔" آگے بڑھ کر کہتے ہیں: "نقاشِ اول زبانِ ریختہ بہ اعتقادِ فقیر مرزا است۔"

مرزا صاحب کا دیوانِ ریختہ کوئی موجود نہیں، یقین کا دیوان اٹھا کر دیکھو اور انصاف کرو۔ مصحفی کہتے ہیں: "در تمام دیوانش فصاحت و بلاغتِ زبانِ استاد جلوۂ ظہور می دہد۔"

مرزا صاحب کا ایک دیوان فارسی ہے، ساٹھ برس کی عمر سنہ ۱۱۷۰ھ میں ۲۰ ہزار شعر میں سے ایک ہزار شعر انتخاب کیے تھے، اسی واسطے اکثر غزلیں ناتمام ہیں، فارسی کلام کے متعلق میر تقی میر کی رائے ہے کہ وہ سلیم و کلیم کے کلام سے کم پایہ نہیں۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں: "دیوانِ مختصرِ فارسی او بہ نظرِ فقیر مؤلف آمدہ است، از سلیم و کلیم پایہ کمی ندارد، اگرچہ شعر گفتن دونِ مرتبۂ اوست، لیکن گاہے متوجہ ایں فنِ بے حاصل می شود۔"

خریطۂ جواہر ایک مختصر انتخاب اساتذۂ فارسی کے اشعار کا ہے کہ اپنے پسند کے موافق لکھتے گئے تھے، وہ حقیقت میں خریطۂ جواہر ہے، اور فارسی دیوان کے ساتھ یہ بھی چھپ گیا ہے۔

---

[1] یہاں تو نہیں مگر میر ضاحک اور میر خلیق کے یہاں کیا مل گیا، میر ضاحک کا ایک شعر اور میر خلیق کے دو شعر ہاتھ آئے مگر ان کے حالات لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو، میر ضاحک کے حالات میں فرماتے ہیں: "ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا...... اب کہ طبعِ ثانی کا موقع ہوا زمانۂ قدیم پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول دلِ افسردہ کے طاق میں پڑے تھے انہی کا سہرا بنا کر ساداتِ عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں۔" (از آبِ حیات ص ۱۶۷)

اردو میں پورا دیوان نہیں، غزلیں اور اشعار ہیں، جو سوداؔ اور میرؔ کی زبان ہے، وہی انکی ہے، شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، خواجہ احسن اللہ خاں بیانؔ، مصطفیٰ خاں یکرنگؔ، بساون لعل بیدارؔ، ہیبت قلی خاں حسرتؔ، محمد فقیہ دردمندؔ، صاحبِ دیوان اور اچھے شاعر ہوئے ہیں،

ساتویں محرم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص آیا، دروازہ بند تھا اُس نے آواز دی، باہر نکلے تو ایک قرابین ماری، وہ تو بھاگ گیا، مگر حضرت کو زخم کاری لگا، تین دن تک استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ زندہ رہے، عالمِ اضطراب میں لوٹتے تھے، اور اپنے ہی اشعار پڑھتے تھے،

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سیلِ خوں از سینۂ گرمم رواں کردست عشق
نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخمِ دل مظہرؔ مبادا بہ شود آگاہ باش
کایں جراحت یادگارِ ناوکِ مژگانِ اوست

بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ قاتل نہیں ملتا پتہ بتائیے تو ہم اسکو سزا دیں، جواب میں فرمایا کہ "فقرا کشتۂ راہِ خدا ہیں، مردہ کا مارنا قتل نہیں، قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں یہاں بھیجدیں" آخر دسویں محرم ۱۱۹۵ھ کی شام کو اہلِ بیت کرام سے جا ملے، میر قمر الدین منتؔ کی تاریخ ہی، جس کا مادہ خاص الفاظ حدیث ہیں، اور اتفاق یہ کہ موزوں ہیں، "عاش حمیداً مات شہیداً" - لوحِ مزار پر خود حضرت کا یہ شعر کندہ ہے، جو بالکل حسب حال ہے اور صحیح پیشین گوئی ہی،

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

چونکہ اردو کلام حضرت کا نایاب ہے، لہذا جس قدر مجکو مل سکا ہے، بغیر انتخاب کے ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتا ہوں،

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بد گماں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجکو جو ہم مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم
کہ دولتخواہ اپنا مظہر اپنا جانِ جاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بیکس افسوس
کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

نہیں کچھ غم کہ کیوں جلتا نہیں پیماں گسل میرا
کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر جلے دل میرا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر
بھلا تھا یا برا تھا ور کچھ تھا خوب کام آیا

زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا
صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہی توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار   ہاے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہی بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور   کیا قیامت ہی موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب   پھر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہی گلشن میں لیک   جی نکل جاتا ہی جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
شاخِ گل ہلتی ہے پر بلبلوں کو باغ میں   ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم   مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں   بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے اکدم وہ چپ رہے   آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

مت اختلاط کر اے نوبہار تو ہم سے   چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر   فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہی   قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

آج مت رنگِ حنا سے کفِ پا لال کرو   اے بتاں اس دلِ پرخون کو پامال کرو

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہی سجن نے بیڑہ پان کو

آتش کہو شرارہ کہو کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
برگ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا
شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہی جب سے مجھ بے نوا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزا ئیے گل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہاتھ چھوڑی تو پنکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کو اپنے تو
یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

تجلی گر تری پست و بلندان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کف پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں ہتھوں کی نیند کیوں جاتی
اگر یہ سردہری تجھکو آسایش نہ سکھلاتی
تو کیونکر آفتاب حسن کی گرمی میں نیند آتی
الٰہی درد و غم کی سر زمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اُس کو دماغ و دل رہا ہے
نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجکو وہ دماغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ اوپر خواب — یہ سر پانوں سے تیرے ہل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل — یہیں تک تھی ہماری زندگانی

مرزا محمد رفیع سوداؔ

جوانے است خوش خلق و خوش خوے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روے، مولداد شاہجہان آباد است، نوکر پیشہ، غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید، سرآمد شعراے ہندی اوست، بسیار خوش گو است ... چنانچہ ملک الشعراے ریختہ او را شاید، (از نکات الشعرا، میر تقی)

در فنون انواع سخنی طاق و بہ جمیع کمالاتِ سخنوری شہرۂ آفاق، در مضمار قصیدہ گوئی گوے سبقت از عرفی و خاقانی ربودہ و در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گذارد، بسیار خوش گو و پرگو است، چند مدت بہ سبب ویرانگی دہلی در بلدۂ فرخ آباد ہمراہ مہربان خاں ماندہ (1)، بہ طرف لکھنؤ رفتہ نوکر شجاع الدولہ بہادر شدہ است۔" (از طبقات الشعرا)

الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بہ وسیلۂ فن شاعری سرفراز است در علم موسیقی نیز ماہر است و تصانیف بسیار در نقیسہ ہم دارد تا حال مثلِ او در ہندوستانِ جنت نشان کسے بر نخاستہ، اکثر فقیر در خدمتِ آں بزرگوار می رسد، بسیار کرم می فرمایند (از تذکرۂ میر حسن)

"زعم بعضے آنکہ سرآمد شعراے فصاحت مرزا محمد رفیع سوداؔ در غزل گوئی بگرد میر تقی،

نہ دیدہ اما حق آن ست کہ ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است"۔ مرزا دریا است بیکران و میر نہرے است عظیم الشان، در معلومات قواعد میر را بر مرزا برتریست و در قوتِ شاعری مرزا را بر میر سروری"۔ (اھ تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں)

"بہ زعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل، اگر گوئی کہ غزل از اشعار پر کن مملو است و قصیدہ از اں خالی زیادہ از یں چہ تواں گفت کہ قباحت ایں تحقیق بر نظارگیاں دیوانش حالی"۔ (اھ گلشن بیخار)

مرزا محمد رفیع سودا کے والد مرزا محمد شفیع میرزایانِ کابل سے تھے، بزرگوں کا پیشہ سپہگری تھا، مرزا محمد شفیع بہ طریق تجارت ہندوستان آئے، ہند کی خاک دامنگیر ہوئی یہیں کے ہو رہے، مرزا رفیع سنہ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے، دلی میں تربیت پائی، اول سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے، طبیعت شعر و سخن کے مناسب تھی، کثرتِ مشق نے اُس میں جلا دیدی، استاد کی زندگی ہی میں ان کی استادی کو خاص و عام نے مان لیا، اور انکی غزلیں گھر گھر ہر ایک کی زبان پر چڑھ گئیں، شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے انکو دینے لگے، اور دلی جیسے شہر میں ان کے فضل و کمال کو سب لوگوں نے مان لیا،

یہ بھی جب تک ہو سکا دلی سے باہر نہیں نکلے، شاہ عالم کا جب کھیل بگڑا، اور بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو بادل ناخواستہ نکلے، فرخ آباد میں نواب احمد خاں غالب جنگ سر حکومت تھے، مہربان خاں رند، ان کا دیوان تھا، وہ خود شاعر اور شاعروں کا قدر دان تھا، اس زمانے میں دلی سے جو نکلتا تھا، اس کی پہلی منزل فرخ آباد ہوتی تھی، یہ بھی براہِ راست فرخ آباد آئے اور مہربان خان کی مہربانی سے چند سال تک اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کی،

سنہ ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا، یہ برداشتہ خاطر ہو کر فیض آباد چلے آئے

اس وقت ان کا سن ساٹھ برس کا ہو چکا تھا، نواب شجاع الدولہ بر سر حکومت تھے، وہ بہت اعزاز سے ملے تھے ان کی تنخواہ مقرر کردی،

شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے، ان کا فیض آباد میں جی نہیں لگا اپنی ماں بہو بیگم[۱] کی روک ٹوک سے گھبرا کر لکھنؤ چلے آئے، اور اس کو مرکز حکومت

---

[۱] بہو بیگم کا اصلی نام امۃ الزہرا بیگم تھا، یہ موتمن الدولہ نواب محمد اسحٰق خاں شوستری کی بیٹی تھیں محمد شاہ بادشاہ نے انکو اپنی بیٹی بنایا تھا، اور شجاع الدولہ کے ساتھ شادی کی تھی، جہیز میں وہ کچھ دیا جو ایک شہزادی کو مل سکتا تھا سسرال سے بہو بیگم اور خاص محل کا خطاب ملا، یہ بڑی فرزانہ اور دانش مند بیگم تھیں، فیاضی اور سیر چشمی میں انکا کوئی نظیر نہیں تھا، جب دلی کی سلطنت بگڑی تو بھائیوں کو بھی سمیٹ لیا، اور باپ بھائی کے ملنے والوں پر کیا موقوف ہے، دلی کا ادنی اور اعلی جو آجاتا، اسکے ساتھ برادرانہ سلوک کرتی تھیں، اُن کے حسن سلوک کی وجہ سے فیض آباد دلی کا ایک محلہ بن گیا تھا، نواب آصف الدولہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے، مگر اُن میں نہ باپ کا سا منچلا پن تھا، نہ ماں کی سی فرزانگی صرف ایک فیاضی ماں سے ترکہ میں ملی تھی، ماں ان کی خفیف حرکتوں سے ناخوش ہوتیں اور روک ٹوک کرتی تھیں، اور ان کو دل کھول کر اپنے ارمانوں کے نکالنے کا موقعہ نہ ملتا تھا، اس وجہ سے شکار کے بہانے فیض آباد سے لکھنؤ آگئے اور پھر یہیں محلسرا میں باغات اور بازار تیار کرا کے رہ پڑے، بہو بیگم کی جاگیر بہت بڑی تھی جو بجائے خود ایک چھوٹی سی ریاست تھی، علاوہ اس کے جواہرات کا ذخیرہ بھی ان کے پاس بہت کچھ تھا، ساری عمر دل کھول کر خرچ کیا، آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں ہمیشہ انکے مرنے اور اس دولت پر قابض ہونے کے متمنی رہے، مگر بہو بیگم ان کو مار کر مریں، اور مرتے مرتے ایک کرور کے روپیے اور کچھ اوپر چھپن لاکھ کا وثیقہ سرکار کمپنی کی تحویل میں دیکر دستاویز کر دیا کہ ان کے اعزہ اور متوسلین کی جو تنخواہیں انھوں نے کر رکھی ہیں، ہمیشہ جاری رہیں، چنانچہ ان لوگوں کی اولاد اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے،

قرار دیا تو مرزا رفیع بھی لکھنؤ آ رہے، اور جب تک جیتے رہے نواب اور اہلِ لکھنؤ کی قدردانی سے فارغ البال رہے۔

آزاد کہتے ہیں کہ ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی سے یا طنز سے کہا مرزا تمھاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے، یہ بپاسِ وضعداری پھر دربار نہ گئے یہ سب افسانہ ہے، شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے، لکھنؤ کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی، یہ بھی غلط ہے کہ دلّی سے براہ راست یہاں آئے، یہ بھی غلط ہے کہ سودا ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے، شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے یہ ان کی ملازمت میں رہے ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں، مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت نواب مرحوم مغفور نیز بودن او را در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند"

آزاد نے دلّی کے قدر دانوں میں بسنت خاں کے ساتھ مہربان خاں کا نام بھی لیا ہے، وہاں بھی کوئی مہربان خاں ہوں تو مجھے اس سے کچھ بحث نہیں مگر کلیات میں جہاں جہاں مہربان خان کا نام آیا ہے، اس سے مراد مہربان خان رند ہیں، جو فرخ آباد میں دیوان تھے[ف۵]،

[ف۵] نواب مہربان خاں رند دیوان فرخ آباد بڑے مہمان نواز، دستار پرور اور خوش اخلاق امیر تھے، باوجودیکہ علم نہیں رکھتے تھے، مگر اہلِ کمال کی صحبت میں معلومات بہت وسیع ہو گئی تھیں، میر سوز مدت تک ان کے پاس رہے، ان سے شاعری تیر اندازی اور شمشیر شناسی وغیرہ کی مشق کی تھی، موسیقی میں بہت ماہر تھے، کبت بہت اچھے کہتے تھے، قیافہ شناسی اور قدردانی میں کمال رکھتے تھے، جب مرزا رفیع سودا نے دلّی چھوڑی، انکو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور مدت تک فرخ آباد میں رکھا اور اُن سے مشقِ سخن کرتے رہے، مصحفی کہتے ہیں کہ "اگرچہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا اورا ہم بعرصۂ قلیل مرتبہ والائے شاعری رسانیدہ"، میر حسن فرماتے ہیں،

کلیات اُن کا ہر جگہ مل سکتا ہے، اول اردو کے قصائد ہیں، پھر چوبیس چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں، ایک مختصر دیوان فارسی کا، ایک تمام و کمال دیوان ریختہ کا، جس میں بہت سی غزلیں، مطلع، رباعیاں، قطعات، مستزاد، تاریخیں، پہیلیاں، ترجیع بند، مخمس، اور ہر قسم کی نظم میں ہجویں ہیں"

عبرۃ الغافلین نام ایک رسالہ ہے بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھا ہے، مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب جو انھوں نے فارسی کے شعرائے سلف پر کئے تھے، اور اُن کے کلام میں دخل بیجا کیا تھا، اور خود مرزا فاخر کے کلام پر اعتراض کر کے اسے ناقص ٹھہرایا ہے"

آزاد نے سچ کہا ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے، وہ ایسی طبیعت لیکر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی۔ ..... ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا، اس پر سب رنگوں میں ہمرنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ، جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز، نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے، اور کہیں کہیں کے نہیں، چند صفتیں خاص ہیں، جن سے کلام اُن کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے، اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں، کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) از شاگردان میر سوز و مرزا رفیع مشہور است، در تصانیف نفیسہ بہم دستے پیدا کردہ چنانچہ اکثر اہل غنا دل عشاق را بہ نغمۂ دلآویزی او می برند و بسیارے کلامش را چوں کلام میرزا سودا و میر سوز سرِ لوحِ دیوان می انگارند" کلام ملاحظہ ہو

خلقت تمام گردشِ افلاک سے بنی ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی

مجھ ساتھ تیری دوستی جب ہو گئی آخر دنیا کی مرے دل سے طلب ہو گئی آخر
حاصل تو ہوا وصل ہمیں رات پر افسوس اک پل میں شبِ عیش و طرب ہو گئی آخر

گریباں ہے، جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں، گویا ولایتی طپنچہ کی چانپیں جڑی ہوئی ہیں، اور یہ خاص اُن کا حصہ ہے، چنانچہ جب اُن کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں، تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا، خیالات نازک، اور مضامین تازہ باندھتے ہیں، مگر اس باریک نقاشی پر اُن کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے، تشبیہ و استعارے ان کے ہاں ہیں، مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ، رنگینی کے پردہ میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے،

مرزا نے تقریباً ستر برس کی عمر پائی ۱۱۹۵ھ میں دنیا سے انتقال کیا، اور آقا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے، مصحفی نے تاریخ کہی، ع

سودا کجا و آں سخنِ دلفریبِ او

مرزا کے بہتر خنجر تلاش کرنے سے پیشتر اُن کے قصیدوں اور ہجووں کا رنگ بھی دیکھ لینا چاہیے جس کے وہ مردِ میدان ہیں، اور اس میں کوئی اُن کا حریف نہیں،

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سودا کو سُنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ رے کیا نظمِ بیاں ہے
اتنا میں کیا عرض کہ فرمائیے حضرت
آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یہاں ہے

---

[1] اہل مذاق جس طرح میر تقی میر کے کلام میں بہتر نشتر بتاتے ہیں، سودا کے زبردست کلام میں سے بہتر نشتر تیار کرتے ہیں، اسکی نسبت آزاد کی رائے یہ ہے کہ جو کلام آج کے طرز کے موافق ہے، وہ ایسے مرتبہ عالی پر ہے کہ جہاں ہماری تعریف کی پرواز نہیں پہنچ سکتی، اور دل کی پوچھو تو جن اشعار کو پرانے محاوروں کے جرم میں ردی کرتے ہیں، آج کے ہزار محاورے ان پر قربان ہیں،

سن کر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا
اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہی
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ کی کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہی

گھوڑا ہے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہی
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کے خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہی
ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال
تیروں میں ہی پر گیری تو بے چلّہ کماں ہی
کہتا ہے نفر غرہ کو صرّاف سے جا کر
بی بی نے تو کچھ کھایا ہے، فاقہ سے میاں ہی
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہی

گر ہوجے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب
اس کی تو اذیت ہی بڑی آفت جاں ہی
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دوزانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہی
بے وقت خورش اسکی جو ہو اپنے تئیں بھوکھ
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہی
گھڑیال کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں
اور ریح خلا رودوں میں جوں اسپ دواں ہی

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپئے کا جو کسی عمدہ کے یہاں ہی
صحبت ہے یہ اس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
آوے تو وہ اس کو بخشونت نگراں ہی
اور ما حضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقاں ہی
مطبوخ میں ہی خربزہ، اور خربزہ پر دودھ
ہے دودھ اوپر مچھلی تس اوپر گاؤ زباں ہی
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی پر ہو تسلی
اس سب پہ تفنن کے لئے بیسنی ناں ہی

اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں اُس کے
پھر بو علی سینا ہے تو وہ ہیچمداں ہے
رکھتے ہیں غرض مرض سے لڑنے کو سپاہی
گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے

* * *

سوداگری کیجئے تو ہے اُس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجئے منزل
ہر شام بدل وسوسۂ سود و زیاں ہے
لیجا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنئے تو عجب طرفہ بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ یہ دزدی کا گماں ہے
جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق
پھر بیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت
کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لیجا
دیوانِ بیوتات، یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس
ہر اک متصدی سے میاں اوتیاں ہے

* * *

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یہاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ
نیت قطعۂ تہنیتِ خانِ زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

* * *

ملائی اگر کیجئے تو ملا کی ہے یہ قدر
ہوں دو روپئے اسکے جو کوئی مثنوی خواں ہے
دن کو تو بیچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے
شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے

تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کے   لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہرِ فراغت   چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعونِ زباں ہے
دیتا ہے درم خر سے کوئی شملہ کو نسبت   گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے
اور اُس کو جو دیکھے کوئی وہ بہرِ معیشت   اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھکر   ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگھی   لے خیل مریداں گیے وہ بزمِ جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد   گودے ہے کوئی روے کوئی نعرہ زناں ہے
اور ماحصل اِس رنج و مشقت کا جو پوچھو   ڈالا ہوا واں دال نخود قلیہ و ناں ہے

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری   یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحتِ جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خان جی کا احوال   چھاتی یہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال   جمعیتِ دل کی کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام   عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اُس کا نشاں ہے
سو اُس پہ یقیں کسی کے دل کو نہیں ہے   یہ بات بھی گو بندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے وہاں دغدغۂ حشر   آسودگی حرفیست یہاں ہو نہ وہاں ہے

تضحیکِ روزگار

ہجو اسپ بخیل

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بہ یک قرار
جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانہ کے ہاتھ سے موچی سے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار
تنہا وہی نہ دہر سے عالم خراب ہے خست سے اکثروں نے اُٹھایا ہے ننگ و عار
ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں یا وے مزاج اُن کا کوئی نام سے نہار
نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے گھوڑا رکھے ہیں ایک سو اتنا ذلیل و خوار
نہ دانہ و نہ کاہ و نہ تیمار نے سئیس رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار
ناطاقتی کا اُس کے کہاں تک کروں بیاں فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اُسکا حال کرتا ہے راکب اُس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد امید وار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف کھودے ہے اپنے سم سے کنوئیں ٹاپیں مار مار
فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے میخیں گر اُس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں — دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار
سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ — خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار
ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں — کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور — آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار
رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا — مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار
خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس — گھوڑا مجھے سواری کو دو اپنا مستعار
فرمایا تب اُنھوں نے کہ اے مہربانِ من — ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار
لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ — یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو ہے انکسار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلاوے اُس کا سن — پہلے وہ دے کے ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے — شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

مٹھا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سُنا — لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں ہیں یار
دلّی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ — مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار
مدت سے کوڑیوں کو اڑاتے ہو گھر میں بیٹھ — ہو کر سوار اب کبھو میدان میں کارزار
ناچار ہو گئے تب تو بندھایا میں اُس پہ زیں — ہتھیار باندھ کر میں ہوا اُس اوپر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں اس اوپر — دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ — ٹخ ٹخ کی پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے توبڑہ اُسے دکھلائے تھا نفر — پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لایا تھا رو براہ　　ہلتا نہ تھا جگہ سے جوں میخِ استوار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام　　اکثر مدبر اُن میں کے کہتے تھے یوں پکار
پیچھے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں　　یا بادبان باندھیوں کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی ہے بزکوہی، نہیں یہ اسپ　　کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ　　کٹوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار
کہنے لگا یہ آ کے اس اجماع میں ایک شخص　　گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہگار
سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں　　ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار
اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور　　فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے وہاں دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے اُس دن ہوئے تھے گم　　اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گذار
ہر اک نے اُس کو اپنے گدھے کا خیال کر　　پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُسکے گرد و پیش　　ساتھ اس سمند خرس نما کے ہو چشم چار
جھگڑوں میں دھوبیوں کے کہ لڑکوں کو دوں جواب　　کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب　　وہاں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گذار
یہ کہہ کے خوستی ہیں ہو مستعد بہ جنگ　　اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار
گھوڑا تھا بسکہ لاغر و بیت و ضعیف و خنگ　　کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اسکو حریف پر　　دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفلِ بے سوار
جب میں نے دیکھا جنگ کی یاں تو بندھی یہ تنگ　　لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

مرزا ہجو کے بادشاہ تھے، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، ترجیع بند، مثنوی غرض کہ کوئی صنف اصنافِ سخن سے نہیں چھوٹی، جس میں انھوں نے اپنے دل کا بخار نکالا ہو، یوں تو بہت کم لوگ اُن کی شرر باری سے بچے ہونگے، مگر مکین، ندرت، فدوی، مولوی ساجد اور میر ضاحک کی جیسی مٹی پلید کی ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، یہ تمام ہجویں ان کے کلیات میں موقع موقع سے شامل ہیں، اُن کو یکجا کرو تو خاصا زعفران کا کھیت نظر آئیگا، جس کے دیکھنے سے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجائیں گے،

ان ہجووں کے پڑھنے سے جو خاص قسم کا اثر دل پر پڑتا ہے، وہ ان کی قادر الکلامی اور گرمی کلام کے زور کا ہوتا ہے، قصیدوں میں وہ واقعات کو اس بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں کہ دوسرا شخص مثنوی میں بھی اس طرح سے نظم نہیں کرسکتا،

مگر افسوس ہے کہ وہ جی کھول کر اور آنکھیں بند کرکے ایسا منھ آئے ہیں کہ اسکا معمولی سا نمونہ بھی پیش کرنے سے طبیعت ہچکچاتی ہے، جس کو شوق ہو وہ کلیات اٹھا کر دیکھے،

تغزل کا رنگ دیکھئے،

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے، لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

بیکس کوئی مرے تو جلے اس پہ دل مرا
گویا یہ ہے چراغ غریبوں کی گور کا

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دوانے جب دل دیا تو پھر کیا

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منھ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

رخصت ہو باغباں کہ ذرا دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائیگا

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا
اس خرابی سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے
تو کہے آج نکل میں کہوں کل جاؤں گا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجکو غیر پاس
پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

کیا کرونگا ہاتھ سے حوروں کے واعظ لے کے جام
ہوں میں ساغر کش کسی کی نرگسِ مخمور کا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

کدھر کو چھوڑ گئے مجکو ہمرہاں تنہا
پھروں ہوں دشت میں جوں گردِ کارواں تنہا

ترا مجھ سے نہیں ملتا مرا دل رہ نہیں سکتا
غرض ایسی مصیبت ہو کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام
کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح

اے لالہ گو فلک نے دیئے تجھکو چار داغ
چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

نہ زر نہ زور نہ طالع نہ تیرے دل میں رحم
جو چاہے تجھ سے یہ دل کامیاب ہو معلوم

قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام
ذرہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں،
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

بوسہ ہنس کر نہ دیا اس نے سوائے دشنام
سو بھی یہ جیب نہ ملا کوئی تو مجبور نہیں

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے زمانہ میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

اے مرغِ دل سمجھ کے تو چشمِ طمع کو کھول
تو نے سنا ہے دام جسے ہے وہ دانہ میں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

کیا گلہ صیاد سے ہم کو یوں ہی گذری ہے عمر
اب اسیرِ دام ہیں تب تھے گرفتارِ چمن

جی تک تو دے کے لوں کہ تو ہو کارگر کہیں
اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں
ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجکو نیند
جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں
ساقی ہے یک تبسمِ گل فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

سخت مشکل ہے کہ ہر بات کنایہ سمجھو
ہے زباں میری بھی گفتار کروں یا نہ کروں

دل کو ہر طرح سے دلاسا دیا کروں
آنکھیں جو مانتی نہیں ہیں اسکو کیا کروں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو انصاف
جھوٹی بھی تسلی ہو تو جیتا ہی رہوں میں

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلاے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں تجھ کو

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں
اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

دل کو چاہا ہیں کہ خالی کروں مانند حباب
ہو گئی جان ہوا اک نفسِ سرد کے ساتھ

جو طبیب اپنا تھا اس کا دل کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اُس کو ناصحا
ہونی جو کچھ تھی قبلۂ حاجات ہو گئی
پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے و لے
دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے رات ہو گئی
مستی سے اُس نگاہ کی اے محتسب خبر
دنیا تمام بزمِ خرابات ہو گئی
سودا کسی کو وہ تو ستائے نہ بے سبب
کیا جانیے کہ تجھ سے ہی کیا بات ہو گئی

سودا جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا
جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لیے

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
دل اُس نے لیا مجکو ملی دولتِ دیدار
کیا لوٹ کا سامان ادھر بھی ہے ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

نسیم بھی ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے کچھ دیکھیو رہا بھی ہے
ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشت زار میں مجنوں
کہ اس جوار میں سودا برہنہ پا بھی ہے

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
گر ہو شراب و خلوت و محبوب و خوبرو
زاہد تجھے قسم ہے کہ تو ہو تو کیا کرے
قاتل ہماری نعش کے تشہیر ہے ضرور
آیندہ تا نہ کوئی کسی سے وفا کرے
فکرِ معاش و عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

صورت میں میں کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے
اک وجہ ہے کہ وہ قہر ہے آفت ہی غضب ہے
کیا چیز ہے وہ دل جسے کہتے ہیں الٰہی
اک قطرۂ خوں سینہ میں آفات طلب ہے
دشنام کے دینے کی قسم کھائی ہے لیکن
جب دیکھے ہے وہ مجکو تو اک جنبشِ لب ہے

ہے قسم تجھکو فلک دے تو جہاں تک چاہے
جلوۂ حسن اسے حسرتِ دیدار مجھے

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

عشرت سے دو جہاں کے یہ دل ہاتھ دھو سکے
تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہو سکے،

اثر ہے آہ میں ہر چند نے تاثیر نالے میں
پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا جی بہلتا ہے

خواہ کعبے میں تجھے خواہ میں بتخانے میں
اتنا سمجھوں ہوں مرے یار کہیں دیکھا ہے

بھر نظر تجکو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

رستم سے بھلا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

رُباعی

سودا اپنے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ تا دنیا ہو
بالفعل ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک

میر محمد تقی میر

مجموعۂ قابلیت و ہنر، صاحب طبع خوش فکر، سرآمدِ مشہوران عصر، محاورہ دان و متین، متلاشیِ مضامینِ نو و رنگین متجسسِ الفاظ چرب و شیریں، در میدان غزل پردازی گوئے فصاحت از معاصران می برد، ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پر کار بہا دارد۔“

(از طبقات الشعراء)

اکثرے در فن شعر ریختہ او را در رتبہ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند و اکثرے در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ برو فضیلت می دہند، غرض ہر چہ ہست استادی کار ریختہ برو مسلم است۔“ (از تذکرہ مصحفی)

محمد تقی نام، میر تخلص تھا، اُن کے والد میر عبد اللہ شرفاے اکبر آباد سے تھے، سراج الدین علیخاں آرزو کے رشتہ دار تھے، کسی نے میر صاحب کو خانِ آرزو کا بھتیجا، کسی نے بھانجا لکھا ہے، آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب میر عبد اللہ کی پہلی بیوی سے تھے، وہ مر گئیں تو خانِ آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی، اسلئے سوتیلے بھانجے ہوئے، جو کچھ بھی ہو میر نے خان آرزو کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی

خود میر صاحب نے نکات الشعرا میں خان آرزو کا ذکر بہت محبت و ادب سے کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں "استاد و پیر مرشدِ بندہ است"، دوسری جگہ فرماتے ہیں "ہمہ استادانِ مضبوط فن ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوار اند" ایک اور جگہ لکھا ہے "تا حال ہمچوں ایشاں ہندوستان جنت نشان بہم نہ رسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود"[1]

میر صاحب کی تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں، مگر اُن کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں استعداد اچھی تھی، اور استاد کی تربیت کا پورا فیض حاصل کیا تھا،

دلی میں میر صاحب کی بہن میر محمد حسین کلیم کو بیاہی تھیں، وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی تھیں، اور اُن کے لحاظ سے کلیم کو بھی میر سے بہت محبت تھی، میر نے نکات الشعرا میں کلیم کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے اس سے ان دونوں کے باہمی اخلاص و محبت کا پتہ چلتا ہے،

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے یہاں بھی آمد و رفت تھی، ان کے یہاں ہر مہینہ کی پندرھویں کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا، اُس میں میر صاحب شریک ہوا کرتے تھے، اور خواجہ میر درد سے بہت خلوص

---

[1] آزاد کہتے ہیں کہ خانصاحب حنفی مذہب تھے، اور میر صاحب شیعہ، اس پر نازک مزاجی غضب کی، کسی مسئلہ پر خانصاحب سے بگڑ کر الگ ہو گئے، تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کی تصدیق یا تکذیب کرنا دشوار ہے، اس واسطے کہ جتنے تذکرے پیشِ نظر ہیں، ان میں کہیں اس سے بحث نہیں، مگر میر صاحب نے جو کچھ خانصاحب کے متعلق خیالات ظاہر کئے ہیں، اُنہیں دیکھتے ہوئے اس واقعہ کو باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے،

تھا، نکات الشعرا میں فرماتے ہیں "فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد، از زبانِ مبارکش فرمود میر تقی میر تو میر مجلس خواہی شد، الحمد للہ والمنۃ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستاں موثر افتادہ"

انقلاباتِ زمانہ سے مشاعرہ کا سلسلہ خواجہ میر درد کے یہاں درہم برہم ہو گیا تو انھوں نے میر صاحب سے فرمایا کہ اپنے یہاں مشاعرہ کیا کرو، چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں ہر مہینہ کی پندرہویں کو اُن کے ہاں مشاعرہ ہونے لگا، خواجہ صاحب بھی اس میں شرکت فرماتے تھے، تذکرہ میں لکھتے ہیں "مجلس ریختہ کہ بخانہ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است و اللہ بذات ہمیں بزرگ است"

خوب معلوم نہیں کہ دلّی میں اُن کی گذر اوقات کا کیا ذریعہ تھا، مگر اتنا یقیناً معلوم ہے کہ سلطنت کی تباہی اور مرہٹہ گردی میں جس طرح اور شرفا مفلوک و تباہ ہو گئے میر بھی اسی کشمکش میں مبتلا تھے، تاہم اُن کی وضعداری کی داد دینا چاہیے کہ مرزا رفیع سودا، میر سوز اور خدا جانے کتنے لوگ پریشان ہو کر دلّی سے نکل کھڑے ہوئے، کوئی فرخ آباد گیا، کوئی لکھنؤ، کوئی اور آگے بڑھ گیا، مگر جب تک ہو سکا میر صاحب دلّی میں قدم جمائے بیٹھے رہے،

جب پانی سر سے گذر گیا تو ساٹھ برس کے سن میں بقول مرزا لطف ۱۱۹۷ھ میں دلّی چھوڑ کر لکھنؤ آئے، نواب آصف الدولہ[1] کا زمانہ تھا، ان کی تعریف میں قصیدہ کہہ کر پیش کیا،

---

[1] نواب آصف الدولہ یحییٰ علیخاں ہزبر جنگ امۃ الزہرا بیگم کے بطن سے نواب شجاع الدولہ کے ایک ہی بیٹے تھے ۱۱۸۸ھ میں باپ کے مرنے کے بعد مسندِ وزارت پر بیٹھے، اودھ، روہیلکھنڈ، صوبہ الہ آباد اور صوبہ اکبر آباد میں چکلہ کوڑا اور چکلہ اٹاوہ کا زرخیز علاقہ ترکہ میں پایا، مگر نا قابلیت کی تھی مزاج میں عیش پرستی تھی، یہاں خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں زمامِ حکومت، دوسری طرف حریفِ سلطنت مدبر اور زمانہ شناس، نتیجہ یہ ہوا کہ جونپور، بنارس، غازیپور کے تین سرسبز و شاداب ضلعے سرکار کمپنی بہادر نے وزیر سے برضا و رغبت لے لئے، اور ان کے مرتے ہی آدھا ملک ان کے جانشین نواب سعادت علیخاں کی ہوس حکمرانی کے نذر ہو گیا، صرف اودھ کے اضلاع باقی رہے جس کا الحاق واجد علی شاہ کے زمانہ میں سرکار کمپنی کے ممالک محروسہ سے ہو گیا،

نواب آصف الدولہ سات برس فیض آباد رہنے کے بعد لکھنؤ آ رہے اور اسی کو دار الحکومت بنایا،

اور اس میں اپنی غربت اختیار کرنے کا پورا ماجرا بیان کیا، نواب نے اُسی دن خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کر کے تین سو روپیہ ماہوار ان کے لئے مقرر کر دیئے جو مرتے دم تک ان کو ملتے رہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۶) زمانہ کی عمارتوں میں عالیشان امام باڑہ اب تک قائم ہے، جو لکھنؤ میں فن تعمیر کے لحاظ سے ایک ہی عمارت ہی، اسکو کفایت اللہ خاں دلّی کے مشہور مہندس (انجنیر) نے تیار کیا تھا، اس کا رومی دروازہ، باولی، مسجد، امام باڑہ کے لداؤ کی تین چھتیں اور بھول بھلیاں دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں سمجھی جاتی ہیں، اور دور دور سے اس کے دیکھنے کو سیاح آکر محوِ حیرت بن جاتے ہیں،

آصف الدولہ میں جہاں کچھ عیوب تھے، وہاں ایک صفت فیاضی اور سیر چشمی کی ایسی تھی جس سے وہ اپنے ملک میں نہایت ہر دلعزیز تھے، آج تک لکھنؤ کے دوکاندار ان کا نام لیکر صبح کو دوکان کھولتے ہیں، اور یہ فقرہ بطور ضرب المثل کے بولا جاتا ہے کہ ”جس کو نہ دلائے مولیٰ اُسے کیا دیں آصف الدولہ“

امام باڑہ وغیرہ جیسی نادر اور عالیشان عمارتوں پر پچاس لاکھ روپیہ صرف کیا، پچاس لاکھ روپیے سے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کرائی جس سے ان کا نام عراق میں بھی اسی نیکی سے لیا جاتا ہی جیسا کہ لکھنؤ میں،

شعرار کی قدردانی میں بھی یہ اپنے پیشرو سے آگے تھے، میر سوز ان کے استاد تھے انکی خدمت جو کچھ کرتے ہوں گے وہ معلوم نہیں، مرزا رفیع سودا کو چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر دی تھی، میر تقی میر کو تین سو روپیہ ماہوار دیتے تھے، علاوہ اس کے داد و دہش میں جب ادنیٰ ادنیٰ نفروں کو ہزاروں کی خلعت ملتی تھی تو ان کا کیا پوچھنا،

نواب آصف الدولہ کے زمانہ کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہی کہ لہو و لعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں اُنھوں نے دل سے کوشش کی، ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے، وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے، ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں، اور جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کی گئیں، شاہ علی اکبر مودودی کے مشورے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتدا میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لیا، نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے

آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب اپنی بد دماغی اور نازک مزاجی سے کسی بات پر نواب سے بگڑ کر گھر بیٹھ رہے، اور فقر و فاقہ میں زندگی گذار دی، ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ جب سعادت علیخاں کا دور ہوا تو یہ دربار چھوڑ چکے تھے، وہاں سے کسی نے طلب نہ کیا، ایک دن نواب کی سواری

(بقیہ حاشیہ صـ١٥٧) ہاتھ میں زمامِ مذہب دی،

مگر افسوس ہے کہ نواب آصف الدولہ کو ان کی غفلت اور عیش پرستی نے انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رکھا تھا، اور اسی غم میں ان کی جان گئی، دانستہ اُنھوں نے ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے جلد بیمار ہوں، اور ایسے بیمار ہوں کہ جانبر نہ ہو سکیں، حکیم شفائی خاں دلّی کے نامور طبیب معالج تھے، ان سے پوچھا کرتے اور جو بتاتے اس کے خلاف عمل کرتے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ آرزو سنہ ١٢١٢ھ میں پوری ہو گئی، اور استسقا کی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا، (کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو)

آصفؔ نہ چھٹے عشقِ بتاں دل سے ہمارے
سو بار اگر پھر بھی بنا دیں اسے گھڑ کر

شوخیِ چشم کی شہرت کو تری سُن سُن کر
شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں

جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے
آب سے آتش ہوئے کیونکر بہم کیا جانئے

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو
میں ہوں اور رات ہی اور بسترِ تنہائی ہی

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے

جاتی تھی یہ تحسین کی مسجد پر برسرِ راہ بیٹھے تھے، سواری سامنے سے آئی، سب اُٹھ کھڑے ہوئے، یہ اسی طرح بیٹھے رہے، سید انشا خواصی میں بیٹھے ہوئے تھے، نواب نے پوچھا یہ کون شخص ہے، عرض کی یہ وہی گدائے متکبر ہے، جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے، گذارہ کا یہ حال اور مزاج کا یہ عالم، آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا، سعادت علی خاں نے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھیجا، میر صاحب نے واپس کر دیا، پھر سید انشا خود لیکر گئے، اور سمجھا بجھا کر راضی کیا، کبھی کبھی دربار جانے لگے،

میرے نزدیک کچھ عجب نہیں کہ کبرسنی کی وجہ سے یا خودداری کے خیال سے کہ بے بلائے نہ جائیں دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا ہو، مگر یہ صحیح نہیں کہ گھر بیٹھ رہنے سے ان کی تنخواہ بند کر دی گئی اور فقر و فاقہ میں اُنھوں نے زندگی بسر کی، مرزا علی لطف میر صاحب کے ہمعصر ہیں، وہ گلشن ہند میں لکھتے ہیں کہ

> " اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج تک کہ سنہ ۱۲۱۵ھ ہے، وہی حال ہے "

اب تم غور کرو کہ بقول آزاد نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں میر صاحب گھر بیٹھ رہے تھے، اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو چکے تھے، جب سعادت علیخاں نواب وزیر ہوئے تو انھوں نے ان کو پوچھا نہیں، چند دنوں کے بعد انشاء اللہ خاں کی مہربانی سے ان کو خلعتِ بحالی ملا، لطف یہ کہ سنہ ۱۲۱۵ھ میں خود انشاء اللہ خاں کی رسائی نواب سعادت علی کے دربار میں ہوئی ہے اور اس وقت تک بقول لطف ان کی تنخواہ جاری تھی، حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے، وہ ان کے منہ پر کھلتی نہیں، کچھ شبہہ

نہیں کہ میر صاحب نازک مزاج تھے، مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں، اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں خر دماغ سمجھے گا،

آزاد کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں میر صاحب نواب ...... سے بگڑ کر بیٹھ رہے تھے، ایک دن بازار چلے جاتے تھے، نواب کی سواری سامنے سے آگئی، دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا، کبھی تشریف نہیں لاتے، میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا دابِ شرفا نہیں، یہ کیا گفتگو کا موقع ہے"! اگر تھوڑی دیر کے لئے اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو میرے نزدیک جس کو خبط دماغ ہوگا وہی اس کو نازک مزاجی سے تعبیر کر سکتا ہے، ورنہ جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے اسکے پاگل ہونے میں کچھ شبہہ نہیں،

آزاد کہتے ہیں کہ "افسوس یہ ہے کہ ان کو اوروں کے کمال بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ میر سے شخص کے دامن پر بدنما دھبہ ہے"! ایک جگہ اور کہتے ہیں کہ "خواجہ حافظؒ اور شیخ سعدیؒ کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، کسی کی اور حقیقت کیا ہے"! مگر جب اس کی جانچ ہم ان کی کتاب نکات الشعرا سے کرتے ہیں تو حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی کہ یہ بیان کس قدر واقعہ کے خلاف ہے، میر سجادؔ میر صاحب کے زمانہ میں ایک نوجوان شاعر تھے تاہم ان کی نسبت فرماتے ہیں "سخن او بپایۂ استادی رسیدہ"! انکے ایک ایک شعر پر وجد کرتے ہیں اور سو جگہ لکھنے کی تمنا کرتے ہیں، سجادؔ کا شعر ہے ؎

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

میر صاحب داد دیتے ہیں "ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیدن ایں شعر تواجد دست بہم می دہد از بسکہ از خواندن ایں شعر حظے بر می دارم می خواہم کہ بصد جا بنویسم"

آزاد کہتے ہیں کہ سوز مرحوم پہلے میر تخلص کرتے تھے جب میر تقی مرحوم میر کے تخلص سے

عالمگیر ہوئے تو انھوں نے سوز اختیار کیا، دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ سوز نے ایک مشاعرہ میں کہا تھا کہ فقیر نے تو تخلص میر کیا تھا، مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا، فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کلام کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا، ناچار سوز اختیار کیا،"

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ میر سوز کے ذکر پر میر تقی میر نے کہا کہ شرفا میں ہم نے ایسے تخلص کبھی سنے نہیں، اب دیکھو کہ میر صاحب خود کیا کہتے ہیں، "محمد میر میر تخلص جوانے است بسیار اہل خوش طبع ہر چند طرز علیحدہ دارد، لیکن از خوش کردن تخلص من نصفت دلم از و خوش است" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے ان کا تخلص پسند نہیں کیا، بلکہ میر سوز نے پسند کیا، تاہم جس خوشدلی سے ان کا ذکر کرتے ہیں اس سے یہ بعید ہے کہ جب وہ میر صاحب کی بزرگی کا لحاظ کر کے اپنا تخلص بدل ڈالیں تو میر صاحب فرمائیں کہ شرفا میں ہم نے ایسے تخلص کبھی سنے نہیں،

آزاد میر صاحب کے سلسلہ تصنیفات میں نکات الشعرا کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے، دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھونگا، مگر ان کو نہ لونگا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو، ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، ولی کہ بنی نوعِ شعرا کا آدم ہے، اس کے حق میں فرماتے ہیں "وے شاعریست از شیطان مشہور تر" نکات الشعرا چھپ گیا ہے، اور پیشِ نظر ہے اس کے دیباچہ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کو نہ لونگا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو، ولی کی نسبت فرماتے ہیں "... از کمالِ شہرت احتیاجِ تعریف ندارد" شیطان والا فقرہ سارے تذکرے میں کہیں نہیں ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی نظر سے نکات الشعرا نہیں گذرا، اس قسم کے مضامین

جو آبِ حیات میں لکھے ہیں کسی مستند ماخذ سے لئے گئے ہیں، صرف قصے کہانیوں پر انکی بنیاد ہے یا بقول مولانا شروانی[1] قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑا دیے ہیں اور اپنی سحر بیانی

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، حسرت تخلص، بھیکن پور ضلع علی گڈھ کے مقتدر رئیس، خوش رو، خوش خو، خوش گو، خوش اخلاق امیر ہیں، علوم و فنون عربیہ کی تعلیم مولوی عبد الغنی خاں فرخ آبادی اور ان کے استاد مولانا لطف اللہ مرحوم سے پائی ہے، شعر و سخن کی مشق منشی امیر احمد مینائی سے کی ہے، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں، فضیلت علمی کے ساتھ خدا نے ان کو ایسی صفتیں عنایت کی ہیں جن پر ہمیشہ مجھکو رشک آتا ہے سب سے نمایاں صفت انکی متانت اور اصابتِ رائے ہے جس کی آزمائش نازک ترین مواقع پر ہو چکی ہے اور ہر موقع پر ایسے جوہر کھلے ہیں، جس نے سب کو متحیر کر دیا ہے، دوسری صفت ان کی انتظامی قابلیت ہے جس کے لئے خدا نے ان کو نہایت موزوں دماغ عطا فرمایا ہے، اور اس کا بہترین نمونہ اُن کی ریاست کا انتظام ہے، جس وقت ان کے ہاتھ میں کام آیا ہے، ریاست زیر بار قرض تھی، چند روز میں اپنی انتظامی قابلیت سے لاکھوں روپیے کا قرض ادا کر کے زیر باری سے اسکو محفوظ کر دیا، یہ بھی تھوڑی بات نہیں کہ انکا قیام حیدر آباد میں ہے، سال میں دو بار مہینے مہینے ڈیڑھ ڈیڑھ مہینے کو آجاتے ہیں، مگر انتظام کے ایسے عمدہ اصول بنا دیئے ہیں کہ ہر کام ٹھیک وقت پر ہوتا رہتا ہے، تیسری صفت ان کی یہ ہے کہ باوجود نوجوانی اور رنگین مزاجی اور دولتمندی کے مذہبی جذبات کی پرورش و پرداخت سے غفلت نہیں کی، عنفوان شباب میں قبلۂ ارشاد حضرت مولانا فضل الرحمٰن قدس سرہٗ سے بیعت کی اور شیخ الحدیث مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی کو حبیب گنج میں تکلیفِ اقامت دیکر صحاح ستہ کی سند حاصل کی اور اپنے اوقات کا بہترین حصہ تفسیر و حدیث کی خدمت میں صرف کیا، چوتھی صفت یہ ہے کہ باوجود ان تمام مشغولیتوں کے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ایسے کاموں میں صرف کرتے رہے جن سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود وابستہ ہے، ندوۃ العلماء کی بنیاد ۱۳۱۱ھ میں پڑی، اسی سال اس کے رکن انتظامی منتخب ہوئے، اس وقت سے ابتک کہ ۲۰ سال کا زمانہ ہونے کو آیا ہے، اس کے رکن رکین ہیں، اور ہر ممکن ذریعہ سے مدد دینے میں پہلو تہی

سے سامعین کو خوش کیا ہے،

نکات الشعرا کی مدد سے نیز تذکرہ نویسوں کی تحریر سے میر صاحب میں جو اوصاف ہمیں نظر آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور وضعدار آدمی تھے، میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے، بات بہت کم کرتے اور وہ بھی آہستہ آواز میں، نرمی اور ملائمت، مزاج میں قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی احتیاط و برسرکاری کے ساتھ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ و متین، ہر وقت محویت کا عالم طاری، اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے،

سو برس کی عمر پائی تھی، آخر آخر میں بڑھاپے نے ان صفتوں کو اور بھی ابھار دیا تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲) نہیں کرتے، علاوہ اس کے برسوں محمڈن کالج علی گڈھ کے ناظم امور مذہبی رہے اور کئی سال سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ہیں اور ہر کام کو دلچسپی سے انجام دیتے ہیں،

۱۳۳۶ھ میں اعلیٰحضرت محی الملۃ والدین آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی نگاہ دوربین نے دولت آصفیہ دکن کی صدارت کیلئے انکا انتخاب فرمایا، باوجودیکہ ان کو اس عزت وجاہ کے پیدا کرنے کی حاجت نہیں تھی مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف اس خیال سے کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کا نادر موقع ہاتھ آتا ہے، اپنی صحت اور انتظام ریاست کے بگڑنے کی پرواہ نہ کرکے اسکو قبول کرلیا، خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کو اتنی ہمت و قوت عطا فرمائے کہ وہ اپنی دماغی قابلیتوں کے لحاظ سے دولت اسلامیہ دکن کے بہترین مشیر و وزیر ثابت ہوں،

مجھکو ممدوح الصدر کی خدمت میں تیس برس سے نیاز حاصل ہے، اس وجہ سے مجھکو ان کے محاسن اخلاق کے دیکھنے اور جانچنے کا کافی موقع ملا ہے، اسی وجہ سے میں نے ان کے انہی اوصاف کا ذکر کیا ہے جن کا خاص طور پر میرے دل پر اثر ہے، ان کی علمی خدمتیں اتنی نمایاں ہیں کہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں وہ علمی سلف کے مصنف ہونے کی حیثیت سے نیز سیکڑوں اخلاقی اور تاریخی مضامین کے لحاظ سے جو برابر شائع ہوتے رہتے ہیں ہندوستان میں شہرت حاصل کرچکے ہیں، اور امید ہے کہ آیندہ اس سے زیادہ حاصل کریں گے،

اسی مناسبت سے دل کی گرفتگی بھی بڑھ گئی ہوگی، مگر تم اس بات پر غور کرو کہ محمد شاہی دور کا ایک بوڑھا وضعدار شاعر جس کی عمر کا بیشتر حصہ اُن لوگوں میں بسر ہوا جن کی وضع قطع، عادات واطوار غرضیکہ ہر چیز کی سند لیجاتی تھی، قزلباش خاں امید، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا جانجاناں مظہر، خواجہ محمد ناصر عندلیب، خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا، اور محمد حسین کلیم جنمیں کا ہر ایک مجموعۂ قابلیت و ہنر تھا، ان کے ساتھ ہر وقت کی صحبت، علمی مذاکرے، اور جلسوں کی گرمجوشیاں مگر عفت و پرہیزگاری، شرم و حیا، مروت و ہمدردی، وضعداری اور دوستی کے اگلے آئین و قوانین کے ساتھ جو ہماری قومی زندگی کی علامتیں تھیں، ایک کا دوسرے سے میل جول ایسا بے نظیر اور قابلِ تقلید عمل در آمد تھا جس کی تعریف کرنے سے زبان و قلم کا حوصلہ تنگ ہے،

دیکھنے کی بات ہے کہ جب اُسی شخص پر مصیبت پڑتی ہے تو یاران صحبت میں سے ایک ایک کر کے پیوند زمین اور کوئی آوارۂ دشتِ غربت ہو جاتا ہے، اور مرہٹوں کی دست برد سے ایک عالم آشوب ہنگامہ برپا ہوتا ہے، جس سے شہر میں خاک اڑنے لگتی ہے، اس وقت اس کے پائے ثبات کو بھی لغزش ہوتی ہے، وہ ایسے شہر میں وارد ہوتا ہے، جہاں نئے انداز، نئی ترائشیں، بانکے ٹیڑھے جوانوں کو دیکھتا ہے، اُن کے مشغلوں[1] کو دیکھتا ہے، اُنکے جذبات و خیالات کو

---

[1] میر صاحب کے کلیات میں ایک مثنوی ہے، جسمیں لکھنؤ کی مرغ بازی کا خاکہ اڑایا ہے، یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا ہے، اور نواب کو مرغ بازی کا بہت شوق تھا، اسی وجہ سے گھر گھر اسی کا چرچا تھا اور ہفتہ میں دو بار شہر میں پالیاں ہوتی تھیں، چند شعر اس مثنوی کے ملاحظہ ہوں، ان شعروں سے میر صاحب کی دلی کیفیات کا اندازہ ہو سکتا ہے

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
جیسے منگل کو بالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

جا پہنچتا ہے، ان کی طبیعتوں کی شوخی زبانوں کی طراری، تراشوں اور ایجادوں کے انوکھے پن سے سابقہ پڑتا ہے، پھر تم ہی کہو کہ اس بیچارے بڈھے پراتم پرانی لکیر کے فقیر کے دل پر کیا گذرتی ہوگی اس سے یہ شبہہ نہ ہوسکتا ہوگا کہ وہ جرأت اور انشا کی شوخیوں اور مرزا سعادت یار خاں کی جدت پسند طبیعت کی رنگینیوں کو سُن کر دادِ سخن دے، اور قہقہوں کی آواز میں خود بھی آواز ملائے، اسی کو بد دماغی کہہ لو یا نازک مزاجی، جس سے خود میر صاحب بھی واقف تھے، چنانچہ ایک مخمس کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

حالت تو یہ ہے مجکو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے، سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴) مرغ لڑتے ہیں ایک دو لائیں　　سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
انی پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے　　انی کی نوک پر اکڑنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ کج ہیں　　ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے　　ان کی صد رنگ بد زبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ　　ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں　　لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منھ میں مرغ کی منقار　　ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منھ میں آیا جو کچھ سو بکنے لگے　　تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے　　بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ　　لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

اگر جرأت و انشا کو تم خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا ہمرتبہ خیال کرتے ہو تو میر صاحب بے شبہہ اس بات کے گنہگار تھے کہ وہ ان کی شوخیوں پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، میں کہتا ہوں کہ اُن میں فضل و کمال کے ساتھ خودداری نہ ہوتی تو ان نوجوانوں سے پگڑی بچانا مشکل پڑ جاتا جن میں سے ایک بھانڈوں سے برابر کی چوٹ لڑ سکتا ہو، اور دوسرے کی رذل اور فحش ہجوؤں کا ایک ایک مصرع ہزار قمچی اور چابک کا تڑاقا ہو، پھر ان کی بھی وہی گت بنتی جو غریب مصحفی کی بن کر رہتی[1]،

---

[1] انشاء اللہ خاں اور مصحفی میں جو چوٹیں چلیں وہاں تک تو غنیمت تھیں جس حد تک شاعری کو دخل تھا، اس کے بعد جو معرکے ہوئے اور آزاد نے نمک مرچ لگا کر بیان کیے ہیں، ان کو آبِ حیات میں پڑھو، خلاصہ یہ کہ سید انشاء نے بہت سی رذل اور فحش ہجویں کہیں کہ جن کا ایک ایک مصرع بقول آزاد ہزار قمچی اور چابک کا طراقہ تھا، بڈھا بیچارہ اپنی شیخی کی جریب اور عصائے غرور کے سہارے سے کھڑا ہو کر جتنا کر میں بوتا تھا، مقابلہ کرتا رہا، جب نوبت حد سے گذر گئی تو اس کے شاگردوں سے لکھنؤ بھرا پڑا تھا، منتظر اور گرم سب کو لیکر اٹھ کھڑے ہوئے جو کچھ ہو سکا شاگردی کا حق ادا کیا، ایک دن شہدوں کا سوانگ بھر کے ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشاء کی طرف روانہ ہوئے، ان کو خبر پہلے لگ گئی، اپنے یاروں کو لیکر استقبال کو نکلے، اور ان کو مکان پر لائے، خود دوبارہ پڑھوایا، شیرینیاں کھلائیں، شربت پلائے، ہار پہنائے اور عزت و احترام سے رخصت کیا (آزاد نے کوئی شعر اس ہجو کا نقل نہیں کیا، یہ یاد رکھنے کی بات ہے) اب سنو سید انشاء نے جو اسکا جواب حاضر کیا وہ قیامت تھا یعنی ایک انبوہ کثیر برات کے سامان کے ساتھ ترتیب دیا، اور عجیب غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے ایک ہاتھ میں گڈا، ایک میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے اور اشعار پڑھتے جاتے تھے، جن میں کا ایک شعر یہ ہے، ؎

سوانگ نیا لایا ہے دیکھا چرخِ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

مرزا علی لطف نے گلشنِ ہند میں یہ بات نئی لکھی ہے کہ جب کلکتہ میں جان گلگرسٹ صاحب کی کوشش سے حکام کو اردو زبان کی سرپرستی کا خیال ہوا، تو لکھنؤ سے بھی زبان دانوں کی مانگ ہوئی تو سب سے پہلے کرنل اسکاٹ کے سامنے میر صاحب کی تقریب ہوئی، مگر پیرانہ سالی کی وجہ سے ان کا انتخاب نہیں ہوا، میر شیر علی افسوس ایک نوجوان شخص بھیج دیئے گئے،

میر صاحب کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان ریختہ غزلوں کے ہیں، چند صفحے ہیں جن میں فارسی کے عمدہ متفرق اشعار پر اردو مصرعے لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے، رباعیاں، مستزاد چند صفحے، پانچ قصیدے، چند مخمس اور ترجیع بند، چند مخمس شکایتِ زمانہ میں، دو واسوخت ایک ہفت بند، بہت سی مثنویاں، ایک دیوان فارسی کا ہے، جس میں دو ہزار شعر ہیں،

میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں، قصیدے کے مردِ میدان نہیں، آزاد نے ٹھیک لکھا ہے کہ ان کے قصیدے کم ہیں، اور اسی قدر درجہ میں کم ہیں، واسوخت لاجواب ہیں، فارسی میں فغانی یا وحشی، اردو میں میر صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے،

تذکرہ نکات الشعراء شعرائے ریختہ کے حال میں ہے، فارسی میں لکھا ہے، سنہ تصنیف مجھے نہیں ملا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ کے زمانہ میں لکھا ہے، اور انجمن ترقی اردو نے اس کو چھپوا دیا ہے، میر صاحب نے سو برس کی عمر پائی اور ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے، اب کوئی نہیں جانتا کہ لکھنؤ میں ان کا مزار کہاں پر ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ بلکہ اکثر امراء نے سید انشار کا ساتھ دیا، اور حریف کا سوانگ ایک دفعہ کوتوال سے کہہ کر رکوا دیا، اس بات نے مصحفی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا جس کی جھلک ان کے کلام میں پائی جاتی ہے، ان میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا
سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

کلام ملاحظہ ہو۔

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بیچارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا

صیاد! دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھتا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے
ہے خیر میر صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب یہ تو ناسور گیا

مسجد میں امام آ کے ہوا آج وہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اُس کے عشق میں
دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

فلک کو منھ نہیں اس فتنے گے اٹھانے کا
ستم شریک ترا ناز ہے، زمانے کا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے
خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوے شوق
ہیں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

جہاں کو فتنہ سے خالی کبھی نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

اٹھو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اتنی گذری جو مری ہجر میں سو اُس کے سبب
صبر مرحوم عجب مونسِ تنہائی تھا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

یک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کچھ کہ یاں ہو سو افسوس ہے جوانی کا

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانئے یہ کب کی بات

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی
بہت روئے ہم اسکی رخصت کے بعد

مرگ اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

منتظر قتل کے وعدہ کا ہوں اپنے یعنی
جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہگار ہنوز

اُس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر
شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میرؔ
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

ایک بیمار جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

دن نہیں، رات نہیں، صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

مدعی مجھکو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

کاشکے دو دل تو ہوتے عشق میں
ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

بیقراری جو کوئی دیکھے ہے کہتا ہے یہی
کچھ تو ہے میرؔ کہ اک دم تجھے آرام نہیں

کہتے ہو اتحاد ہے ہمکو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو

کہتے سے میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو

ہوگا کسی دیوار کے سایے میں پڑا میر
کیا ربط محبت سے اُس آرام طلب کو

یوں رفتہ اور بیخود کب تک رہا کروگے
تم اب بھی میر صاحب اپنے تئیں سنبھالو

خطرے بہت ہیں میر رہِ صعب عشق میں
ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دین کو کھو رہو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر
جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

پہونچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حالِ میر
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

بہت سعی کیجے تو مر رہیئے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

آتے کبھی جو واں سے تو یاں رہتے تھے اداس
آخر کو میر اس کی گلی ہی میں جا رہے

کعبہ میں جاں بلب تھے ہم دوریِ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کی خدا کے ہاں سے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پر میں کیا کروں
منھ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر
آؤ میخانے چلو تم کس کی باتوں پر گئے

پتھر کی چھاتی چاہیئے ہے میر عشق میں
جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

جب نام ترا لیجئے تو چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے   لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں   عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے،

سرمگیں آنکھیں شرم آلودہ خاک میں ہمکو ملائینگی   کیا یہ نگاہیں نیچی نیچی اوپر اوپر جائیں گی

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں   اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اوداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر   صنم کدہ ہیں تو ٹک آ کے دل لگا بھی ہے

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ

زبانِ گفتگویش گرہ کشائے زلفِ شامِ مدعا، مصرع نوشتہ اش پر صفحۂ کاغذ از کاکلِ صبحِ تمنا طبع سخن پردازِ او سرو مائلِ چمنستان انداز است گاہے در کوچۂ باغ تلاش بہ طریقِ گلگشت قدم رنجہ می فرماید، در چمن شعرش لفظ رنگیں چمن چمن گلچین خیال او و گلِ معنی دامن دامن شاعر زور آور ریختہ در کمالِ علاقگی وارستہ، خلیق متواضع آشنائے درست اشعر فارسی ہم می گوید، اما بیشتر رباعی گرمی بازار وسعت مشرب اوست (اھ نکات الشعراء)

اکثرے از دستِ عسرت پریشان شدہ بہ طرفے افتند لیکن آں ثابت قدم تکیہ بر توکل نمودہ قدم از جا بر نداشت، تا حال در شاہجہان آباد مقیم است، دیوانش اگرچہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب (اھ تذکرۂ میر حسن)

،،خواجہ میر درد کی غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہے، مگر انتخاب ہوتی ہے، خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے، گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں، خیالات ان کے متین تھے، کسی کی ہجو میں زبان آلودہ نہیں ہوئی، تصوف جیسا اُنھوں نے کہا اُردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا (اھ آب حیات)

سید خواجہ میر نام، درد تخلص تھا، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الرشید تھے، گیارہ واسطوں سے ان کا نسب خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے، دلی میں پیدا ہوئے اور والد کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی، اور بائیس برس کے سن میں دنیا سے منھ موڑ کر والد کے سجادہ پر بیٹھ گئے، سلطنت کی تباہی، آئے دن کے قتل و غارت کے سبب سے اکثر امرا و شرفا کے گھرانے گھر اور شہر چھوڑ کر نکل گئے، مگر ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی، اللہ پر توکل رکھا، اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اُس پر بیٹھے رہے،

علوم و فنون میں طاق تھے، تصوف اور موسیقی میں اچھی مہارت تھی، دلی کے بڑے بڑے باکمال گویے، اپنی اپنی چیزیں بہ نظر اصلاح لاکر سنایا کرتے تھے،

ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی، اس میں علما و مشایخ اور اکثر امرا شرکت کرنا فخر سمجھتے تھے، شاہ عالم بادشاہ بھی کئی بار اس میں شریک ہوئے ہیں، ایک بار بغیر اطلاع کے چلے آئے، چونکہ پاؤں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکے، ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ صاحب اس بے ادبی کے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا یہ امر فقیر کی داب محفل کے خلاف ہے، بادشاہ نے عذر کیا، اور معافی مانگی، خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس سے خواجہ صاحب کے استغنا کا اندازہ کرو، حقیقت یہ ہے

کہ وہ اپنے فضل و کمال کے ساتھ قدیم متانت اور تہذیب کی ایک مجسم تصویر تھے، ضبطِ نفس، استقلال اور قناعت اُن کی مشیخت کا طرۂ افتخار تھا،

اسرار الصلوٰۃ ایک رسالہ ہے، جو پندرہ برس کے سن میں لکھا ہے، واردات درد نام ایک دوسری کتاب ہے، جسمیں ایک سو گیارہ رسالے ہیں، نالۂ درد، آہ سرد، درد دل، سوز دل شمعِ محفل وغیرہ، اس کی شرح میں علم الکتاب جیسی کتاب تصنیف کی، اگر اُن کے فضل و کمال کا صحیح اندازہ کرنا چاہو تو علم الکتاب کا مطالعہ کرو، ایک رسالہ مبحثِ غنا میں لکھا ہے، ایک دیوان فارسی میں ہے، ایک ریختہ میں، میرے عزیز دوست نواب نورالحسن خاں[۱] مرحوم نے اپنی حسن عقیدت سے یہ سب کتابیں چھپوا دی ہیں،

---

[۱] یادش بخیر نواب نورالحسن خاں مرحوم امیرالملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں بہادر کے بڑے بیٹے جمال الدین خاں بہادر مدار المہام بھوپال کے نواسے، نانا کی طرح عالی حوصلہ، فیاض، سیر چشم اور اپنے والد کے مانند ذہین، ذکی، قوی الحفظ اور سریع الادراک تھے، ۱۲ر رجب ۱۲۷۸ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد و دیگر علما و محدثین سے علوم آلیہ و عالیہ کی تحصیل کی، اور افتخار الشعرا حافظ خان محمد خاں شہیر سے مشق سخن کی، ایک مدت تک اپنے والد اور نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کے سایۂ عاطفت میں نہایت عیش و آرام سے زندگی بسر کی، بچپن سے مزاج میں بے تعلقی اور وارستگی تھی، جمال الدین خاں بہادر کے بعد نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ نے چاہا کہ ان کو مدارالمہام مقرر کریں، مگر اس کو منظور نہیں کیا، حقائق و معارف کے دلدادہ تھے، مطالعہ یا مذاکرہ میں صرف اوقات کرنے کو پسند کرتے تھے،

نواب شاہجہاں بیگم کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں آکر بودوباش اختیار کی، اور اسی بے تعلقی اور وارستگی میں زندگی بسر کردی، اخیر زمانہ میں گونا گوں امراض میں مبتلا ہو جانے خصوصاً اختلاج قلب اور خفقان کی وجہ سے کاوشِ فکر کی عادت جاتی رہی تھی، مگر اس پر بھی تھوڑے تامل کے بعد نہایت آمد اشعر کہہ لیتے

آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے، میرے نزدیک میر صاحب پر یہ نرا بہتان ہے، جس کو آب حیات میں آزاد نے چمکا کر دس پانچ جگہ بیان کیا ہے، میر صاحب کی جو رائے خواجہ صاحب کے باب میں ہے، اس کو پڑھ چکے، نکات الشعرا، چھپ گیا ہے، اس کو دیکھ لو،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) زود نویس ایسے تھے کہ جب بیٹھ جاتے تو جزو دو جزو ایک جلسہ میں لکھ کر اٹھتے، زود نویسی کے ساتھ شیریں قلم بھی تھے، اور ان دونوں باتوں میں اپنے والد نامدار کی یادگار تھے، ذہن نہایت سلیم تھا، حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ تیس پینتیس برس پہلے حدیث شریف کی کتابیں پڑھی تھیں، مگر موقع آجاتا تو متن اور اسناد کے ساتھ روایت پیش کر دیتے،

فیاضی اور سیر چشمی میں اپنے نانا کے نظیر تھے، امیر فقیر، بچہ، بوڑھا جو آتا اس کو کچھ دئے بغیر نہ رہتے، اور دیتا بھی وہی جو اس کے مناسب حال ہو، اور دیتے بھی اس طرح سے کہ ایک ہاتھ سے دیں دوسرے کو خبر نہ ہو، ان کے بچوں کو معلوم نہ تھا کہ بیوی کو کیا دیا اور بیوی کو معلوم نہ تھا کہ بیٹی کو کیا دے آئے، اسی پر باہر والوں کا قیاس کرو، بڑی خصوصیت ان کے دینے کی یہ تھی کہ دیتے اس طرح سے تھے کہ لینے والے کو شرمندگی ہوتی، اور اسکو بغیر لئے نہ بن پڑتا، دینے کی اور کوئی تدبیر بن نہ پڑتی تو جس کسی کو کچھ دینا ہوتا، اس کی کسی شکستہ اور بوسیدہ چیز کی تعریف کرتے اور کہتے کہ یہ مجھے بہت پسند ہے، میری فلاں چیز سے بدل لیجئے، وہ کہتا بدلنے کی کیا ضرورت ہے، آپ اس کو یونہی قبول فرمائیے تو اسکو نہ مانتے اور بدل کر چھوڑتے اور اس کو دوسرے وقت کسی اور حاجتمند کو دیدیتے،

دسترخوان وسیع تھا، اور مزیدار کھانوں کے تیار کرانے کا شوق تھا، اپنے باورچی خانہ میں ہر روز طرح طرح کے کھانے پکائے جانے کا حکم دیتے، علاوہ اس کے شہر میں جہاں کہیں ہوشیار رکابدار آجاتا بلا کر اس سے پکواتے یا عرب و عجم سے کوئی سیاح آجاتا اس سے ترکیبیں پوچھتے اور پکانے کی فرمائش کرتے، اور بے تکلف دوستوں کو مدعو کر کے خود بہت کم کھاتے، مگر دوسروں کو اصرار کر کے کھلاتے،

مرنے سے تقریباً پندرہ سال پہلے مجھ سے شناسائی ہوئی اور وہ یوماً فیوماً اتنی بڑھی کہ انکو بغیر مجھ سے ملے

خواجہ صاحب کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میر کی ہے، قصیدہ کی طرف مائل نہیں ہوئے اس واسطے کہ جس مرتبہ کے وہ آدمی تھے، اس کو بھٹئی سے کیا نسبت، غزلوں کا دیوان بقول

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۷) چین نہ آتا تھا، ہر روز ایک دو بار خود تشریف لاتے اور گھڑیوں بیٹھتے اور اس فکر میں رہتے کہ مجھکو اپنے ساتھ لیجائیں،

گھر میں اگر کبھی کسی کو چھینک آگئی اور ان کو معلوم ہو گیا تو فوراً تشریف لاتے اور کہتے کہ چلئے فلاں مریض کو دکھانا ہے، وہاں پہنچتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ علمی اذکار یا کھانے پینے کے شغل میں سارا وقت کٹ جاتا اور کسی مریض کے دیکھنے کی نوبت نہ آتی، اور کچھ بہانہ نہ ملتا تو حسب معمول صبح سے آکر مطب میں بیٹھ جاتے، جس وقت بھیڑ چھٹ جاتی. کہتے کہ میں نے فلاں کتاب نئی منگوائی ہے، چل کر دیکھو یا میں نے تمھارے لئے خاص کر فلاں فلاں کھانے پکوائے ہیں، غرضکہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ لیجانے کا تلاش کر لیتے، مگر باوجود اس کے کہ ہر وقت یکجائی رہتی دور باش ادب کا رکھ رکھاؤ اخیر وقت تک اتنا قائم رکھا جس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا، میں ان سے عمر میں چھوٹا اور فضیلت علمی میں کم پایہ تھا، مگر محبت کا قانون سب سے نرالا قانون ہے، خدا جانے کیوں وہ میرا ادب کرتے تھے گاڑی میں کبھی میرے برابر نہیں بیٹھے مکان میں تکیہ سے لگ کر نہیں بیٹھے، میرے سامنے کبھی ننگے سر نہیں بیٹھے، کبھی لیٹے نہیں کبھی بغیر سہارے بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو دوسرے کمرے میں چلے جاتے وہاں تھوڑا سا آرام کر کے پھر آکر بیٹھ جاتے، مرض الموت میں بھی باوجود شدت تنفس کے جس وقت میں جاتا گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرتے اور خود نہ اٹھ سکتے تو آدمیوں کو حکم دیتے کہ وہ اٹھا کر بٹھا دیں، میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس وضعداری کو اب ترک کر دیں، مگر نہیں مانا، صرف اس وقت لیٹے جب سکرات کی حالت میں اٹھ نہ سکتے تھے، اور حیف صد ہزار حیف کہ گنج خوبی ۸ محرم ۱۳۳۶ھ کو پیوند زمین ہو گیا،

مرحوم کو خواجہ میر درد سے بہت عقیدت تھی، ان کی تصنیفات جہاں تک مل سکیں، نالۂ درد، آہ سرد، سوز دل، شمع محفل ایک مجموعہ میں، علم الکتاب جو مجلد ضخیم ہے، دیوان فارسی اور مجموعۂ رباعیات فارسی اپنے صرف سے، ان کے والد کی کتاب نالۂ عندلیب دو جلدوں میں سرکار عالیہ بھوپال سے لکھ کر چھپوائیں، ان کے علاوہ دیگر

میر حسن کے مثل دیوانِ حافظ کے سراپا انتخاب ہے، تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میر و مرزا کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے،

خواجہ صاحب نے ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ روز جمعہ اڑسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی، دلّی میں ان کا مرقد منور ترکمان دروازے سے باہر زیارت گاہِ خاص و عام ہے،

ہوگیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
ذکر میرا تو وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا
میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات — پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

ان بتوں نے نہ کی مسیحائی تو — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

دردؔ ہم کو یہ رات دن تیرا — نالۂ زار خوش نہیں آتا

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۸) مصنفین کی بہت سی کتابیں چھپوائیں، خود بھی صاحبِ تصنیف تھے، اردو و فارسی کلام کا مجموعہ طرازِ عشق اردو شعرا کے کلام کا بہترین مجموعہ اور مجموعۂ رسائلِ تصوف بار بار چھپوا کر تقسیم کئے تھے،

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا
میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو در گذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

ہے کوتہی اجل کی طرف سے وگرنہ میں
اک عمر سے اسیر ہوں زلفِ دراز کا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا درد بس
جی میں نہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس کو بھی
جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لئے
اے چشمِ اشکبار یہ کیا تجکو ہو گیا

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا
ہم رو سیاہ جاتے رہے نام رہ گیا
یا رب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرا ہے
غم رہ گیا کبھو، کبھو آرام رہ گیا
سو بار سوزِ عشق نے دی آگ پر ہنوز
دل وہ کباب ہے کہ جگر خام رہ گیا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا　　یعنی کبھو تو اپنے بھی دل تھا دماغ تھا

جائیے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ　　اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو　　ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر　　مگر یہ زندگیِ مستعار رکھتے ہیں

مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کیے　　جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھکر کہیں

جو اہلِ دید ہیں انھیں گلشن میں جا نہیں　　نرگس کی گو کہ آنکھیں ہیں پر سوجھتا نہیں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں　　دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں　　دل میں ہو وہ ہی وفا پر جی وفا کرتا نہیں

نہیں شکوہ مجھے کچھ بیوفائی کا تری ہرگز　　گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو　　کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

اپنے بندہ پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
پر نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو
نہ کہیں عیش تمھارا ابھی منغص ہو جائے
دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی کا سنگ ہو

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا
میں بے صبر اتنا ہوں وہ تندخو ہے

کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے
تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اگلے معانقے کو اگر کیجئے معاف
لگ جائیے گلے سے مکافات کیلئے

اس طرح سے یک بخت جو آنسو نہیں تھمتے
معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

تیری گلی میں، میں نہ چلوں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کی کیا چلے

روندے ہے مثلِ نقشِ قدم خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجے کیونکہ　　ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف　　جس کے ہاتھ آئے جام سو جم ہے

رباعی

اے درد یہ درد جی کا کھونا معلوم　　جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن　　میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

سید محمد میر سوز

میر تخلص جوانے است بسیار اہل خوش طبع، ہر چند طرز علیحدہ دارد، لیکن از خوش کردن تخلص من نصفت دلم ازو خوش است (از نکات الشعراء)

"بسیار نازک طبع، زود رنج، نکتہ سنج، مردے عجیب ہست و تخلصے غریب، موجد طرز علیحدہ، شعر را با دائے نادر کہ دست و چشم بلکہ تمام اعضا در حرکت می آیند می خواند، و مردمان نافہم را متوجہ جانب خود می گرداند" (از طبقات الشعراء)

در عہد خود از جملہ ادابندان ممتاز طرز ولایۂ ملک اوست و خواندن اشعارش از زبان او نیکو از خواندنش چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید" (از تذکرہ میر حسن)

سید محمد میر نام، سوز تخلص، میر ضیاء الدین کے بیٹے، اور قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی، تعجب ہے کہ گلشن بیخار میں انکو لکھنوی لکھا ہے ایک طرح سے یہ بھی سچ ہے کہ یہ لکھنؤ میں آکر پیوند خاک ہوئے ہیں۔

خط شفیعہ اور نستعلیق خوب لکھتے تھے، شہسواری اور تیراندازی میں خوب ماہر تھے، ورزش کرتے تھے، اور طاقت خداداد ایسی تھی کہ ہر ایک ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا، شعر و سخن کا شوق بچپنے سے تھا، پہلے میر تخلص کرتے تھے، جب میر تقی میر کی شہرت نے میر کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تو اُنھوں نے سوز اختیار کیا،

آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے ان کو پاؤ شاعر مانا ہے، ایک خود، ایک مرزا رفیع سودا، آدھے خواجہ میر درد، پاؤ میر سوز، یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، خواجہ میر درد کے حال میں اس کو میں لکھ چکا ہوں،

ہاں اس میں شبہہ نہیں کہ میر سوز کی شاعری کو اس زمانہ کے شعرا خاطر میں نہ لاتے تھے، میر صاحب کا قول "دیکھو ہر چند طرز علحدہ دارد" میر حسن کی بھی سنو وہ کیا کہتے ہیں "از خویش چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید" شیفتہ نے کھل کر کہدیا ہے "کلامش از جادۂ مستقیمہ شعرا برکراں" مگر انصاف یہ ہے کہ آزاد کی رائے اس میں بے لاگ ہے، وہ کہتے ہیں کہ میر سوز کی زبان عجب میٹھی زبان ہے، اور حقیقت میں غزل کی جان ہے، ان کی انشا پردازی کا حسن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے، البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے

شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی تو میر سوز بھی گھبرا گئے، سیدھے فرخ آباد گئے، اور نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں کچھ دنوں زندگی بسر کی، اس کے بعد لکھنؤ آئے مگر رنگ نہیں جما، مرشد آباد گئے، وہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی، پھر لکھنؤ واپس آئے، اب کی تقدیر چمکی، نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہو گئے، چند روز آرام سے نہ گذری تھی کہ سنہ ۱۲۱۳ھ میں ستر برس جی کر دنیا سے گذر گئے،

اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یا رب رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

قتل سے یہ بے گنہ راضی ہے اپنے اس لئے
ہاتھ میں اک روز تو دامانِ قاتل ہوئیگا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا
جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کریگا

سوزؔ کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو
وہاں تجھے کیا تھی کمی یہاں تجکو کیا درکار تھا

یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا
نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سے کچھ باور نہیں آتا

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ
دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا
تڑپنے کے سوا آرام مجھ سے ہو نہیں سکتا

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر
سوزؔ کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص ہے عاشق کہیں
عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

منھ دیکھو آئینہ کا تری تاب لا سکے
خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

اشکِ خوں آنکھوں میں آ کر جم گئے
دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

جوں خضر ہوس عمرِ ابد کی نہیں مجکو
اس دم کی تمنا ہے جو تجھ پاس گذر جائے

پرکار کی روش پھرے ہم جتنے چل سکے
اس گردشِ فلک سے نہ باہر نکل سکے

شیخ قیام الدین قائم

"بسیار آدم بامزہ و اہلِ درد، متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، خوش مقال و در سخن باکمال، از خوش خیالانِ زمان و بلند فطرتانِ جہان، فکر رسا دارد و در نازک خیالی و معنی یابی دادِ سخنوری می دہد" (اھ طبقات الشعراء)

"در پختگی کلام و چستی مصراع غزل و رویہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استادان راہ می رفت، بلکہ بعضے مقام رجحان می جست" (اھ تذکرہ مصحفی)

قیام الدین علی نام تھا، قائم تخلص، چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، مگر ملازمت

کے تعلق سے زندگی کا بیشتر حصہ دلّی میں بسر ہوا، توپ خانہ میں اسامی تھی، تحصیلِ علم کا حال معلوم نہیں، مگر اس قدر استعداد ضرور تھی کہ اپنی انشاپردازی میں خلل نہیں آنے دیتے، اور یہ جوہر اس زمانہ کے شریف خاندانیوں کے لئے عام تھا،

دلّی اس زمانہ میں آج کی سی دلّی نہ تھی، خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا، میر محمد تقی میر، سید محمد میر اثر، حکیم ہدایت اللہ وغیرہ جیسے اربابِ کمال کا جمگھٹا تھا اور شاعری کا ہنگامہ گرم تھا، ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، خواجہ میر درد کی خدمت میں آنے جانے لگے، چند روز ان سے فیضیاب ہو کر مرزا رفیع سودا کے شاگرد ہوئے، اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ ان کے طرز ادا کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

دلّی کی تباہی کے بعد وطن واپس آئے اور کچھ دنوں نواب محمد یار خاں[1] کے ساتھ ٹانڈہ

---

[1] نواب محمد یار خاں امیر تخلص، نواب علی محمد خاں مورث نوابانِ رامپور کے چوتھے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کے بھائی تھے، انولہ کے قریب ٹانڈہ ایک بستی ہے، وہاں بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا، میر سوز اور مرزا رفیع سودا کو فرخ آباد بلایا تھا، وہ نہیں آئے تو شیخ قیام الدین کو بلا کر سو روپیہ ماہوار انکے کر دئے اور ان سے مشق سخن کی، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، فدوی لاہوری، میر محمد نعیم پروانہ، علی شاہ، میاں عشرت، حکیم اکبر علی سنبھلی وغیرہ شعرا بھی ملازم تھے اور رات دن شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، ان کے حکم سے عاقل خاں مصور نے ایک مرقع تیار کیا تھا، جس میں نواب اور ان کے حاشیہ نشین شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں،

مرہٹہ گردی میں یہ تمام لوگ بنات النعش کی طرح منتشر ہو گئے، اور نواب کو فیض اللہ خاں رامپور لے گئے اور پچاس ہزار سالانہ ان کی جیب خاص کے لئے مقرر کر دیا، سنہ ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی،

بیٹھے بٹھائے کوچۂ قاتل میں لے گیا   یارب برا ہو اس دلِ خانہ خراب کا
ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے   ہم دل جلوں میں آپ مزا ہے کباب کا
گر وقتِ ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا   پیارے کسی کا ہاتھ، کسی کی زباں چلے

میں زندگی بسر کی جب اُن کا بھی کام بگڑا تو رامپور چلے گئے، اور احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اسی پر قناعت کی، جب تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آ گئے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام لے گئے، لوٹے اور ملکیتیں جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرا لیا،

اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے اور وہیں سنہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کر گئے،

قسمت کو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

غیر سے ملنا تمہارا سُن کے گو ہم چپ رہے
پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون
پیامبر کے نہیں ساتھ آپ جانا تھا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنے قائم
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

ظالم تو مری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے میں اور آپ ہی من گیا

قائم ضرور کیا ہے اب اُس جنگجو سے صلح
مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفانِ گریہ کی ہے مرے حدِ عمرِ نوح
دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اُتر گیا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم
کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

جلوہ ہر رنگ میں ہے اُس بتِ ہرجائی کا
یہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی
اس سے جو کوئی جیا تو مر کر

تم کو کیا قدر ہے اے دیدہ مرے رونے کی
ایک بوند آتی ہے سو خونِ جگر سے باہر

جو سوزِ عشق کا چرچا وہاں نہیں قائم
تو کیا میں جاؤں لگا دینے بہشت میں آتش

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

مجھ سا جہاں میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

تنگ تو ہم کو تو اے جیب کرے ہی لیکن
اُٹھ گیا ہاتھ گر اپنا تو پھر اک تار نہیں

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی
سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

جورِ سپہر، دوریِ یاران و روے غیر
جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

ایک مدت سے یہاں وہ تو موا پھرتا تھا
آج تم مرنے کا عاشق کے عجب کرتے ہو

تھا بد و نیک جہاں سے میں عدم میں آزاد
آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھکو

اس حسنِ نیرنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ
ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

دامانِ گل تئیں ہے کہاں دسترس مجھے
تکلیفِ سیرِ باغ نہ کر اے ہوس مجھے

بعد خط آنے کے تھا اُس سے وفا کا احتمال
ایک واں تک عمر نے اپنے وفاداری نہ کی

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پہ اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

خدا نہ کردہ اُسے غیر سے نہیں سروکار
تھی ایک بات ہمارے ہی یہ جلانے کی

کسی بلا میں پھنسے قید ہوئے جان سے جائے
پر آدمی کو خدا تجھ پہ مبتلا نہ کرے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم   مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

یشیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم   پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

دل ڈھونڈنا سینہ میں عبث ہے بوالعجبی ہے   اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

گو ہم[۱] سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے   کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

پھرے زمانہ جہاں تک ہے ہم سے یا نہ پھرے   کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

مر جائیے کسی سے پر الفت نہ کیجئے   جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

فلک جو دے تو خدائی بھی اب نہ لے قائم   وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

تا بفلک نالہ تو پہونچا تھا رات   میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

انعام اللہ خاں یقین

"جوانے بود خوش رو و خوش گو، خوش خلق و قابل منظور نظر و تربیت کردۂ مرزا مظہر مرحوم"

---

[۱] حسرت کے مطبوعہ دیوانِ قائم میں یہ شعر اس طرح ہے،

ہم سے ملے نہ آپ تو ہم بھی نہ مر گئے   کہنے کو رہ گیا یہ سخن دن گذر گئے

در عین عنفوان جوانی پدرش نسبت تقصیرے کہ از یقین بوقوع آمدہ باشد گشت یقین است کہ مغفور شدہ باشد (درہ طبقات الشعراء)

"بے اغراق ریختہ گوئی بر طاق بلند گذاشتہ و تخم معنی در زمینِ سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سرزدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری است" (درہ تذکرۂ فتح علی شاہ)

"در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ راشستہ و رفتہ این جوان بود، بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ، چنانچہ خود می گوید:-

حق کو یقین یارو برباد مت دو آخر
طرزِ سخن کے اس کے تم نے اڑائیاں ہیں ٹکڑے

انعام اللہ خاں نام تھا، یقین تخلص، نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے حضرت شیخ عبد الاحد سرہندی کے پرپوتے اور جناب مرزا مظہرؒ کے شاگرد رشید تھے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام کے زور میں وہ دوسروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، میر صاحب ان سے بہت خفا ہیں، نکات الشعراء میں لکھتے ہیں:-

"القصہ پوچ پوچ چندے کہ بافتہ است کہ با دشمانیز توانیم بافت ایں قدر بخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت بر زمین می گذارد، بعد از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقہ سخن فہمی مطلق ندارد"

میر صاحب کی زبردستی دیکھو، یقین کا دیوان ان کی سخن گوئی کی زندہ شہادت ہے، ایسے سخن گو کی سخن فہمی کا انکار کرنا میر صاحب کی زبان سے اچھا نہیں لگتا، اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کچھ لوگ سرے سے یقین کے کلام کو مرزا صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یقین کو شعر کہنا ہی نہیں آتا تھا، محمد حسین کلیم نے اس شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے،

یقیں کے شعروں پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے نہیں
غلط ہی ہم نے بوجھا ہے گا مرزا جانِ جاناں کو

مگر میر صاحب نے باوجود ناراضی کے اس سے انکار کیا ہے: وہ فرماتے ہیں:-

"مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ می دہد و وارث شعرہائے ریختۂ خود گردانیدہ"

قبول کردن این مغیش بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز بہ وارث می رسد الا شعر، مثلاً کسے کہ بہ شعر پدر خود یا بر مضمون او متصرف شود ہمہ کس او را دزد خواہند گفت تا بہ شعر استاد چہ رسد۔"

مصحفی کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۵ برس کے سن میں یقین کا کلام تمام ہو گیا، اگر جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا ہوں کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا،

کلام ملاحظہ ہو :-

ہر گھڑی صحرا نشینی پر نہ کر جرأت یقین
آگئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

اتنا کوئی جہاں میں کوئی بے وفا نہ ہو
ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقین ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ
یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

غنیمت مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا واعظ
کہ میں تو مست تھا اس کو بھی کیا شعور نہ تھا

فصلِ گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقین
اب کی چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقیں کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

ناصح سے مجکو غم نے کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

یہ سینہ عشق سے محرومِ درد و داغ نہیں
ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

یقیںؔ مارا گیا جرم محبت پر نہ ہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اسکو کہتے ہیں

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح
خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کہیں

روداد محبت کی، مت پوچھ یقیںؔ مجھ سے
کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہو یا فسانہ

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر
کرنے کو کی، پہ راس نہ آئی وفا مجھے

عشق میں ملتی نہیں راحت مگر جوں کوہکن
جانِ شیریں دیجئے تب خوابِ شیریں کیجئے

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

یقین کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ تو ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہیئے

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچے کا
چمن پر یہ کیا ستم کرتا ہے اے بادِ صبا کوئی

شبِ ہجراں کی وحشت کو تو اے بیدرد کیا جانے
جو دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے

گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح
ہمارے ہاتھ جائیں اور ہمارا پیرہن جانے

خطا ہے مفت مر کر یار کیوں دیجئے رقیبوں کو
ہماری ہم سے پوچھو، کوہکن کی کوہکن جانے

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
جی ہی لے کر چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

یقیں جاتا رہا گر بلبلوں کے ہاتھ جانے دو
کوئی اس بے مروت دل کو اپنے پاس کیا رکھے

پڑیں پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بےکس
مرے فرہاد اور پرویز شیریں کو اٹھا لائے

یقیں ہوا مجھے قطرہ سے اشک کے معلوم
نہ اُٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہوئے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

خواجہ احسن اللہ بیانؔ

"شاعر عذب البیان از خوشگویانِ زمان خواجہ حسن اللہ المتخلص بہ بیان: از تلامذہ مرزا مظہر جانِ جاناں، مولدش شاہجہان آباد، احال معلوم نیست کہ کجا است زیج نامہ از و مشہور است خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد" (از تذکرہ میر حسن)

خواجہ احسن اللہ نام بیان تخلص، اصلی وطن اکبرآباد تھا، دلی میں پیدا ہوئے، اور مرزا مظہر جانِ جاںجاناں علیہ الرحمہ کے آغوشِ تربیت میں ان کی شاعری نے ترقی کی، مولانا فخرالدین دہلوی کے مرید تھے، آخر عمر میں حیدرآباد گئے، اور نواب آصف جاہ ثانی کی سرکار میں عزت سے زندگی بسر کی،

خوش خلق، پاکیزہ سیرت، ظریف طبع اور لطیف مزاج تھے، دوستوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے، اور جو ایک بار ان سے ملتا وہ ہمیشہ ان سے ملنے کا متمنی رہتا،

۱۲۱۳ھ میں وفات پائی، اور حیدرآباد میں مدفون ہوئے، ان کے شاگرد راے گلاب چند ہمدم نے تاریخ کہی، "استاد از جہاں رفت"

ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے، اور ہندوستان میں بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے،

ان کے کلام کے دیکھنے سے پرانے تذکرہ نویسوں کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب اصولِ شاعری سے باخبر، خوش گو، تیز طبع اور مشاق سخنور تھے، ان کے کلام میں نمکینی رنگینی اور ایسے غضب کی ہے کہ شعر کو پڑھ کر دل تڑپ جاتا ہے، دور از قیاس استعاروں اور پیچیدہ بندشوں سے کلام پاک صاف ہے، اور سادگی میں بھی اسکا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قرباں کردی جائیں

کب تلک اس کی شکایت نہ ہو لب آشنا
ایک بیگانہ ہی مجھ سے اور سب سے آشنا

کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا
سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

کیوں آج سماتا نہیں سینہ میں خوشی سے
پہنچا ہے مگر دل! تجھے پیغام کسی کا

خانماں کچھ ہم بھی رکھتے تھے کبھو لیکن بیاںؔ
اب یہی در ہے یہی گھر خانۂ الفت خراب

تو بزم سے اُٹھا تو ہوئی تلخ مے کشی
میں سچ کہوں شراب کو سمجھا حرام آج

کہتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہنچ
کانوں تلک تو اس کے تو اے نارسا پہنچ

ہمارا ضعف بصارت ہے مانعِ دیدار
وگرنہ سامنے آنکھوں کے یار ہے موجود

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آ سکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاںؔ اب مجھکو اپنی آہ پر

ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

صاف منھ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اُسکے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں دل ہی میرا جس کے پاس

جانے دے مجھکو اے ہوسِ سیرِ گلستاں
اب اس چمن سے اپنے غم آباد کی طرف

ہووے گا ذوقِ حسرتِ دیدار میں خلل
شیریں! گذر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

ہوئی آہ اب اس قدر نارسا
کہ سینے سے آتی نہیں لب تلک

تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی
مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو تو کافر ہوں

کافر ہو جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو
اک مختصر سی جا ہو، میں ہوں بس اور تو ہو

قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے
اُسے کہتے ہیں جیتا جو کوئی یاں نقدِ جاں ہارے

رسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشمِ تر مجھے
آنا ہے اُس کی بزم میں بارِ دگر مجھے
آیا ہوں اُس گلی سے ابھی دم نہیں لیا
پھرنے چلا ہے یہ دلِ وحشی اودھر مجھے

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی
اب ہجر میں کہتا ہے کہ تھا وصل میں آرام
نالاں ہی یہاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

ہزاروں قصرِ جنت کے برابر میں سمجھتا ہوں
اگر گردونِ دوں آسودہ زیرِ خاک رہنے دے

فرشتوں کی عبادت کا مصلّی ہے مرا دامن
اگر آلودگی دنیا کی اس کو پاک رہنے دے

شبِ فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے
یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے

جاتا ہے یار کچھ تو بتاں منھ سے بول لے
اے بے نصیب مانعِ گفتار کون ہے

خدا تجھے مرے آغوش سے جدا نہ کرے
یہ بات کہتے ہی دھڑکے ہے دل خدا نہ کرے

کیجیے عرض حال گو کچھ ہو
نہیں رہتی زبان پر آئی

کیا ہوا عرش پر گیا نالہ
دل میں اس شوخ کے تو راہ نہ کی

میر محمد باقر حزیںؔ

"میر محمد باقر حزیںؔ تخلص، شاعرِ ریختہ ست صاحبِ دیوان از نصیریانِ مرزا جانجاناں مظہر شنیدہ می شود کہ بنگالہ رفت۔" (از نکات الشعراء)

"طبع رسا و فکرے والا داشت و در ملکِ سخنوری علم شاہی می افراشت، غنچۂ استعدادش از نسیمِ انفاسِ مرزا مظہر شگفتہ بود" (از تذکرۂ فتح علی شاہ)

میر محمد باقر نام تھا، حزیںؔ تخلص، دہلی کے رہنے والے، اور جناب مرزا مظہر علیہ الرحمہ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، مرزا صاحب کو بھی ان سے بے حد لطف تھا، دیوان میں جہاں کہیں اُستاد کا ذکر کرتے ہیں، اس سے اُن کے اخلاص و عقیدت اور مرزا صاحب کے

لطف و کرم کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیں
حضرتِ استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :-

اے حزیں شکر کہ ہے مصحفِ اربابِ جنوں
فیض سے حضرتِ استاد کے دیوان میرا

افسوس ہے کہ مصائبِ روزگار سے تنگ آکر اُنھیں آخر کار دِلّی چھوڑنا پڑا، عظیم آباد پہنچے، وہاں نواب صولت جنگ نے ان کی قدردانی کی، اور انہی کی سرکار میں فراغت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ اب تک کسی تذکرے میں ان کا سنہ وفات میری نظر سے نہیں گذرا، دیوان ان کا کہیں کہیں پایا جاتا ہے جس میں قصائد اور غزلیں ردیف وار موجود ہیں،

غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت معنی یاب و فکر رنگین رکھتے تھے، اور سوز و گداز کی چاشنی اس میں کسی سے کم نہیں،

خوب سوجھا ہے مزا عشق میں رسوائی کا
معتقد دل سے ہوں اس دل کی میں دانائی کا

یہ کہہ کر باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت
لکھا تھا یوں کہ فصلِ گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جورِ یار آخر
ہمیں رنج و الم سے ہو گئی صحبت برآر آخر

نہ ہو اے باغباں بلبل کو مانع گل کے ملنے سے
نہیں رہنے کی گلشن میں بہار آخر سدا ہرگز

آتی ہے نو بہار دھڑکتا ہے دل کہ ہائے
پھر شور و شر کرے گا یہ خانہ خراب دل

فصلِ گل آخر ہوئی کیا دیکھ ہونگے شاد ہم
کچھ کر اے صیاد اب ہونگے نہیں آزاد ہم

بیوفائی دیکھ کر ان خوش نگاہوں کی حزیں
اب کسی سے اس طرح ملنے کو میرا دل نہیں

آرزوئیں عشق کی ہوتی نہ دیکھیں سربراہ
کوہکن بھی سر ٹپک کر مر رہا آخر وہیں

جس دن سے میں سنا ہی کہ آخر ہوئی بہار
اس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

نہ وصل میں اُسے راحت نہ ہجر میں آرام
کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں

کچھ کہا شاید اُس نے قاصد سے
دل پہ میرے وہ اضطراب نہیں

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہی دیکھ
اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

کچھ کٹے ہجر میں، کچھ وصل میں گھڑیاں گذرے
کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گذرے

ہر نصیحت میں تری مانونگا اے ناصح پہ ایک
دلبروں کے دیکھنے میں دل مرا ناچار ہی

میں چاہتا ہوں عشق چھپاؤں پہ کیا کروں　　رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشمِ تر مجھے

راحت میں دل کے ہاتھ نہ پاؤنگا ایک دم　　جب تک کہ میرے ساتھ یہ خانہ خراب ہے

حیرتیں میں درد دل کا کس طرح ظاہر کروں اس سے　　مجھے کہتا ہی تیری بات مجکو خوش نہیں آتی

وفا میری اگر جور و جفا تجکو نہ سکھلاتی　　تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ

،، ہدایتؔ تخلص از دہلی است، ریختہ را بہ طرز می گوید، از یاران خواجہ میر دردؔ است، اگرچہ ظاہر بہ عجز و انکسار پیش می آید، اما کمیت خامہ او در عرصۂ میدان سخن بال بستہ راہ می رود،، اھ (عقد ثریا)

،، مشتاق قدیم معاصر و ہم طرح محمد قائمؔ شریک دور میرؔ و مرزاؔ شاگرد بلکہ مرید خواجہ میر دردؔ نور اللہ مرقدہٗ، شخصے است بسیار حلیم و سلیم، شعر را بسیار بہ فصاحت می گوید، عمرش از شصت متجاوز خواہد بود، صاحب دیوان است،، (اھ تذکرہ مصحفیؔ)

ہدایت اللہ نام، ہدایتؔ تخلص تھا، خواجہ میر دردؔ کے فیضانِ صحبت سے دل کو روشن کیا اور شعر و سخن کی مشق بھی انہی سے کی، طبابت میں نام بر آوردہ تھے، میر قدرت اللہ خاں قاسمؔ ان کے شاگرد رشید تھے، ۱۲۱۵ھ میں واصل بحق ہوئے، علاوہ دیوان ریختہ کے بقول مرزا لطفؔ ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے،

نہ رحم اُس کے ہی جی میں، نہ دل میں اپنے صبر　　ہماری گذرے گی کیونکر الٰہی کیا ہو گا

دیکھ اس کی چشم مست کو دل تو بہک گیا بس میری جان وہ ہی پیالوں میں چھک گیا
دیکھا نہیں ہے ہم نے ہدایت کو ان دنوں شاید کسی جگہ یہ دل اس کا اٹک گیا

ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں کسی نے خوب کہا ہے موا سو چھوٹ گیا

آیا ہوں تنگ کشمکشِ دامِ زلف میں یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا
بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں میں اتنی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

اک دن بھی مہرباں نہ وہ بے وفا ہوا اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا
کیا تیغِ قاتل نے جب کام اپنا میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

کس دل جلے کی خاک سے گذری ہے چمن میں آج دیکھا عرق فشاں میں نسیم بہار کو

تجھ بن تو چاہتا نہیں جی سیرِ باغ کو لگتی ہیں ٹھیس نکہتِ گل سے دماغ کو

تم نہ فریاد کسی کی، نہ فغاں سنتے ہو
اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو

کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سے
گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یاں رہے

کیا کہوں میں کہ ترے ہجر میں کیونکر گذری
وہی جانے ہے مری جان کہ جس پر گذری

دن جو گذرا تو گیا روز قیامت سے دراز
رات گذری تو شب ہجر سے بدتر گذری

میر محمد بیدار

"قریب چہاردہ سال شدہ باشد کہ فقیر او را در لباس درویشی در شاہجہان آباد دیدہ بود۔ طبع دردمند داشت، باریک و سخنی، بہ زیور حلم و حیا آراستہ، معلوم نیست کہ الحال کجا است۔"

(از تذکرۂ میر حسن)

میر محمد علی نام بیدار تخلص، مگر شہرت میر محمدی کے نام سے ہوئی، دلی وطن تھا، وہیں نشو و نما بھی ہوا، مرتضیٰ قلی بیگ فراق سے فارسی، اور حضرت خواجہ میر درد سے اردو میں مشق سخن کی، پھر مولانا فخر الدین دہلوی کے فیضان صحبت سے بہرہ ور ہوئے، اور طریقۂ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی ورزش کرنے کے بعد خرقۂ خلافت پہنا، جب تک دلی میں رہے، عرب سرائے میں قیام تھا، ہر روز اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں آتے جاتے تھے، آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے، اور وہیں کٹرہ دندان فیل میں سکونت اختیار کر لی، دو دیوان یادگار چھوڑ کر ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ع میں وفات پائی اور آگرہ میں مدفون ہوئے، میر و مرزا کے ہمعصر تھے، جب انھوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدار نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ

بہ قدر مناسب شامل کر کے اپنے طرزِ کلام کو علیحدہ کر لیا، ان کے اشعار دلآویزی کے باعث اب تک لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں، ع

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است

واہ وا اے دلبرِ کج فہم یوں ہی چاہئے   ہم سے ہونا آشنا، غیروں سے ہونا آشنا

ترے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار   گل جدا، سرو جدا، نرگسِ بیمار جدا

کس کس کا دل نہ شاد کیا تو نے اے فلک   اک میں ہی غمزدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا
بیدار راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی   صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

کروں ہوں شاد دل اپنا ترے تصور سے   اگر یہ شغل نہ ہوتا تو کیا کیا ہوتا،

اے شانہ کھولیو گرہِ زلف دیکھ کر   دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا

چھوڑ کر کوے بتاں جاتا ہی تو کعبے کو   جلد پھریو تجھے بیدار خدا کو سونپا

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک   دل سے نہ ترے غبار نکلا

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجئے گا   ایک ملنے کو نہ کم کیجئے گا

دامن کو ترے نہ پہونچے اب تک ہرچند غبار ہو گئے ہم

نے پر پرواز ہے بیدار نے فصلِ بہار کس توقع پر قفس سے ہوویں اب آزاد ہم

یہ بھی کوئی وضع ہے آنے کی جو آتے ہو تم ایک دم آئے نہیں گذرا کہ پھر جاتے ہو تم

صورت اُس کی سما گئی دل میں ئو آہ کیا آن بھا گئی دل میں ئو

ہم تری خاطرِ نازک سے حذر کرتے ہیں ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

شکوۂ کم نگہی آنکھوں سے اس کی نہ کرو گفتگو خوب نہیں مردمِ بیمار کے ساتھ

اب تک مرے احوال سے واں بیخبری ہے اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

کس باغ سے آتی ہے بتا مجکو کہ یہ آج کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیمِ سحری ہے

ربط جو چاہیے بیدار سو اُس سے معلوم مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

مردمِ چشم سے پوچھ اے مہِ تاباں تجھ بن کون سی شب نہیں گذری مجھے روتے روتے

کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہہ تو
جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

جام و مینا و مے و مطرب و ساقی ہمراہ
اس سرانجام سے بیدار کہاں جاتا ہے

بیدار کیونکر آتشِ دل اشک سے بجھے
ظاہر کی آگ ہووے تو پانی بجھا سکے

نے میکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا
محوِ خیالِ یار رہے ہم جہاں رہے

میر قدرت اللہ قدرت

''مردے ست از متوسلانِ میر شمس الدین فقیر درویش وضع، خلیق طبع، رتبۂ قدرش رفیع، وشیوۂ معانیش بدیع، سمندِ طبعش در میدانِ فارسی و ہندی چالاک وچست وتصویرِ بے نظیر معانیش در استخوان بندی الفاظ درست، بندہ وے را ایک بار در مشاعرۂ لکھنؤ دیدہ ام،''

(از تذکرۂ میر حسن)

میر قدرت اللہ نام، قدرت تخلص، میر شمس الدین فقیر کے عزیز قریب اور شاگرد رشید تھے دلی وطن تھا، اس کی تباہی کے بعد چندے ادھر اودھر پھرے، آخر کار مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی، وہاں کے امرا و شرفا نے اعزاز و اکرام سے ان کا خیر مقدم کیا، اور بہت فارغ البالی سے زندگی بسر کی،

میر تقی میر شاید ان سے ناخوش ہیں، فرماتے ہیں،'' او عاجز سخن است، لیکن برائے خاطر میر عارف، کہ از یاران درست فقیر است نوشتہ شد'' اس کے بعد ایک شعر نکات الشعراء میں

درج کیا ہے، ممکن ہے کہ قدرت کا بہترین کلام میر صاحب تک نہ پہنچا ہو، یا اُن کی کسی بات پر چڑھ گئے ہوں، اور ان کو یارانِ بزم میں شریک کرنا پسند نہ کرتے ہوں، قدرت کے قادر الکلام ہونے میں کچھ شک نہیں، ایسے شخص کو عاجز سخن کہنا میر صاحب کی زبردستی ہے، قدرت نے غالباً سنہ ۱۲۵ھ میں وفات پائی اور مرشد آباد میں مدفون ہوئے،

کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے
شاید تہ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا

جب مسیحا دشمنِ جاں ہو تو کب ہو زندگی
کون رہ بتلا سکے جب خضر بھٹکانے لگا

مجھکو غفلت نے خبر ایامِ فرصت کی نہ دی
آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

اوپر سے زخم گرچہ ہرے ہو چلے ولے
ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

یہ دلِ شوریدہ جب سے ساتھ ہے زیرِ زمیں
شورِ محشر ہی رہا قدرت کی مشتِ خاک پر

شایستۂ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا
اے وائے میں قدرت نہ ادھر ہوں نہ ادھر ہوں

زخم پر زخم لگے تب ہو تسلّی دل کی
حوصلے پر مرے اک زخم کچھ افزود نہیں

تو بھی کم ابر بہاری سے نہیں اے چشم تر
کر دے اب رشکِ چمن خونِ جگر سے آستیں

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گذرے ہے
یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشم پرخوں ہے،

حسرت اے صبحِ چمن ہم سے چمن چھوٹے ہے
مژدہ اے شامِ غریبی کہ وطن چھوٹے ہے

سینہ اس کا ہے دل اس کا ہے جگر اس کا ہے
تیرِ بیداد جدھر رخ کرے گھر اس کا ہے

قطعہ

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا ہی ملکِ روم و کیا ہی سرزمینِ طوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے، یہ دارا ہے، یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنت دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہنِ جامِ مے پھر خرقۂ سالوس ہے

میر ضیاء الدین ضیاؔ

"ضیا تخلص، متوطن دہلی، جوانے است مہذب مودب متواضع بافقیر ربطے بسیار دارد۔" (اھ)

(نکات الشعراء)

"شعرِ پُر دردش بر جگر عاشقاں نشتر زارے است و برائے سوختگانِ عشق شرارے اکثر غزل در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامعقول را معقول ساختن کار اوست۔" (اھ تذکرہ میر حسن)

ضیاء الدین نام تھا، ضیاؔ تخلص، دلی کے رہنے والے اور مرزا رفیع سوداؔ کے ہمعصر تھے،

مگر معلوم نہیں مشق کس سے کی ہے،

دلّی کی تباہی کے بعد یہ فیض آباد چلے آئے تھے، کچھ دنوں وہاں رہے، اور کچھ دنوں لکھنؤ میں، اس کے بعد عظیم آباد پٹنہ میں جا کر بیٹھ رہے، گوشۂ عزلت کے دلدادہ تھے، آشنا پرست، درد مند، رنج و راحت میں ہمیشہ خوش رہتے، اصنافِ سخن میں سے غزل کو پسند کیا تھا، قصیدہ اور مثنوی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوئی، سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا شوق تھا، جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں،

عظیم آباد میں راجہ شتاب رائے کا بیٹا ان کی ضروریاتِ زندگی کا متکفل رہا، وہ ان سے مشقِ سخن بھی کرتا تھا، سنہ وفات کا پتہ نہیں چلا،

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگِ خلق
اس کے کوچہ میں ضیاؔ تو آج پھر جانے لگا

برس اے ابر جتنا چاہے تو اب، تیری باری ہے
کبھی دل تھا تو میں بھی رو رو اک دریا بہاتا تھا

رو دیں ہم بزموں کو کیا اپنے دنوں کے پھیر ہیں
شمع محفل تھے جو کل سو راکھ کے اب ڈھیر ہیں

رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ ہوس نہیں
ناصح یہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

آہستہ پاؤں رکھیو اے بوئے گل زمیں پر
سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

کسی دشمن کی بھی یارب گذرے شب جدائی کی
کہ جیسے اس سے میرے وصل کا یہ دن گذرتا ہے

رازِ دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں
بات منھ پر آرہی ہے اور لب ہلانا منع ہے

آہ آہ پیچ کر نہ کہیں دل تھلک پڑے
یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

رُباعی

کیا عیش و نشاط و شادمانی کرتے
کیا ناز و نیاز جاودانی کرتے
گر یار کے بیں اپنے ہوتا تو ہم
کیا خوب طرح سے زندگانی کرتے

دوسرا دَور

متوسطین شعرائے اردو کا

سیّد محمد میر اثرؔ

"درویشے است موقر، صاحبِ سخنے است موثر، عالم و فاضل، رتبۂ قدرش بہ غایت بلند و گوہرِ صدرش نہایت ارجمند، در خدمت برادرِ بزرگوارِ خود گوشہ نشینی اختیار کردہ و قدم بر جادۂ بزرگانِ خود نہادہ بسر می برد" (از تذکرہ میر حسن)

دیوان قلیل الحجم دارد ملاحظہ شد بعض خیالاتِ ایشاں بہ قصویٰ غایت دردمندانہ و دلپذیر، مطبوع واقع شدہ، مثنوی ایشاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ ہست" (از گلشنِ بیخار)

سیّد محمد میر نام تھا، اثرؔ تخلص، خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ کے بیٹے تھے، اور خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی، بڑے بھائی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی، اور انہی کے نقشِ قدم پر چلتے تھے، علوم و فنون اساتذۂ دہلی سے حاصل کئے تھے، تصوّف، موسیقی، حساب اور دیگر فنونِ ریاضیہ میں ان کا جواب نہ تھا،

فنونِ ریاضیہ کی تعلیم خواجہ احمد دہلوی سے پائی تھی، جو مرزا خیراللہ مہندس کے شاگرد تھے، یہ وہی مرزا خیراللہ ہیں جن کے اہتمام سے دلّی میں محمد شاہی رصد قائم ہوئی تھی، اور زیجِ محمد شاہی کے مصنف ہونے کی حیثیت سے وہ دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں،

میر اثرؔ نے اپنے بڑے بھائی خواجہ میر دردؔ کے بعد آبائی سجادہ کو زینت بخشی، اور مدت دراز تک اپنے ظاہری و باطنی کمالوں سے لوگوں کو فیضیاب کرتے رہے، تقویٰ، توکل، زہد و قناعت میں یہ کسی طرح اپنے باپ اور بھائی سے پیچھے نہیں رہے، تصوف و شاعری میں جو رنگ بڑے بھائی کا ہے وہی ان کا بھی ہے،

تصنیفات میں ایک دیوان غزلوں کا ہے، ایک مثنوی جو اپنے رنگ کی اردو میں پہلی مثنوی ہے اس کا نام خواب و خیال رکھا ہے، کہا جاتا ہے کہ نواب مرزا شوق نے زہر عشق، بہار عشق، وغیرہ مثنویوں میں اسی مثنوی کا تتبع کیا ہے، افسوس ہے کہ یہ مثنوی میری نظر سے نہیں گذری مرزا لطف نے کچھ اشعار اس کے اپنے تذکرے میں نقل کئے ہیں، مگر صحیح اندازہ کسی مثنوی کے حسن و قبح کا اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ایک پوری داستان پیشِ نظر نہ ہو، خواجہ محمد میر کی تاریخِ وفات مجھے نہیں ملی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ سے پہلے انھوں نے رحلت کی ہے۔

منتخب اشعار

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ — پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا
دیکھیں گے اُس کی سنگدلی کو ہم اے اثرؔ — گر کوئی نالہ ہم سے سر انجام ہو گیا

اُس سنگدل کے دل میں تو نالے نے جا نہ کی — کیا فائدہ جو اور کے جی میں اثر کیا

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر — مجکو میری وفا ہی راس نہیں
تو ہی بہتر ہے ہم سے آئینہ — ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے   پہ اثر کی تو ہم کو آس نہیں

عاشقی اور عشق کی باتیں   سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں

مر تو چلا کہاں تلک اب در گذر کریں   یا ہم نہیں اس آہ میں یا آسماں نہیں

جی میں ہے از سر نو جور ترے یاد کریں   تو سنے یا نہ سنے نالۂ و فریاد کریں
ہم اسیروں کی اُسے چاہئے خاطرداری   اور اُلٹے نہ کہ ہم خاطر صیاد کریں

یاں تغافل میں اپنا کام ہوا   تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

کہہ دیا مجھ سے کچھ ترے غم نے   اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

وہی میں ہوں وہی اثر دل ہے   اب خدا جانے کیا ہوا مجھکو

ہر دم فزوں ہیں کجرویاں روزگار کی   کچھ سیکھتا چلا ہے روش میرے یار کی

غرض آئینہ داریٔ دل سے   تیرا جلوہ تجھے دکھانا ہی

اور تو کوئی نہیں دام و قفس دامنگیر
تنگ آیا ہوں بہت دل کی گرفتاری سے

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا
دشمنی پر تو پیار آتا ہے

آپ ہی نہ جل بجھے نہ کچھ اس دل میں آہ کی
اس پر کہیں گے آہ کہ ہم نے بھی آہ کی

چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب یہ آئے اُڑ
معلوم ہوں گے جو کبھی اس نے نگاہ کی

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی
تمہی کون سی بات پر جائیے

ہمیں حیرت ہے آپ ہی تجھکو دیویں کیا جواب اسکا
کہ تجھ بن اب تلک کس طرح ہم نے زندگانی کی

آپ ہیں کہنے لگوں سو ہی کہاں میری مجال
پوچھے تو احوال میرا، ایسی تجھکو کیا پڑی

کب کب گلی میں تیرے ہم بے قرار آئے
سو بار جی نے چاہا تب ایک بار آئے
ہرچند جی پہ ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آئیں
آخر نہ رہ سکے ہم بے اختیار آئے

تیرے کوچہ میں دوبارہ خوب ہم ہو کر چلے
ڈھونڈھنے کو دل گئے آئے جان بھی کھو کر چلے

کلیجہ پک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے
ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیالِ خام آتا ہے ،

شیخ بقاء اللہ بقا

"جوانی سراپا خلق وظریف مزاج وقانع درویش طبع شوخش بہ طرف ہجو بسیار مائل افتادہ، در شاہجہان آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا رفیع معرکہ گیری ہا کردہ، وقت طبع خود را اظہار نمودہ" (مصحفی تذکرہ)

در مراتب نظم طبع شگفتہ و رنگیں و طرزے بامزہ و شیریں داشتہ کمترک بہ قند فارسی ہم کام زبان را حلاوت آگیں نمودہ، بہ پارسی شاگرد مرزا فاخر مکین و در ریختہ از تلامذہ شاہ حاتم و خواجہ میر درد نوشتہ اند" (گلشن بیخار)

بقاء اللہ نام، بقا تخلص، حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے اور اکبر آباد کے رہنے والے تھے، دلی میں پیدا ہوئے، اور لکھنؤ میں جا بسے، اسی وجہ سے ان کا وطن بعضوں نے لکھنؤ کو قرار دیا ہے، طبیعت فن شعر کے لئے بہت مناسب تھی، فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے، اور غمگین تخلص کرتے تھے، جب ریختہ کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو شاہ حاتم کی خدمت میں پہنچے، اور شاہ صاحب کے ارشاد سے بقا تخلص اختیار کیا، شاہ حاتم نے ان کو اپنے شاگردوں میں شمار کیا ہے، اور فتح علی شاہ حسینی نے اپنے تذکرہ میں خود انہی کی زبانی نقل کیا ہے کہ وہ خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے، ممکن ہے کہ دونوں سے مشق سخن کی ہو، میر و سودا، دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، دلی میں میر صاحب سے الجھے اور لکھنؤ میں سودا سے،

بقا کا شعر ہے،

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں
ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آبے میں

میر صاحب نے خدا جانے سن کر کہا یا توارد ہوا اسے

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

اس پر بگڑ کر بقاؔ نے یہ قطعہ کہا ؎

میرؔ نے گر ترا مضمون دوآبہ کا لیا
اے بقاؔ تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میرؔ کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے
اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

ایک اور موقع پر کہا ہے ؎

پگڑی اپنی سنبھالیئے گا میرؔ
اور بستی نہیں یہ دلی ہے،

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ،- ؎

میرؔ و مرزاؔ کی شعر خوانی نے
بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے
اے بقاؔ ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
ایک تو تو کہے ہے اک ہے ہے

بقاؔ نے زندگی بہت بے مزہ گذاری، افلاس سے تنگ آ کر کسی کی رہنمائی سے "تسخیر کواکب" کے اعمال شروع کئے تھے، اُس نے سودائی بنا دیا، جب ہر طرف سے مایوس ہوئے تو ۱۲۰۶ھ میں عتباتِ عالیات کی زیارت کو چلے، راستہ میں موت نے اس ارمان کو بھی نکلنے نہ دیا،

ہم نفس کوئی نہ دیکھا بے کسی میں اے بقاؔ
آشنا صورت مگر معنی میں وہ بیگانہ تھا

یار کو پہنچی خبر نالۂ تنہائی کی
مدعی کون کھڑا تھا پسِ دیوار لگا

ساقی کو دو نوید، بہار آئی باغ میں
سودے نے پھر خلل سا کیا ہی دماغ میں

اے عشق تو ہر چند مرا دشمنِ جان ہو   مرنے کو نہیں نام کا اپنے میں بقا ہوں

دیکھئے منصبِ مجنوں پہ یہ لیلیٰ صفتاں   خاک میں ہمکو ملا کس کو سرافراز کریں

تو نے اس طرح سے اے چرخ گرایا ہم کو   کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اُٹھایا ہم کو

پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق   جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

تیرے بیمار کو کیا ہووے شفا جس کے طبیب   نہ تو کچھ درد کو پہنچے نہ دوا ہی جانے

ناتواں ہم ہوئے اتنے کہ تری محفل تک   ڈر سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے

رہرواں کہتے ہیں جس کو جرسِ محمل ہے   محنتِ راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے
موج سے بیش نہیں ہستیِ وہمی کی نمود   صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے
کچھ تعلق نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں   جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے
آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی   یہ یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے

یہ رخِ یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے   ہے نہاں صبحِ وطن شامِ غریباں کے تلے
کیا کروں سینہ جو ناصح سے چھپائے نہ بنوں   داغ سے داغ ہیں کچھ میرے گریباں کے تلے

نہیں ملنے کی بقا ہم کو بجز کنجِ مزار   جائے آسودگی اس گنبدِ گرداں کے تلے

تہی کف آئے تھے ہم عدم سے، چلے یہاں سے تو دست خالی   نہ توشہ واں سے یہاں تھا آیا نہ ساتھ یاں سے درم اٹھائے
بقا جو راہی ہوئے عدم کے تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا   یہ راہ ہستی کی پرخطر ہے چلو یہاں سے قدم ہٹائے

مرزا جعفر علی حسرت

"جوان خوش خلق و حلیم و سلیم واقع شدہ از مدت مدید مشقِ سخن می کند، شاگرداں بسیار بہم رسانیدہ، فقیر اورا در مشاعرۂ لکھنؤ دیدہ در قصیدہ و غزل ید طولی دارد" (از تذکرۂ مصحفی)

جعفر علی نام حسرت تخلص، ابوالخیر عطار کے بیٹے، جن کی عطاری کی دوکان لکھنؤ میں اکبری دروازے کے پاس تھی،

تحصیلِ علمی کا حال معلوم نہیں، غالباً رواجِ زمانہ کے موافق فارسی کی درسی کتابیں سب پڑھی ہوں گی، شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی، رائے سرب سنگھ دیوانہ سے مشقِ سخن کی، مگر آخر میں اُن سے منحرف ہو گئے تھے،

جب تلک والد زندہ رہے شاعری کی بدولت امرا اور شاہزادوں کی مصاحبت میں مزے سے زندگی بسر کی، پہلے مرزا حسن علی خاں بہادر کی سرکار سے تعلق رہا، اس کے بعد صاحب عالم مرزا جہاندار شاہ کی مصاحبت میں رہے، جب والد کا انتقال ہوا تو ترکِ ملازمت کر کے اُن کی دوکان پر بیٹھ گئے، مگر عطاری کرتے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ کسی درویش کی صحبت میں ترکِ لباس کر کے گوشہ نشین ہو گئے،

تصنیفات میں ایک کلیات ہے، جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند

ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں، اور دو دیوان غزلوں کے ہیں، غرض کہ اصناف سخن میں سے ہر قسم کے نمونے اس میں پائے جاتے ہیں

حسرت کے کلام میں ترکیبوں کی موزونیت، الفاظ کی برجستگی، اور خیالات کی سادگی اُن کے پیشرو شعرا کی طرح بہت نمایاں ہے، یہ صحیح ہے کہ سارا کلام ان کا ایک طرح کا نہیں ہے، تاہم آزاد کی اس رائے سے مجھے اتفاق نہیں کہ ان کے دیوان میں پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے،

حسرت کا خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ اکثر غزل کو قطعہ پر ختم کرتے ہیں، اور کبھی پوری غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں،

ان کو جس قدر شاگرد نصیب ہوئے بہت کم شاعروں کو ملے ہونگے، میر حسن اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ "کثرت شاگردانش چنان است کہ در صورت شناسی خود ہم حیران است"! ان سب شاگردوں میں شیخ قلندر بخش جرأت، نواب محبت خاں، خواجہ حسن، بہت نامور شاعر ہوئے ہیں، حسرت نے سنہ ۱۲۱۰ھ میں وفات پائی، اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے،

دل میں سو بات تھی پر اُس نے جو پوچھا احوال　　مجھ سے کچھ درد دل اظہار ہوا کچھ نہ ہوا
ساری ہستی کے بکھیڑے ہیں دگر نہ دم مرگ　　کچھ سرانجام بھی درکار ہوا کچھ نہ ہوا
کاش کے عشق جتاتا میں نہ اس کو حسرت　　میری صورت سے وہ بیزار ہوا کچھ نہ ہوا

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اُس کا نام آیا تھا　　تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا
بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں　　گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

روتے ہی اُسکو گذرے ہے ہجر میں تیرے رات دن　　حال میں کیا بیاں کروں حسرت بیقرار کا

ایک سے ایک اس زمانے میں ہے اس سے خوب تر
کوئی خوش آتا نہیں میری نظر کو کیا ہوا

آشیاں چھوڑ چلے اے چمن آرا ہم تو
تو ہی لے جائیو سر پر یہ گلستاں اٹھا

کیا مجال اس کی کہاں تو اور کہاں میرا غبار
لگ چلا دامن سے تیرے مہربانی کے سبب

مانند گل کروں میں گریباں کو چاک چاک
آتا ہے میرے دل میں یہی بار بار جوش

کل کب تھے ہم سے خوش کہ نہیں ہو تم آج خوش
ہم نے تو ایک دن بھی نہ پایا مزاج خوش

سخت بیدردی ہے بیدردوں سے کہنا دردِ دل
منت مرہم نہ لیجئے کھینچئے ایذائے داغ

کسے منظور تھا یوں تلخ کیجئے زندگانی کو
ولے کیا کیجئے حسرت بلائے ناگہانی کو
بصد خونِ جگر یک قطرہ مژگاں تک پہنچتا ہے
نہ دے برباد یوں اے چشم اشکِ ارغوانی کو

تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا
کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کا

ہوئے ہیں اس قدر آفت زدے ہم تو کہ اب ہم ہیں
نہ کیفیت ہے سننے کی، نہ کچھ لذت ہے رونے کی

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے

مثالِ نقشِ قدم یاں سے اُٹھ نہیں سکتے تری گلی میں نہ جانا بھلا تھا جانے سے

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

گر کہے تو رات تو دن کو کہوں میں رات ہے کفر کچھ اس میں نہیں یہ دل ملے کی بات ہی

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے اپنی شکل دکھا گئے کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو اسی طرح سے جگا گئے

اب تو یہ دل اک بتِ ناآشنا کے ہاتھ ہی اس کے ہاتھوں چھوٹنا اسکا خدا کے ہاتھ ہی

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

از آغاز شباب بہ مقتضائے موزونیِ طبع مصروفِ تحصیلِ علم بود، چنانچہ بہ فیضِ صحبتِ بزرگاں اول تکمیلِ نظم و نثر فارسی و تحقیقِ محاورہ و اصطلاحات آں فراغت حاصل کردہ بمقتضائے رواج زمانہ خود را مصروفِ ریختہ گوئی داشتہ، برائے آنکہ رواج فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ فی زماننا بپایہ اعلائے فارسی رسیدہ بلکہ از سر آمدہ چنداں مصروف فارسی نماندہ است، (از تذکرہ مصحفیؔ)

غلام ہمدانی نام، مصحفیؔ تخلص، شیخ ولی محمد کے بیٹے اور امروہہ کے رہنے والے تھے، عنفوانِ شباب

میں دلی آئے اور مولوی مستقیم گوپاموی سے عربی صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں، طبیعت میں موزونیت خداداد تھی، شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے اور بزرگانِ دلی کی صحبتوں میں شریک ہونے لگے، چند روز میں مشق بڑھ گئی تو اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا اور جب تک دلی میں رہے، ان کے گھر مشاعرے برابر ہوتے رہے،

مزاج میں غربت مسکینی اور ادب کی پابندی تھی، اسی وجہ سے دلی کے سب شاعر اور معزز اشخاص اُن کے ساتھ لطف و مروت سے پیش آتے، یہ بھی دلی کو اپنا وطن سمجھتے تھے، اور شاید اُس زمانے میں فارغ البال بھی تھے، نواب نجف خاں کا زمانہ تھا، یہ کبھی اُن کے سلام کو نہیں گئے اور نہ نوکری کی جستجو کی، جب تک دلی میں رہے، اسی شاعری کی دھن میں لگے رہے، مگر ایک سا زمانہ ہمیشہ نہیں رہتا، دلی تباہ ہوئی، اہلِ کمال کا وہ مجمع منتشر ہوا، یہ بھی ناچار دلی سے نکلے، مگر مرتے مرتے دلی کی یاد دل سے نہیں نکالی، ایک موقع پر کہتے ہیں،

دلی کہیں ہیں جس کو زمانہ میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

دلی سے نکل کر یہ پہلے کیٹھر آئے، شیخ قیام الدین قائم، نواب محمد یار خاں) کی سرکار میں ملازم تھے، اُنھوں نے ان کا قصیدہ پیش کر کے تنخواہ مقرر کرا دی، چند روز یہ ٹانڈہ میں نہایت خوشی اور فارغ البالی کے ساتھ رہے، تذکرہ شعرا میں وہاں رہنے کا حال کئی جگہ بیان کیا ہے، اور لکھا ہے کہ جس خوشی سے چند روز وہاں بسر ہوئے ہیں، اب تک اس کی یاد تازہ ہے،

نواب محمد یار خاں کا جب کھیل بگڑا تو لکھنؤ چلے آئے، یہاں تھوڑے دنوں رہ کر پھر دلی چلے گئے، اور چاہا کہ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں، مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش پھر ان کو لکھنؤ کھینچ لائی، اس مرتبہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے، محنت و کاوش کے ساتھ مشقِ سخن جاری رہی، چند روز میں ان کی اُستادی کو خاص و عام نے تسلیم کر لیا،

ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی، ان کے کلام میں کہیں میر کا درد ہے، کہیں سودا کا انداز، کہیں سوز کی سادگی، اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور استادی اپنے پیشرو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیئے جا سکتے ہیں، اس مجموعی حیثیت سے بقول حسرت موہانی میر و مرزا کے بعد کوئی استاد ان کے مقابلہ میں نہیں جچتا، اور یہ اپنے ہمعصروں میں سب سے برتر اور سب سے فائق نظر آتے ہیں، آزاد نے بھی آبحیات میں اسکو تسلیم کیا ہے کہ "یہ اصول فن سے بال برابر بھی سرکتے نہ تھے، کلام پر قدرت کامل پائی تھی، الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس در و بست سے شعر میں کھپاتے تھے، کہ جو حق استادی کا ہے ادا ہو جاتا تھا، ساتھ اس کے اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، ایسے موقع پر کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے، جہاں سادگی ہے، وہاں معلوم ہوتا ہے کہ میر و سوز کے انداز پہ چلتے ہیں"

مگر باوجود اس کے افسوس ہے کہ آزاد نے انشا کو جا بجا مصحفی پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے، انشا کی ذہانت اور طباعی میں کچھ شک نہیں، مگر سخن سنجی اور مشاقی کے لحاظ سے انشا کو مصحفی کے مقابلہ میں لانا ہی مصحفی کی سخت توہین کرنا ہے،

بذلہ سنجی اور ظرافت کے زور سے شاہ و وزیر کے دربار میں رسوخ حاصل کر لینا یا زبان آوری اور طباعی کی مدد سے مجلسوں کو گرما دینا اور چیز ہے، اور اصول فن کو لئے ہوئے اصناف سخن میں سے ہر صنفت پر قدرت کامل رکھنا اور سخن سنجی کا حق پورا پورا ادا کرنا اور بات ہے، یہی وجہ ہے کہ انشا کی گرم بازاری انہی کے ساتھ ختم ہو گئی اور مصحفی کے کمال کا سکہ اب تک رائج ہے،

اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے استاد ان کے شاگردوں

اور عقیدت مندوں میں سے نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے، اور سچ پوچھو تو شعرائے لکھنؤ کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ سب حضرت مصحفی کے منت پذیر ہیں، شیخ امام بخش ناسخ، کو گو انکار ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بھی بواسطہ یا بلا واسطہ انہی کے مائدۂ سخن کے ریزہ چیں تھے. خواجہ حیدر علی آتش، میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اسیر وغیرہ اس پایے کے لوگ ہیں جن کے دامنِ تربیت میں پرورش پا کر سیکڑوں استاد بن گئے، سب کو جانے دو میر خلیق کے فرزند میر ببر علی انیس اور میر ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر کو لو جنھوں نے ہندوستان میں سخنوری سخنوری کے ڈنکے بجائے ہیں اور اردو شاعری کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے،

دوسرا ثبوت اُن کی مشاقی اور استادی کا خود ان کا کلام ہے جو آٹھ دیوانوں میں مشکل سے سما سکا ہو، اگر یہ سچ ہے کہ مصحفی اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے تو جتنا موجود ہے، اسکا سوایا اور رہا ہوگا، پھر اگر ان کے سارے دیوانوں میں سے صرف وہی اشعار چھانٹے جائیں جو ہر طرح سے بلند رتبہ ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انشا کے مجموعۂ ہزل و غزل کے برابر ایک مجموعہ اُن کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے،

اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مصحفی جیسے باکمال شاعر کی جتنی قدر ہونی چاہیئے تھی لکھنؤ میں نہیں ہوئی، مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے ان کو صرف پچیس روپیہ ماہوار ملتے تھے، جب میر انشاء اللہ خاں کو باریابی ہوئی اور وہ شاہزادہ کی غزلیں بنانے لگے تو اس پچیس روپیہ میں بھی تخفیف ہو گئی، جیسا کہ خود مصحفی نے بھی اس کی شکایت کی ہے،

ملنے والے کبھی پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے　　　ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر　　　ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اب تم غور کر سکتے ہو کہ اس حالت میں اس غریب پر کیا گذرتی ہو گی، وہ اگر غزلیں

بیچ بیچ کر پیٹ نہ پالتے تو کیا کرتے، سو، شاعری کے اُن کے پاس دھرا کیا تھا جس کو ذریعۂ معاش قرار دیتے،

اسی مرد معمر کا دل گردہ تھا کہ وہ اس تنگ حالی اور دل شکستگی کی حالت میں بھی وقتاً فوقتاً درباروں میں جاتے اور مشاعروں میں غزلیں پڑھتے، اور حریف کی نوک جھونک برداشت کرتے تھے،

انشا میں خدا بخشے یہ بُری عادت تھی کہ وہ اپنی گرمیِ بازار کے لئے ایک نہ ایک ہنگامہ برپا کرتے رہتے تھے، دلّی میں اپنی ذکاوت اور طباعی کے زور پر مرزا عظیم بیگ کی مٹی خراب کی مگر وہ دلّی تھی، کتنی ہی مٹ گئی ہو، پھر بھی ایسے لوگ وہاں موجود تھے، جنھوں نے اسکو رفع دفع کر دیا،

یہاں آکر انھوں نے مصحفی کو آگے دھر لیا، پہلے تو اس غریب کے پچیس سے پانچ رہ گئے، پھر روز کی چھیڑ چھاڑ، ایک دن مشاعرہ میں مصحفی نے حسب معمول غزل پڑھی اور چلے آئے اس غزل کا مقطع تھا، ؎

تھا مصحفی بہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ   تھی اُس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

ان کے چلے آنے پر یاروں نے اُن کی لے دے شروع کی، اور غزل اُلٹ کر بڈھے بیچارے کے کلام کو خوب خراب کیا، جس کا مقطع یہ ہے،

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ   رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اس غزل کی خبر مصحفی کو پہنچی، وہ پُرانے مشاق لکھنؤ بھر کے استاد کوئی معمولی آدمی نہ تھے بگڑ گئے، اور یہ غزل لکھی جس میں متانت کی پابندی کو ہاتھ سے نہیں دیا، مگر افسوس ہی کہ آزاد اسکو بڑھاپے کی سستی یا طبیعت کے افسردہ پن سے تعبیر کرتے ہیں، ؎

مدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری ناداں ہی جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
ہیں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
بھپتا نہیں ہے بزمِ امیرانِ دہر میں شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری
ہے شاعروں کی اب کے زمانے کی یہ معاش پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری
لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اُسے خفت اُٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری
اے مصحفی زگوشۂ خلوت برون خرام خالی است از برائے تو خود جائے شاعری
ہر سفلہ را زبان و بیانِ تو کے رسد آری توئی فغانی و بابائے شاعری
مجنوں منم چرا دگرے رنج می برد در حصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

پھر کیا تھا، سید انشا آئیں تو جائیں کہاں، وہ خاکہ اڑا کہ بقول آزاد شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں اُنگلیاں دے لیں، جب نوبت حد سے گذر گئی تو مصحفی کے شاگردوں میں منتظر اور گرم اٹھ کھڑے ہوئے، ایک دن شہدوں کا سوانگ بھر کر، ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے انشاء اللہ خاں کی طرف چلے، اُن کو بھی خبر ہو گئی، یہ اپنے یارانِ صحبت کو ہمراہ لیکر استقبال کو نکلے، اور اپنے مکان پر لائے، سب کو بٹھایا، اور وہ اشعار دوبارہ پڑھوا کر سنے، پھر خاطر تواضع کر کے سب کو رخصت کیا،

لیکن اس کا جواب سید انشا نے جو دیا وہ قیامت کا تھا، ایک انبوہ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا، اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں، کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میں گڈا اور ایک میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے تھے؛ اور اشعار پڑھتے جاتے تھے، جس کا ایک شعر یہ ہے،

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخِ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

آزاد کہتے ہیں کہ ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا، اور حریف کے سوانگ کو توال سے کہہ کر ایک دفعہ رکوا دیا، اس بات سے مصحفی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا، چنانچہ اکثر غزلوں میں اس کا رنگ جھلکتا ہے، ان میں سے ایک غزل کا مقطع ہے،

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا
سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ان سب پر تازیانہ غضب یہ ہوا کہ سید انشا کے سمجھانے سے یا خود بخود مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ مصحفی نے اپنی ہجووں میں ہم پر بھی چوٹ کی ہے، اسکے عذر میں مصحفی نے ایک قصیدہ بطور معذرت کے پیش کیا ہے جس سے بہت سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی بیچارہ کی طرف سے سوانگ نکالنے کی ابتدا نہیں ہوئی ہے، اس قصیدہ کو اس نظر سے نقل کرتا ہوں کہ ناظرین اس بات کا اندازہ کریں کہ مصحفی کو شعر و سخن پر کتنی قدرت حاصل تھی،

قسم بذاتِ خدا کہ ہے سمیع و بصیر
کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں نہیں ہوئی تقصیر
سوائے اس کے کہ حال اپنا کچھ کیا تھا میں عرض
سو وہ بطور شکایت تھی اندکے تقریر
گر اس سے خاطرِ اقدس پہ کچھ ملال آیا
اور اس گنہ سے ہوا بندہ واجب التعزیر
عوض رپوں کے ملیں مجکو گالیاں لاکھوں
عوض دو شالہ کے خلعت بہ شکلِ نقشِ حصیر
سلف میں تھا کوئی شاعر نواز ایسا کب
جو ہے تو شاہ سلیماں شکوہ عرش سریر
مزاج میں یہ صفائی کہ کر لیا باور
کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کہ کی تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو
تو اس کے رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر
دگر کریں تو پھر ایسی کہ نائرہ طیش و غضب
مزاجِ شاہ میں ہو مشتعل بصد تشویر

سو تابِ ذرہ کہاں، نورِ آفتاب کہاں
کہاں وہ سطوتِ شاہی، کہاں غریب فقیر
مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیئے
کہاں دبیقی و دیبا، کہاں پلاسِ حصیر
میں اک فقیرِ غریب الوطن مسافر نام
رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
مراد ہن ہے کہ مدحِ حضورِ اقدس کو
اُلٹ کے پھیر بحرفِ ذمیمہ دوں تعبیر
یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشآ کا
کہ بزم و رزم میں ہے پایۂ تخت کا وہ مشیر
مزاجِ شاہ ہو یوں منحرف تو مجکو بھی
یہ چاہیئے کہ کروں شکوہ اس کا پیشِ وزیر
اگر وزیر بھی بولے نہ کچھ خدا لگتی
تو جاؤں پیشِ محمدؐ کہ ہے بشیرؐ و نذیرؐ
شفیعؐ روزِ جزا بادشاہؐ "او ادنیٰ"
نہ کردہ جرم یہ جس نے نہیں لکھی تعزیر
کہوں یہ اُس سے کہ اے جرم بخشؐ پرگنہاں
تری غلامی میں آیا ہے دادخواہ فقیر
خطا ہو میری جو پہلے تو کر اسیر مجھے
وگر عدو کی پنہا اس کو طوق اور زنجیر
اگرچہ بازیِ انشاے بے حمیت کہ
رہا خموش سمجھ کر میں بازیِ تقدیر
ولے غضب ہے بڑا یہ کہ اب وہ چاہے ہے
خیال میں بھی نہ کھینچوں میں ہجو کی تصویر
سو میں ملک نہیں ایسا بشر ہوں تا کے و چند
کہے ہے اُس کے کہوں گا نہ ماجرا تحریر
کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگذرا
پھریگا مجھ سے کوئی گرم و منتظر کا ضمیر
اور ان پہ بھی جو کیا میں نے تازیانۂ منع
تو ہو سکے ہے کوئی ان کی وضع کی تدبیر
ہزار شہدوں میں میٹھیں ہزار جا پہ ملیں
پھریں ہمیشہ لئے جمع ساتھ اپنے کثیر
نہ مانیں تیغِ سیاست نہ قہرِ سلطانی
نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربتِ شمشیر
مزاج ان کا ٹھٹھول اس قدر پڑا ہے کہ وہ
ہنسی سمجھتے ہیں اس بات کو نہ جرمِ کبیر
پھر اس پہ یہ بھی ہے یعنی کہ اس مقام کے بیچ
جو ہووے منشی تو کچھ نثر میں کرے تسطیر

نکیف جن کو خدا نے کیا ہو موزوں طبع   اور اپنے فضل سے بخشی ہو شعر میں توقیر
یہ کوئی بات ہے سوسن کے وہ خموش رہیں   ہوا ہے مصلحۃً گو کہ متصفیہ یہ اخیر
مگر یہ بات ہیں مانی کہ سوانگ کا بانی   اگر میں ہوں تو مجھے دیجئے بد ترین تعزیر
میں آپ فاقہ کش اتنا مجھے کہاں مقدور   کہ فکر اور کروں کچھ بغیر آشِ شعیر
مرے حواس پریشاں بہ ایں پریشانی   ہو جیسے لشکرِ بشکستہ کی خراب بہیر
گر اس پہ صلح کی ٹھہری رہے تو صلح سہی   اگر ہو پھیر شرارت بشر ہوں میں بھی شریر
جواب ایک کے یاں دس ہیں اور دس کے سو   نگاہ کرتے تھے اول بہ ایں قلیل و کثیر
حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیہ   گیا ہو از پئے تہدید شاعرانِ شریر
تو کوتوال ہی بس اُن سے اب سمجھ لیگا   یہ دمبدم کی شکایت کی ہی عبث تحریر
یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح سارے شہر کے بیچ   بلند قامتی اپنے سے متہم ہو بعیر
سو متہم مجھے ناداں نے ہجو شہ سے کیا   قباحت اس کے جو سمجھے تو اسکو دے تعزیر
ولے مزاجِ مقدس جو لاابالی ہے   نہیں خیال میں آتا خیالِ حرفِ حقیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ   زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا پہ چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے   کرے جو چاہے جو چاہا کیا بہ حکم قدیر

مصحفی کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ آٹھ دیوان انھوں نے ریختہ کے ترتیب دیئے، ایک دیوان فارسی میں لکھا، دو تذکرے لکھے، ایک تذکرہ فارسی کے شعرار کا، ایک تذکرہ اردو شعرا کا جو پیشِ نظر ہے اور اس کا مسودہ ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں موجود ہے،

دیوانوں میں تمام اصنافِ سخن ہیں، قصائد، قطعات، غزلیں، تاریخیں، مستزاد، مخمس، رباعیاں وغیرہ، سنگلاخ زمینوں میں قصائد اور غزلیں کاوشِ فکر کا بہترین نمونہ ہیں،

مگر سب دیوان ان کے ملتے نہیں۔ کئی دیوان نواب کلب علی خاں مرحوم کے کتب خانہ میں تھے، نواب کے حکم سے اسیر و امیر نے اُن کی تصحیح کی، اور سب کا خلاصہ کرکے ایک دیوان تیار کیا، جس کو نواب نے چھپوا دیا ہے، مصحفی نے چھتر ۷۶ برس کی عمر پاکر سنہ ۱۲۴ھ میں انتقال کیا اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے،

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

کہیں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہووے گا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

ان اداؤں کا کوئی مارا جئے کس طرح ہائے
یاد ہے اب یہ گرمجوشی یا کہ وہ پرہیز تھا

مرضِ عشق سے گر اب کی سنبھل جاؤنگا
تو میں دو چار برس کے لئے ٹل جاؤنگا

تھا اگر روزِ قیامت تو بھی ہم شاداں رہے
وہ جو اک دن اس کے ملنے کا مقرر ہوگیا

شوخی تو دیکھو تیر کو سینہ سے کھینچ کر
کہتا ہے، میرے تیر کا پیکان رہ گیا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
پر تیرے دل میں بہت کام رفو کا نکلا

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہیں
رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

ترے کوچہ میں اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ
ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط
یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

افتادگانِ وادیِ غربت کی گذشت
کرتا ہے خوبیاں لبِ خاموشِ نقشِ پا

گلی کو یار کی سمجھے ہے اپنا وہ کعبہ
یہ مصحفی سے نہ پوچھو کدھر ہے سجدہ درست

اے مصحفی اُس کوچہ میں دل بسکہ لگا ہے
جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزم سفر روز

چھیڑ مت ہر دم نہ آئینہ دکھا
اپنی صورت سے خفا بیٹھے ہیں ہم

آنے دو اُسے جس کے لئے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم

ہر دم کو سمجھتے ہیں دم باز پسیں ہم
غافل تو ہوا ہم سے ذرا بھی، تو نہیں ہم

وہی دشت اور وہی گریباں چاک
جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں

ہائے وہ دل کہ جسے میں نے بغل میں پالا
اب اُسے یوں ہدفِ ناوکِ مژگاں دیکھوں

فلک گر ہنستا ہے مجھ پر کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

کھانے نہیں دیتے ہیں مجھے خونِ جگر بھی
نالے تو مرے حلق کے دربان ہوئے ہیں

واں چشمِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

وعدۂ قتل سے رکھتا ہوں دل اپنے کو میں شاد
کہ ابھی وعدہ پہ اک وعدۂ دیدار بھی ہے

یار کا صبح تک ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جئے ہے بنے

غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی
کیا غم ہے مرنے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو
میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

تو آ کے بیٹھے دمِ نزع جس کی بالیں پر
وہ مر بھی جائے تو آنکھیں کبھی نہ بند کرے

دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہو کہ بے منتِ دست
پرزے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا ہے

حسرت پہ اُس مسافر بیکس کے روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

میں وہ نہیں ہوں کہ اُس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں جو اُس سے تو تجھ سے مرا خدا پھر جائے

راہ میں کشتے پڑے ہیں کئی ارمان بھرے
بچ کے چلیو نہ ترا خون سے دامان بھرے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

شیخ غلام علی راسخ

شیخ غلام علی راسخ عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے ہیں، میر تقی میر سے مشقِ سخن کی ہے، ان کے حالات پرانے تذکروں میں جو اس وقت پیشِ نظر ہیں نہیں ملتے، گلشنِ بیخار میں کچھ معمولی سا ان کا ذکر ہے، اور چند اشعار ان کے درج ہیں، باوجودیکہ ان کا کلیات اچھی خاصی ضخامت رکھتا ہے،

کلیات میں بہت سے قصیدے ہیں، غزلوں کا دیوان اور چھوٹی بڑی چودہ مثنویاں ہیں، زبان بہت پاکیزہ اور طرزِ بیان نہایت صاف و سادہ ہے، کلام میں رطب یابس

نہ ہونے کے برابر ہے، تصوف کا مذاق بہت اُبھرا ہوا نظر آتا ہے جس کو بہت سادہ طریقے سے ادا کرتے ہیں، تشبیہ اور استعاروں کی چاشنی کم ہے جس سے کسی قدر پھیکا پن ظاہر ہوتا ہے، تاہم رنگین شعروں کی کمی بھی نہیں ہے، سینکڑوں شعر ایسے انتخاب کئے جا سکتے ہیں جو دلنشیں ہونے کے قابل ہیں،

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں ان کا قیام زیادہ رہا ہے، چند قصیدے نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں بھی ہیں، مگر غازی الدین کی تعریف کا قصیدہ اُس زمانہ کا ہے جب وہ نواب وزیر تھے، بعض غزلیں ناسخ و آتش کی طرحی زمین میں ہیں، مگر وہ بھی اپنے رنگ کی ہیں،

مقطعوں میں میر کی شاگردی کا اکثر ذکر کرتے ہیں، اور کہیں کہیں شفائی اور نظیری کی ہمسری کا بھی دعوا ہے، میرے نزدیک اُن کے معاصرین میں سے کسی کا بھی کلام زبان کی پاکیزگی اور بیان کی خوش ادائی میں ان کا جیسا صاف اور ستھرا نہیں ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو چار دیوانوں سے چھانٹ کر یہ دیوان تیار کیا گیا ہے، اور بڑی بڑی غزلوں میں سے دس دس پانچ پانچ شعر انتخاب کر کے جمع کر دیئے ہیں، مگر اس کو کیا کہیئے کہ جو زبان غزلوں کی ہے، وہی قصیدوں اور مثنویوں کی بھی ہے،

اس قدر لکھ لینے کے بعد خمخانۂ جاوید نظر سے گذرا، اُس میں فدائے وطن سے ان کا کسی قدر تفصیلی حال نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ راسخ سنہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے، کوئی کہتا ہے کہ پٹنہ میں کسی کا بیان ہے کہ موضع سمائیں میں جو پٹنہ سے دس کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے ان کی ولادت ہوئی، سنہ ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، لکھنؤ، اور دلی کی سیاحت میں مصروف رہے سنہ ۱۲۲۲ھ میں اپنے وطن مالوف کو واپس آئے، اُس زمانہ میں پٹنہ مرجع ارباب کمال تھا اور شاعری

کا گھر گھر چرچا تھا، ان کی عمر کا بقیہ حصہ یہیں گذرا، مشاعروں میں شریک ہوتے تو دو زانو بیٹھے رہتے، اور جب شعرا غزلیں پڑھتے تھے تو یہ آنکھیں بند کئے جھوما کرتے تھے، اپنی غزلیں پڑھتے وقت آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا،

چھہتّر برس کی عمر میں ۲۲ جمادی الاُخریٰ سنہ ۱۲۳۸ھ کو وفات پائی، گلشنِ بیخار میں ہے کہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں واصل بحق ہوئے، مگر قرینہ یہ ہے کہ خمخانۂ جاوید میں نوائے وطن سے جو سنہ وفات نقل کیا گیا ہے، وہی صحیح ہوگا،

تمھارے آشنا کب خلق سے رکھتے ہیں آمیزش
انھیں تو آپ سے بھی ہم نے بیگانہ سدا پایا
دلِ بلبل نہ تنہا چاک ہے اس عشق کے ہاتھوں
یہ وہ ہے جس سے گل کے بھی گریباں کو قبا پایا

جب تجھے خود آپ سے بیگانگی ہو جائیگی
آشنا تب تجھ سے وہ دیر آشنا ہو جائے گا

لاگ اُس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ
کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

شہادت گاہ خوں ریز محبت طرفہ جا دیکھی
کہ جو مقتول تھا یاں خنجرِ قاتل کا ممنوں تھا

جوانی ہنس گئے کاٹی اب پلک تک اشک چمکے ہیں
جو رات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبحِ پیری کا

تھا جی میں کہ دشواریِ ہجر اُس سے کہیں گے
پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا

کیا بیاں ہو صاحبانِ ظرف کی تاثیرِ قرب   آب کا قطرہ صدف تک آن کر گوہر ہوا

بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل   اس قیدِ مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

انتہائے عاشقی ہے شانِ معشوقی کہ ہم   صید جس صیّاد کے تھے وہ شکار اپنا ہوا

دور میں اُس کی مست آنکھوں کے   محتسب بھی شراب خوار ہوا

بگڑی جب سب سے تب کچھ اُن سے   اسلوب بنا موافقت کا
دل نے کھویا ہمیں کہ تھا آہ   دیوانہ شریکِ مشورت کا

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھکر   قاصد نے اُن کے آنے کی دل سے بنائی بات

اپنا بھی ماجرا اے دل اک مرثیہ سا ہے   بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر

ضبط گریہ تو ہے پر دل پر جو اک چوٹ سی ہے   قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز
شیخ اس بت شکنی پر نہ ہوا اتنا مغرور   تو نے توڑا نہیں اپنا بت پندار ہنوز

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا   لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنسِ فاہم

گھر سے کھو کر در پہ اپنے بیٹھنے دیتے نہیں
تم جو کہتے ہو کہ جا یاں سے کہیں اب جاؤں کہاں

معکوس ہے نگیں کی طرح میری سرنوشت
یاد آنے سے مقیّد نام و نشاں ہوں میں

اس کا ہر برگ آئینہ روئے چمن آرا کا ہو
دیدنی ہے یہ چمن گر ہم نظر پیدا کریں
غم تمہارے درپئے تخریبِ چشم و دل ہیں آہ
ہے قریب اب اسے دریا اُسے صحرا کریں
باوجودِ دل نظر آوے نہ تم حیرت ہے یہ
آئینہ پاس اور ہم دیدار کو ترسا کریں
کچھ بھی کیفیت گراں میں ہو تو یہ سب خرقہ پوش
سبحہ و سجادہ رہنِ ساغر و صہبا کریں

ہوئے مغلوبِ شوقِ کارفرما آخر آخر ہم
ہمیں تھا اختیار آگے پر اب بے اختیاری ہے
اٹھا سکتے نہیں بے طاقتی کا بار بھی اب ہم
ہوئے ناتواں ایسے کہ جینا تک بھی بھاری ہے

اگر بابِ اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی
تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے

میر غلام حسن حسنؔ

از اوائلِ عمرش طبیعتش موزون بود اکثر خود را مصروف و مشغولِ این شغلِ خطیر می داشت، شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیاؔ کہ دراں ایام از مشہورانِ زمانہ دریں دیار بود می گذرانید بعد ازانکہ دور دورِ مرزا رفیع السودا شد و زبان ریختہ چنانکہ بود زیادہ دریں دیار رواج یافت بہ حکم قوت ممیزہ قدم بر جادہ مستقیم اساتذہ مسلّم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع السودا و میر محمد تقی میر

و میاں محمد قائم گذاشتہ، زبانِ خود بہ مرتبۂ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ، دیوانِ ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلکِ نظم کشیدہ، خصوصاً در مثنوی اخیر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ (از تذکرۂ مصحفی)

میر غلام حسن نام، حسن تخلص، میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے، دلّی میں پیدا ہوئے بارہ برس کے سن میں والد کے ساتھ فیض آباد آئے، کچھ مدت وہاں رہ کر لکھنؤ میں آبسے، شعر و سخن کا ذوق موروثی تھا، اور طبیعت اس کے مناسب پائی تھی،

اودھ میں آکر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے، مگر اُن کی روش پر چل نہ سکے، خواجہ میر درد، مرزا رفیع اور میر تقی میر کے کلام کا تتبع کیا، ایک تذکرہ شعرائے ریختہ کا، ایک دیوان اور گیارہ مثنویاں تصنیف کیں، جس میں سحر البیان کی سی قبولیت اردو میں کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی،

آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ جب تک دلّی میں رہے، اپنے والد اور خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے، اودھ میں جاکر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی، اسی بنا پر آزاد نے ان کو جا بجا خواجہ میر درد اور مرزا رفیع کا شاگرد بیان کیا ہے، مگر خود میر حسن نے تذکرہ میں اپنے آپ کو میر ضیار کا شاگرد لکھا ہے اور یہی صحیح بھی ہے، بارہ برس کے سن میں اُنھوں نے دلّی چھوڑی، خواجہ میر درد مرحوم سے اصلاح لینے کا کون سا موقع تھا! اگر سودا کو غزل دکھائی ہوتی تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے، دیکھو تذکرہ

"اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شاں از من کما حقہ سر انجام نیافت بر قدمِ دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودم"

۱۲۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی، مصحفی نے "شاعرِ شیریں بیان" سے تاریخِ وفات نکال کر حقِ آشنائی ادا کیا ہے، تذکرۂ شعرا، اور ان کی دوسری مثنوی گلزارِ ارم کا قلمی نسخہ نہایت خوشخط

ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے،

گلزار ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی تعریف جی کھول کر کی ہے، شاید اسی وجہ سے اس مثنوی کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی،

میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہیں تھے، البتہ غزل میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور مثنوی میں تو یکتائے زمانہ تھے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، بے نظیر و بدر منیر کے قصہ میں جو سحر بیانی کی ہے، اس کا آج تک جواب نہیں ہو سکا،

اُس کی زبان کی صفائی، محاورہ کا لطف مضمون کی شوخی، طرز ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھونک حد توصیف سے باہر ہے، باوجود اس کے کہ سحر البیان کی تصنیف کو ڈیڑھ سو برس ہونے کو آئے ہیں، لیکن اُسکی زبان قریب قریب وہی ہی جو آجکل بولی جاتی ہے یہی ایک اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ میر حسن کا مذاق سخن کتنا لطیف و پاکیزہ تھا،

سر دیوے گا جس دن تو حسن تیغ کو اُس کے
اسرار کھلے گا جبھی اس سِرِّ نہاں کا

وہ دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا
اب تو قفس میں بھوے نقشہ بھی گلستاں کا

نہ رُکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجکو کیا رات غم تھا کسی کا

اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہی میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

میں حشر کو کیا روؤں کہ اُٹھ جانے سے تیرے
برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور

دامنِ صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں
پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیابان دیکھ کر

آرزو دل کی بر آئی نہ حسن وصل میں اور
لذتِ ہجر کو بھی مفت میں کھو بیٹھے ہم

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

دل کو کھویا ہے کل جہاں جا کر
جی میں ہے آج جی بھی کھو آؤں

ناز سے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

ترے بن باغ میں جس وقت غنچے گل کے کھلتے ہیں
خراشِ ناخنِ غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں

سماں تھا کل عجب ہونے سے تیرے شوخ محفل میں
کہ سو سو آرزوئیں مضطرب پھرتی تھیں ہر دل میں

وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی اُلفت
ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں

پہنچے نہ حسن منزلِ مقصود کو ہم اور
آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

مزے نہ دیکھے کبھی ہم نے زندگانی کے
یونہی گذر گئے افسوس دن جوانی کے

حسن دیتا ہے تو کیوں جی بتوں کو
ملا دیں گے تجھے یہ کیا خدا سے

اُس بُت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسنؔ
یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس اے زندگی ایسی ہستی سے گذرے

آرزو اور تو کچھ ہم کو نہیں دنیا میں
یاں مگر ایک ترے ملنے کا ارمان تو ہے

کیا ہے اب کوئی اور کیا دے سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے
ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

عیش و وصال و صحبتِ یاراں، فراغِ دل
اس ایک جان کے لئے کیا کیا نہ چاہئے

آغازِ محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا
کیا جانئے کیا ہوگا انجام مرے دل کا

کیا جانے اس کے جی پہ کیا کچھ خیال گذرا
کچھ آپ ہی آپ اپنے جی پر ملال گذرا

جس عالمِ ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ
آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم ہے خزاں کا

نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائیگا

اظہارِ خموشی میں ہی سو طرح کی فریاد
ظاہر کا یہ پردہ ہی کہ میں کچھ نہیں کہتا

سحرالبیان کا نمونہ

بے نظیر فلک سیر گھوڑے پر سوار ہو کر بدر منیر کے باغ میں پہنچا ہی، اور ایک دوسرے کو دیکھکر فریفتہ ہوتے ہیں

ہوا ناگہاں اس کا اک جا گذر
سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند
کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا
وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ
اتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اُس مکاں کے تئیں
کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر
کہ سب کچھ گیا اُس کے جی سے گذر

تھے اک طرف گنجان باہم درخت
کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر
درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہی وہاں
عجب چاندنی ہی عجب ہے سماں
عجب صورتیں اور طرفہ محل
چلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل

لب نہر پر صاف جو غور کی   تو پٹڑی تھی وہ ایک بلّور کی
پڑے اسمیں فوّارے چھٹتے ہوئے   ہوا بیچ موتی سے لٹتے ہوئے

کھڑا ایک نمگیرۂ زرنگار   کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار
مغرق بچھی مسند اک جگمگی   کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ بھولے سماتے تھے تکیے دھرے   کہ تھے وہ فقط حسن ہی سے بھرے

وہ مسند جو تھی موج دریائے حسن   وہاں دیکھی اک مسند آرائے حسن
برس پندرہ ایک کا سن و سال   نہایت حسین اور صاحب جمال
دیئے کہنی تکیے پہ اک ناز سے   سر نہر بیٹھی تھی انداز سے
خواصیں کھڑی ایدھر اودھر تمام   ستاروں کا جوں ماہ پر ازدحام
وہ بیٹھی تھی سج دھج بنائے ہوئے   دل اس چاندنی پر لگائے ہوئے
اُدھر آسماں پر وہ رخشندہ مہ   ادھر یہ زمیں پر مہ چاردہ
پڑا عکس دونوں کا جو نہر میں   لگے لوٹنے چاند ہر لہر میں
نظر آئے اتنے جو اک بار چاند   زمانے کے منھ کو لگے چار چاند

وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے   وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہئے ٹھیک نکسک سے رنگ   نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ
کچھ اک تمکنت اور کچھ اک بانکپن   غرض ہر طرح میں انوکھی پھبن

وہ ابرو کہ محرابِ ایوانِ حسن　　جھکی شاخِ نخلِ گلستانِ حسن
نگہ آفت و چشم عینِ بلا　　مژہ دیں صفوں کو الٹ برملا

وہ بینی کہ جس کی نہیں کچھ نظیر　　ہے انگشتِ قدرت کی سیدھی لکیر
وہ رخسار نازک کہ ہو جائے لال　　اگر اُس پہ بوسے کا گذرے خیال

وہ ساقیں بلوریں وہ انداز پا　　پھرے ہر سحر چشم دل میں سدا
قدو قامت آفت کا ٹکڑا تمام　　قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

یہ قدرت کا دیکھا جو اُس نے خیال　　کہا شاہزادے نے یا ذوالجلال
درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں　　کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں
جو دیکھیں تو ہے اک جوانِ حسین　　درختوں کی ہے اوٹ ماہِ مبین

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا　　کسی نے کہا چاند ہے یاں چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن　　کسی نے کہا ہے قیامت کا دن ۔
کسی نے کہا دیکھیو اے بوا　　کھڑا ہے کوئی صاف یہ مرد وا
یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں　　اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
گئی بات یہ شاہزادی کے گوش　　یہ سنتے ہی جاتا رہا اس کا ہوش
کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اُٹھی　　گیا سنسنا جی تو رہ کر اُٹھی

خواصوں کے کاندھے پہ دھر اپنا ہاتھ عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
کئی ہمدمیں تھیں جو کچھ کچھ بڑھیں دعائیں وہ پڑھ پڑھ کے آگے بڑھیں
جو دیکھیں تو ہے اک جوانِ حسین کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن مرادوں کی راتیں جوانی کے دن
نئی پشتِ لب سے مسی کی نمود جسے دیکھ نیلا ہو چرخِ کبود

عیاں چستی و چابکی گات سے نمود جوانی ہر اک بات سے
بدن آئینہ سا دمکتا ہوا گلِ باغِ خوبی لہکتا ہوا
اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل جوانی کی شب کا سماں بر محل
قیافے سے ظاہر سراپا شعور جبیں پر برستا شجاعت کا نور

گئی اُس جگہ جب یہ بدرِ منیر اور اُس نے جو دیکھا شہِ بے نظیر
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل
غرض بے نظیر اور بدرِ منیر گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر
رہی کچھ نہ تن من کی سدھ بدھ اُسے نہ کچھ اپنے تن کی رہی سدھ اُسے
تھی ہمراہ اک اُس کے دخت وزیر نہایت حسین اور قیامت شریر
زبس تھی ستارہ سی وہ دلربا اُسے لوگ کہتے تھے نجم النسا
شتابی سے اُس نے چھڑکا گلاب تب آئی تنوں میں ذرا اُن کے تاب
وہ شہزادۂ دل شدہ تو ٹھٹھک وہ رہ گیا نقشِ پا سا بھچک

کہ وہ نازنیں کچھ جھجک منہ چھپا	کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر	وہیں نیم بسمل اسے چھوڑ کر

ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی	چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی
غضب منہ پہ ظاہر وہ دل میں چاہ	نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں	میں اب چھوڑ کر گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں	چھپی جا کے وہ اپنے دالان میں

کہ اتنے میں آئی وہ دختِ وزیر	لگی ہنس کے کہنے کہ بدرِ منیر
مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں	ترے ناز بیجا یہ بھاتے نہیں
کیا ہے اگر تو نے گھائل اُسے	تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو	مزہ دیکھ اپنی جوانی کا تو
یہ حسن و جوانی یہ جوش و خروش	غفور است ایزد تو ساغر بنوش
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں	گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ سُن سُن کے وہ نازنیں مسکرا	لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا
میں سمجھی ترا دل گیا ہے اودھر	بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ پھر
لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش	ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش
تمہیں نے تو چھڑکا تھا مجھ پر گلاب	بھلا میری خاطر بلا تو شتاب

یہ آپس میں رمزوں کی باتیں ہوئیں   اشاروں کی باہم جو گھاتیں ہوئیں
بلا لائی جا اس جواں کے تئیں   کیا میزباں میہماں کے تئیں

بزور اُس کو لا کر بٹھایا جو واں   نہ پوچھو اُس گھڑی کی ادا کا بیاں
وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے   بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منھ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے   لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن   کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
گھڑی دو تلک وہ مہ آفتاب   رہے شرم سے پابندِ حجاب

جب آپس میں چلنے لگے جام مل   مندے غنچہ ساں دل کھلے مثلِ گل
کھلا بند جس دم درِ گفتگو   جواں نے حقیقت کہی مو بہ مو
پری کا بھی احوال ظاہر کیا   چھپے راز سے اُسکو ماہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے   زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
یہ سن دل ہی دل بیچ کھا پیچ و تاب   دیا شاہزادی نے اُس کو جواب
مرو تم پری پر وہ تم پر مرے   بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں   یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے کیوں دل لگائے کوئی   بھلے چنگے دل کو جلائے کوئی

یہ سن پاؤں پر گر پڑا بے نظیر   کہا کیا کروں آہ بدرِ منیر
کوئی لاکھ جی سے ہو مجھ پر فدا   میں تجھ پر فدا ہوں مجھے اس سے کیا

کہا چل سر اپنا قدم پر نہ دھر   کسی کے مجھے دل سے ہے کیا خبر
یہ رمز و کنایے جو ہونے لگے   تو آپس میں ہنس ہنس کے رونے لگے
رہی دل ہی دل میں غرض دل کی بات   پہر بھر گئی اتنے عرصہ میں رات
خبر رات کی سن اٹھا بے نظیر   کہا اب میں جاتا ہوں بدر منیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا   تو پھر آج کے وقت کل آؤنگا

جس پری نے بے نظیر کو اُڑایا تھا، اور صرف سیر کرنے کو فلک سیر گھوڑا دیا تھا، اس کو خبر ہو گئی کہ یہ کسی اور پر دیوانہ ہو گئے ہیں، اس نے چاہ زنداں میں قید کر دیا، ان کے نہ آنے سے بدر منیر کی بیقراری ملاحظہ ہو،

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر   پڑی بے قراری میں بدر منیر
بہم دو دلوں میں جو ہوتی ہے چاہ   تو ہوتی ہے دل کے تئیں دل سے راہ
قلق واں جو گذرا تو یاں غم ہوا   رکا جی وہاں یاں خفا دم ہوا
کئی دن جو آیا نہ وہ رشک ماہ   نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ

گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی   بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی
دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی   درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
بھڑنے لگا جان میں اضطراب   لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی   در اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی   بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ   اکیلی لگی رونے منھ ڈھانپ ڈھانپ

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے
محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی
یہ دن کی جو پوچھو، کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلایا تو پینا اُسے
غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش
بھرا دل میں اس کے محبت کا جوش
چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر
وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
غزل یا رباعی و یا کوئی فرد
اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں
نہیں کچھ تو اسکی بھی خواہش نہیں
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل

زباں پر تو باتیں مگر دل اُداس
پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منھ کی خبر اور تن کی خبر
نہ تن کی خبر نے بدن کی خبر
جو مسّی ہے دو دن کی تو ہے وہی
جو کنگھی نہیں ہے تو یوں ہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام
نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
و لیکن یہ خوباں کا دیکھا سبھاؤ
کہ بگڑے سے دونا ہوا ان کا بناؤ
نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی
جو بیٹھی ہے بگڑی تو گویا بنی
غرض بے ادائی ہے یاں کی ادا
بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہے بھلا

شیخ قلندر بخش جرأت

اگرچہ پارہ در علم موسیقی و ستار نوازی نیز دستے بہم رسانیدہ، لیکن انچہ گوید دیوانہ فن شعر است کہ گاہے بے فکر نمی ماند، بسیار دردمند و گداز است (اھ تذکرۂ میرحسن)

از اصول و قوانین این فن بہرہ نداشتہ نغمہاے خارج از آہنگ می سرود، معہذا بعض ابیاتش بہ غایت خوش و دلربا آمدہ (اھ گلشن بے خار)

قلندر بخش جرأت اصل میں دہلی کے رہنے والے تھے، باپ کا نام حافظ امان تھا، ان کے بزرگ دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے، اور لوگوں کی طرح ان کا کنبہ بھی فیض آباد آبسا تھا، چنانچہ جرأت کا نشوونما فیض آباد میں ہوا، ابھی جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آنکھوں سے معذور ہو گئے،

طبیعت چلبلی تھی، موسیقی اور ستار نوازی کی طرف مائل ہوئی، اور شعر و سخن کا چسکا پڑا، جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی، شعر و سخن کے ساتھ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بھی نام پیدا کیا، اول اول نواب محبت خاں کی سرکار میں[1] نوکر ہوئے، اس کے بعد مرزا سلیمان شکوہ کے دربار تک رسائی ہو گئی، میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں خوب گرم رہتی تھیں

---

[1] نواب محبت خاں حافظ رحمت خاں کے بیٹے تھے، حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد چند روز شجاع الدولہ نے ان کے سب بیٹوں کو الہ آباد میں نظربند کر رکھا، آصف الدولہ کے وقت میں رہائی ہوئی اور انھوں نے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی، نواب نے انکا وظیفہ مقرر کر دیا، خوشرو و خوشخو جوان تھے، میرحسن و مصحفی وغیرہ انکی مروت اہلیت و خوش اخلاقی کے مداح و ثنا خواں ہیں، انکو شعر و سخن سے بے حد ذوق تھا، فارسی اور اردو میں فکر کرتے تھے، اور جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی تھی، مسٹر جانسین کی فرمائش سے سسی پنو کا قصہ نظم کرکے اسکا

دیوان ان کا چھپ گیا ہے، اس میں ہر طرح کی غزلیں، رباعیاں، مخمس، مستزاد، واسوخت ہجویں اور تاریخیں ہیں، دیوان میں رطب و یابس بہت نہیں ہی،

آزاد نے ٹھیک لکھا ہے کہ جو استادوں کے طریقے پائے ہیں انھیں سلیقے سے کام میں لائے ہیں، اس پر کثرت مشق نے صفائی کا رنگ دیا ہی کہ سب کوتاہیوں کا پردہ ہو گیا، اور انکو خود صاحب طرز مشہور کر دیا، آخر عمر تک لکھنؤ میں رہے اور وہیں سنہ ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے، ناسخ نے تاریخ کہی، ع

ہائے ہندوستان کا شاعر موا،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۱)

نام اسرار محبت رکھا تھا، دیوان ان کا تمام اصناف سخن پر مشتمل ہی،

دیر سے مجکو نہ کچھ کام نہ کعبہ سے غرض
کیوں گلہ کرتے ہوئے گبر و مسلماں میرا

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا
بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

بیکسوں کی خاک پر جو شوق سے آتا ہی جب ابر
اے فلک آنے دے وہ بھی آن کر رو جائیگا

درد کس کا مرے پہلو میں خلش کرتا ہی
یا الٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں
عاشقی کا تو تری نام ہر اک لیتا ہی
پر محبت سا کوئی عشق میں بدنام نہیں

الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو ہو
اس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

جو چاہے ہوش تو بیہوش ہو جام محبت سے
یہ بیہوشی ہی ایسی جس سے ہشیاری نہیں جاتی

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چنپئی رنگ اُس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی
اور جو بولے بھی ہے کچھ منھ سے تو شرمایا ہوا

میرے اور اُس کے جو پوچھو ربط کیا کیا کچھ نہ تھا
پر دل اُس کا پھر گیا ایسا کہ گویا کچھ نہ تھا

آئے جو مرے پاس تو منھ پھیر کے بیٹھے
یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

تجکو ہم اسلئے کہتے تھے کوئی دم مت جا
چل بسے ہم نہ ترے چلتے ہی چلتے دیکھا
اس کا بیمار نہ نکلا کبھی گھر سے جرأت
گھر سے تابوت ہی آخر کو نکلتے دیکھا

جستجو میں دل کے بہلانے کے جی کھونا پڑا
جو ہنسی کی بات تھی اُس کا ہمیں رونا پڑا

نسبت یہ کس مزے سے میں لذت کو اسکی دوں
کچھ دل ہی جانتا ہے مزا دل کی چاہ کا

فصلِ گل گرچہ ہزار آئی پر اپنا جرأت
دلِ پژمردہ نہ جوں غنچۂ تصویر کھلا

اور تو کیا مشغلے ہیں ہجر میں تیرے مگر
دل کی بیتابی سے سو سو بار اُٹھنا بیٹھنا

ہم اسیرانِ قفس کیا کہیں خاموش ہیں کیوں
راہ لگ اپنی چل اے بادِ صبا تجکو کیا

نزع میں بھی تری صورت کو نہ دیکھا افسوس
مرتے مرتے بھی نہ ارمان نظر کا نکلا

خدا جانے کریگا چاک کس کس کے گریباں کو
ادا سے اُن کا چلنے میں اُٹھا لینا یہ داماں کا

چین کیا ہو خانۂ ہستی میں خاک
جو یہاں آیا مکدر ہی گیا،

سر دیجئے راہِ عشق میں پر منہ نہ موڑیئے
پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہکن کی بات

گیا وہ دل ہی پہلو سے کہ جس کو
کبھی روتے تھے چھاتی سے لگا کر

دل ہی اس کافر کا پتھر ہو تو کوئی کیا کرے
ورنہ ایسی آہ سوزاں بے اثر میری نہیں

قیس و فرہاد کی تھی ایک ہی منزل لیکن
وہ بیاباں کی گیا راہ وہ کہسار کی راہ

تو نے اس باغ میں دم بھرنے کی مہلت پائی
اے صبا ہم نے تو اتنی بھی نہ مہلت پائی

وصل کے دن بھی میں کانپ اُٹھتا ہوں بیٹھے بیٹھے
یاد آتے ہیں وہ صدمے جو شبِ ہجراں کے

نہ ساماں ان کے رہنے کا نہ کچھ امید طالع سے
دلِ بیتاب سے کس منہ سے کہئے ٹک تحمل کر

دور سے کل ہم نے اُس کے آستاں کو دیکھکر
رو دیا کن حسرتوں سے آسماں کو دیکھکر

ہم اسیروں کو ملا ہے تنگ یاں ایسا قفس
زیر گردوں ٹک زمیں پر تلملا سکتے نہیں

جو دیکھا مضطرب مجکو تو محفل میں کسی نے وہ
یہ کہتا تھا کہ ہے لطفِ محبت رازداروں میں

اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں
تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

دلِ وحشی کو خواہش ہے تمھارے در پہ آنے کی
دوانہ ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

ناصح ہیں اور ہم ہیں ہیں طرفہ صحبتیں
ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جائے ہے

پوچھا یہاں تلک کہ ہوا تنگ نامہ بر
لذت ملی جو یار کے دشنام سے مجھے

کیا کہوں جرأت میں اُس صیاد قاتل کا گلہ
دام سے چھوڑا تو چھوڑا توڑ کر بازو مجھے

جوشِ گل چاکِ قفس سے دمبدم دیکھا کئے
سب نے لوٹی ہیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے

مستزاد کا رنگ ملاحظہ ہو،

جادو ہے نگہ چھب ہے غضب قہر ہے مکھڑا، اور قد ہے قیامت،

غارت گر دیں وہ بت کافر ہے سراپا ۔ اللہ کی قدرت
اٹکھیلی ہے رفتار میں گفتار کی کیا بات ۔ ہر بات جگت ہے
اور رنگ رخ یار ہے گویا کہ بھبھوکا ۔ پھر تس پہ ملاحت
ہیں بال یہ بکھرے ہوئے مکھڑے پہ دھواں دھار ۔ جوں دود بہ شعلہ
حسن بت کافر ہے خدائی کا جھگڑا ۔ ٹک دیکھیو صورت
ابرو فن خونریزی میں اسکے ہیں غضب طاق ۔ شمشیر برہنہ
آنکھوں کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں سے نہ دیکھا ۔ افسوس ہے اشارت
کان ایسے کہ کانوں سے سنے ویسے نہ اب تک ۔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے
بالے کے تصور میں مجھے گھیرے ہے گویا ۔ اک حلقۂ حیرت
بینی یہ خوش اسلوب کہ نتھنوں کی پھڑک دیکھ ۔ تڑپے ہے دو عالم
ہے اُس کو لب یار کے بوسہ کی تمنا ۔ ارمان ہے حسرت
دانتوں کی صفا کیا کہوں موتی کی لڑی ہے ۔ لب لعل کے ٹکڑے
مستی ہے بلا تس پہ رکھے پان کا بیڑا ۔ سو شوخی کی رنگت
دل خون کرے وہ دست حنا بستہ پھر اُس میں ۔ سمرن کی پھبن ہے
ہے وضع تو سادی سی پہ کیا کیا نہیں پیدا ۔ شوخی و شرارت
اس اُبھرے ہوئے گات کی کیا بات جسے دیکھ ۔ سب ہاتھ ملیں ہیں
اور ہاے ری ہریالی میں گردن کا وہ ڈورا ۔ ہے دام محبت
ہے عشوہ و انداز و ادا ناز و کرشمہ ۔ اور گرمی و شوخی
ہر عضو پہ آنکھ اٹکے وہ کافر ہے سراپا ۔ اک موہنی مورت

میر انشاء اللہ خاں انشاؔ

میر انشاء اللہ خاں خلف میر ماشاء اللہ خاں نجفی الاصل مرشد آبادی المولد لکھنوی المدفن دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بطریقۂ راسخہ شاعرانہ گفتہ اما در شوخی طبع وجودت ذہن او سخنی نیست (از گلشن بے خار)

غزلوں کا دیوان عجب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاورہ کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں، دیکھنے کے قابل ہیں، مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ ہیں جو غزلیں یا غزلوں کے اشعار با اصول ہو گئے وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں، اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں (از آب حیات)

نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو آزاد نے سمجھا ہے، پھر معلوم نہیں کہ ایک دوسری جگہ یہ کیا لکھ دیا ہے کہ "نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا گلشنِ بیخار جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پہ لگتا ہے، سید موصوف کے حال میں،" ہیچ صنف را بہ طریقۂ راسخہ شعرا نگفتہ"۔

میر انشاء اللہ خاں کی ولادت مرشد آباد میں ہوئی، ان کے والد میر ماشاء اللہ خاں بھی فضیلت علمی کے ساتھ شاعر بھی تھے، انھوں نے بیٹے کی تعلیم میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی، یہ بھی بلا کے ذہین و ذکی تھے، تھوڑے دنوں میں فارسی، اس کے بعد عربی میں خاصی استعداد پیدا کر لی، طبابت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ اُن کی خاندانی چیز تھی، شاعری کی طرف آئے تو آندھی کی طرح آئے، عربی فارسی، اور ریختہ تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی، بہاء الدین آملی کی نان و حلوا کے جواب میں شیر و برنج تیار کی جو حقیقت

میں بہت مزیدار ہے، نواب سعادت علی خاں کے شکار کا حال ایک مثنوی میں لکھا ہے، وہ بھی اچھی ہے،

مگر زیادہ توجہ ریختہ کی طرف رہی اور اخیر اخیر میں اسی کو اپنے فضل و کمال کا جولانگاہ قرار دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں تباہی کا سیلاب ہر طرف سے آیا ہوا تھا، مرشد آباد سے دلی آئے، بقول آزاد، اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اس کے شاہ عالم بادشاہ[۱] تھے، شاہ عالم نے شفقت کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا، یہ دربار میں داخل ہوئے اور چند روز دلی میں ہنسی خوشی رہے،

---

[۱] شاہ عالم کا نام عالی گوہر تھا، والد عزیز الدین عالمگیر ثانی عماد الملک وزیر کے ہاتھوں شاہ شطرنج بنے ہوئے بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، عالی گوہر سے باپ کی مجبوری اور اپنی تباہی دیکھی نہ گئی، کسی بہانے سے نکل کھڑے ہوئے کچھ دنوں نواب نجیب الدولہ سے ساز باز کرنے میں لگے رہے، اس کے بعد نواب شجاع الدولہ کے مشورہ سے نواب محمد قلی خاں صوبیدار الہ آباد کو بلایا اور ان کے جھنڈے تلے فوجیں فراہم کر کے عظیم آباد پر چڑھائی کی، وہاں راجہ رام نراین ناظم بنگالہ کی حیثیت سے صوبہ بہار کا حاکم تھا، اس نے قلعہ میں محصور ہو کر یہ مشہور کیا کہ نواب جعفر علی خاں کرنل کلفٹ کو لئے ہوئے مدد کو آرہے ہیں، محمد قلی خاں عظیم آباد تک پہونچ چکے تھے اور مورچے قائم کر لئے تھے، مگر اس خبر سے انکی ہمت جاتی رہی، عالی گوہر کا دائرہ دولت کرم ناسہ ندی کو عبور کر کے صوبہ بہار میں داخل ہوا ہی تھا کہ باپ کے قتل کئے جانے کی خبر آئی، وہیں سنہ ۱۱۷۳ھ میں شاہ عالم کا لقب اختیار کر کے بادشاہ ہو گئے، نواب شجاع الدولہ کو قلمدان وزارت، نواب نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کا خلعت روانہ کیا، نواب منیر الدولہ کو سفارت کے عہدہ پر نامزد کر کے احمد شاہ درانی کے دربار میں بھیجا، اور خود بدولت ایک مدت تک صوبہ بہار کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہے، کبھی فتح اور کبھی شکست ہوتی رہی، اور نواب شجاع الدولہ دور سے بیٹھے بیٹھے گھاتیں بتاتے رہے،

(بقیہ صفحہ ۲۵۹ پر)

نوجوانی میں جو اُمنگیں انسان کو ہوا کرتی ہیں وہ ان کو بھی تھیں، مگر اس وقت دلّی میں کیا دھرا تھا، جی اچاٹ ہوا تو لکھنؤ پہونچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی پیدا کی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۸) جب نواب قاسم علیخاں عالیجاہ کی انگریزوں سے بگڑ گئی اور وہ شکست کھا کر شجاع الدولہ کے پاس چلے آئے، تو شجاع الدولہ نے ان کے زر و جواہر پر قبضہ کیا، اس کے بعد شاہ عالم کو آگے رکھ کر انگریزوں سے لڑنے کو نکلے، جس کا انجام یہ ہوا کہ بکسر کے مقام پر ان کو شکست فاش ہوئی شجاع الدولہ بھاگ کر روہیلکھنڈ آئے اور انگریزوں نے شاہ عالم سے دیوانی ہر سہ صوبہ بنگال کی سند حاصل کر کے چھبیس لاکھ روپیہ نقد اور صوبہ الہ آباد و چکلہ کوڑا پر بادشاہ سے فیصلہ کر لیا،

شاہ عالم وہاں سے الہ آباد آئے اور سات برس یہاں رہے، اسکے بعد نواب منیر الدولہ کو یہاں کا انتظام سپرد کر کے ۱۱۸۵ھ میں دلی تشریف لے گئے، وہاں پہونچ کر مرہٹوں کی مدد سے نواب ضابطہ خاں خلف نواب نجیب الدولہ پر فوجکشی کر دی اور مرہٹوں نے اس کا سارا ملک دبا لیا، ضابطہ خاں نے بھاگ کر شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی، اور چند دنوں کے بعد تکوجی راؤ ہولکر کی سفارش سے دربار شاہی میں باریابی حاصل کی، صوبہ الہ آباد کا یہ انجام ہوا کہ نواب منیر الدولہ کے مرنے کے بعد شجاع الدولہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور چند سال تک وہاں کی آمدنی بادشاہ کو بھیجتے رہے، اس کے بعد یہ بھی بند کر دی،

ضابطہ خاں کا بیٹا غلام قادر بادشاہ سے دلی عناد رکھتا تھا، اس نے ۱۲۰۲ھ میں ایک دن موقع پا کر بادشاہ کو تخت سے کھینچ کر پچھاڑ دیا، اور پیش قبض سے ان کی دونوں آنکھیں نکال لیں، اور بیدار بخت پسر احمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا، شاہ عالم سلطنت کے ساتھ نور بصارت سے بھی محروم ہو گئے، مہاراجہ سندھیا کو خبر ہوئی تو انھوں نے فوج بھیجی جس نے قلعہ پر قبضہ کر کے شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بٹھایا، اور غلام قادر کو بھاگتے ہوئے پکڑ کر ہاتھ پاؤں کاٹ کاٹ کر بڑے عذاب سے مارا، مگر اس سے کیا ہوتا جو ہونا تھا ہو چکا، شاہ عالم نے خود اس واقعہ کو ایک قطعہ میں نظم کیا ہے، جو نہایت درد انگیز ہے، چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۰ پر)

وہ شاہ عالم بادشاہ کے بیٹے تھے، انھوں نے کچھ تو باپ کا غمخوار سمجھ کر اور کچھ اُن کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے ان کی سرپرستی کی اور اپنی غزلیں اصلاح کے لئے انکو دینے لگے، یہ دوسری [illegible] میں بھی لگے رہے، آخرکار تفضل حسین خاں علامہ کی سفارش سے نواب سعادت علیخاں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی، اور ان کا ستارۂ اقبال چمکا، پھر تو ایسے شیر و شکر ہوئے کہ نواب کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا،

([illegible])

ہر صبح حادثہ بر خاست پئے خواری ما
داد بر باد سر و برگ جہانداری ما
آفتاب فلک رفعت شاہی بودیم
برود شام زوال آہ سیہ کاری ما
چشم ما کندہ شد از دست فلک تیرہ نہاد
تا نہ بینیم کہ کند غیر جہانداری ما
داد افغان بچہ شوکت شاہی بر باد
کیست جز ذات مبرا کہ کند یاری ما

اس واقعہ کے بعد بڑی بے لطفی سے شاہ عالم نے زندگی بسر کی، برائے نام وہ تخت پر تھے اور حقیقت میں مرہٹوں کا راج تھا، چاروں طرف لوٹ مار جاری تھی، کوئی متنفس ایک گھڑی بھی چین سے سانس لینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا، بادشاہ شعر و سخن سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے، یہاں تک کہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں اس مخمصہ سے انکو نجات ملی، اردو کا کلام بھی کچھ ملاحظہ ہو،

کیجئے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا
ہم تو بندے اس کے ہوں وہ یار ہو اغیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اُس نے آہ
ہوجیو یارب برا اُس چشم آتشبار کا
دیکھکر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب
کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے
شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

مگر نواب کا مزاج قدرتی طور پر متین اور سنجیدہ واقع ہوا تھا، پھر ملکی و مالی کا سرانجام وہ اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتے تھے، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو حصۂ ملک اُنھوں نے شوقِ حکمرانی کی گھبراہٹ میں اپنے ہاتھ سے کھو دیا تھا، اس کا کانٹا ہر وقت ان کے دل میں چبھتا رہتا تھا، میر انشا اعتدال سے بڑھ کر ہنسوڑ تھے، اور ضرورت سے زیادہ ان میں تمسخر تھا، اس وجہ سے نواب کے ساتھ زیادہ دنوں تک نبھ نہ سکی، ۱۲۲۵ھ میں اقبال نے منہ موڑا، یہ دربار سے نکالے گئے،

آزاد کہتے ہیں کہ ایک دن نواب سعادت علیخاں نے انھیں بلا بھیجا، گھر پر نہیں ملے، خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی کے یہاں نہ جایا کرو، اس قید بے زنجیر نے انھیں بہت دق کیا، تازہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالی اللہ خاں جوان بیٹا مر گیا، اس صدمہ سے حواس میں فرق آگیا، یہانتک کہ ایک دن سعادت علی خاں ان کے مکان کی طرف سے نکلے، کچھ غم و غصہ کچھ دل کے بے قابو ہو جانے سے سر راہ کھڑے ہو کر سخت سست کہا، نواب نے جا کر تنخواہ بند کر دی

اس کے بعد مرزا سعادت یار خاں رنگین سے نقل کیا ہے کہ لکھنؤ میں انشا کے وہ وہ رنگ دیکھے، جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہوتا ہے، ایک تو وہ اوج کا زمانہ تھا کہ نواب کی ناک کے بال تھے، اور دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی، نالکی کے ہجوم سے راستہ نہ ملتا تھا، دوسری وہ حالت کہ ظاہر درست تھا، مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی، نواب کا حکم تھا کہ سوا دربار کے گھر سے نہ نکلیں، تیسری بار گیا تو انکو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پہ ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں سکول کا توبڑا اوڑھے ایک ٹھکر کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا، توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک کر جلدی سے

---

[1] آزاد نے انشا کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کیلئے نہایت موزوں ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲ پر

چوتھی بار جو گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا، ڈیوڑھی پر دستک دی، اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کون ہے، میں نے نام بتایا، وہ ہٹ گئیں، میں اندر گیا، دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں، تن برہنہ ہے، دونوں زانوں پر سر دھرا ہے، آگے راکھ کے ڈھیر ہیں، ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے، یہ دیکھکر بے اختیار دل بھر آیا، میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا، اور دیر تک رویا، جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا سیّد انشا! سیّد انشا! سر اٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں، آنکھوں میں آنسو نہیں، میں نے کہا کیا حال ہے، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا شکر ہے، پھر اسی طرح سر گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا،

آزاد نے انشا کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچی ہے کہ اسکو انھی کے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے، اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے، حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاءاللہ خاں کے نواسے تھے کہ سیّد انشا نہ مجنون ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علیخاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں، اور دربار میں بھی اس وقت حاضر ہوں جب انکو بلایا جائے، انشا نے اسی حبس بیجا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۱) اور اس کا ایک شعر یہ ہے

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انشاء کی اس زمانے کی تصنیف نہیں ہے، جو ان کے جنون اور بیچارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے، میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرہ مصحفی میں پڑھے ہیں، جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جس وقت انشا لکھنؤ پہونچے بھی نہ تھے، مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں، اور مرزا عظیم بیگ وغیرہ شعرائے دلی سے معرکے در پیش تھے، (۱۵)

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا
چساں کنم حرکت نوکری است یا بازی

تذکرہ خازن الشعرا مصنفہ سید میر نجاں الہ آبادی کے چند اقتباس اردوئے معلی کی تیرھویں جلد میں شائع ہوئے ہیں، اُن میں سید انشا کا بھی تذکرہ نظر سے گذرا، اور ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ جس زمانہ میں انشا اور مصحفی میں جھگڑا ہوا، اور ہجو تک نوبت پہونچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دیدیا تھا، وہ حیدرآباد گئے، اور اثنائے راہ سے ایک عریضہ شاہ محمد اجمل الہ آبادی کی خدمت میں بھیجا، ان کی درخواست پر شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اعمال ان کو لکھ بھیجے، چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے ان کو پھر لکھنؤ بلوا لیا، یہاں پہنچ کر شاہ صاحب کی خدمت میں انشا نے شکریہ کا خط بھیجا جو سید میر نجاں کو لکھتے وقت دستیاب نہیں ہوا

"ہنگامے کہ فیمابین میر و میاں مصحفی مناقشہ واقع شد و نوبت ہجو بکدیگر کشید وزیر الملک میر را از لکھنؤ رخصت انصراف داد و ایشاں بحیدرآباد رفتند از اثنائے راہ عریضہ بخدمت جد امجد علیہ الرحمہ ارسال نمودند و دراں یک بیت ہم بود ؎

یوں ہی بے شغل ہمارا کوئی دل رہتا ہے
ایک قاتل اسے ہر آن میں مل رہتا ہے

حضرت مرحوم بجوابش تحریر فرمودند، ؎

خوش باش دلت چرا خراشد

انشاء اللہ خیر باشد و چیزے از ادعیہ و اعمال مجرب بحسب طلب میر نیز ارسال فرمودند، بعد عرصہ قلیلے نواب وزیر میر را بہ لکھنؤ طلب فرمود، میر بہ لکھنؤ رسیدہ خط شکرگذاری بحضرت جد مرحوم نوشت، ہنگام جمع ایں ترجمہ آں خط باوجود تلاش بدست نیامد"

بہرحال اس میں شبہہ نہیں کہ آخر میں نواب وزیر انشا سے ناخوش ہو گئے تھے، تنخواہ جاری رہی، مگر آزادی سے محروم ہو کر سنہ ۱۲۳۳ھ میں دنیا کے مخمصوں سے نجات پائی،

کلیات ان کا چھپ گیا ہے، اس میں ایک دیوان فارسی کا ہے، ایک اردو کا، جسمیں قصیدے، غزلیں، قطعے، خطوط منظوم، رباعیاں، پہیلیاں، چیتانیں، ہجویں اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں، فارسی اردو کے سوا ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کچھ کچھ کہا ہے بقول آزاد "ابھی پنجاب میں کھڑے ہیں، ابھی پورب میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، ابھی برج بھاشی ہیں، ابھی مرہٹے، ابھی افغان، ابھی کشمیری، چند ساعت بھی اپنے رفیق تمسخر سے جدا نہیں ہوتے،

آزاد نے بطور معذرت کے میاں بیتاب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا، اور شاعری کو سعادت علیخاں کی مصاحبت نے ڈبویا،" مگر میں اسکو تسلیم نہیں کرتا، وہ یہ کہتے کہ ان کی شاعری کو تمسخر نے ڈبویا تو یہ بات ماننے کے قابل ہوتی۔ میر انشا کو نواب تک رسائی نہیں ہوئی تھی، جب بھی تو یہی میر انشا تھے جو مرزا سلیمان شکوہ کے مکان کے پاس لب دریا ایک مہنت دھرم مورت بنکر جا بیٹھے، اور خوب زور شور سے اشلوک پڑھنے اور منتر جپنے شروع کر دیئے، جو لوگ اشنان کیلئے آتے وہ الغرض خواہ مخواہ ہر آدمی دیکھکر انہی کی طرف جھکتے، تھوڑی دیر میں اناج، آٹا، پیسے کوڑیوں کے ڈھیر لگ گئے وہ بھی اس قدر اور سب سے زیادہ (دیکھو آب حیات صفحہ ۲۹۲)

اصل بات وہی ہے، جس کو آزاد نے کتاب میں نہیں حاشیے میں بیان کیا ہے کہ "ان کے بزرگوں کو سرکار سے شہدوں کو تقسیم وظائف کی خدمت سپرد تھی، ان کے بھائی جب دلی میں آئے تو وہ بھی ایک بارہ کا کنٹھا گلے میں پہنے تھے، چنانچہ میر انشاء اللہ خاں نے آزادوں کے انداز میں مستزاد کہہ کر داد زباندانی کی دی ہے۔" سید انشا کی ذکاوت اور جودت ذہن میں کچھ شبہہ نہیں، بچپن میں انسان کی طبیعت اخاذ ہوتی ہے، شہدوں کی باتیں بچپن سے ان کے کانوں میں پڑی ہونگی، ان کی ہنسانے والی باتوں نے غیر محسوس طریقہ پر اُن کی طبیعت پر

قابو پالیا، اور انہی باتوں کا جلوہ ان کی زندگی کے تمام کارناموں میں نمایاں ہے، نواب سعادت علیخاں جیسے خشک مزاج کو اس میں مطلق دخل نہیں،

میرا تو یہ خیال ہے کہ سید انشا جیسا ذکی و ذہین آدمی اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا تو سعادت علیخاں کے مزاج میں درخور ہو جانے پر وہ کوئی اور چیز بن جاتا، اور اس کا دیوان لطائف و ظرائف سے مالامال ہونے کی جگہ ملک کے سامنے آج ایک نیا نمونہ پیش کرتا،

وہ قصیدہ دیکھو جو جارج سوم کے جشنِ تہنیت میں کہا ہے، اس کو نواب سعادت علیخاں کی مصاحبت کا ثمرہ کہو تو بجا ہے، اسی کے ساتھ اسکا بھی افسوس کرنا چاہیے کہ ایسا قادر الکلام اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا تو ملک کے لئے کس قدر مفید ثابت ہوتا،

بگیاں پھولوں کی تیار کرائے ہوئے سمن　　کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن
عالمِ اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور　　گودیے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر　　کرسیٔ ناز پہ جلوہ کے دکھاویگا پھبن
شاخِ نازک سے کوئی ہاتھ میں لیکر اک کنت　　ہو الگ سب سے نکالے گا نرالا جوبن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھاویگا رنگ　　کوچ پر ناز کے جب پانوں رکھیگا بن ٹھن
اپنے گیلاس شگوفہ بھی کریں گے حاضر　　آگے جب غنچۂ گل کھولیں گے بوتل کے دہن
اہلِ نظارہ کی آنکھوں میں نظر آویں گے　　باغ میں نرگسِ شہلا کے ہوائے چتون
اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے　　اودی بانات کی کرتی ہے شکوہ سوسن
پتے ہل ہل کے بجاویں گے فرنگی طنبور　　لالہ لادیگا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تار رگِ ابرِ بہاری سے کئی　　خود نسیمِ سحر آویگی بجاتی ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلاویں گے　　آپڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن

نے نوازی کیلئے کھول کر اپنی منقار
آکے دکھلاویگی بلبل بھی جو ہے اسکا فن
اردلی کے جو گرانڈیل ہیں ہونگے سب جمع
آن کر اپنا بگل پھونکے گا جب سکھدرشن
آئیگا نذر کو شیشہ کی گھڑی لیکے حباب
یاسمیں پتوں کی پینس میں چلے گی بن ٹھن
نکہت آویگی نکل کھول کلی کا کمرا
ساتھ ہو لیگی نزاکت بھی جو اُسکی ہے بہن
حوض صندوق فرنگی سے مشابہ ہونگے
اسمیں ہوویں گے پریزاد بھی سب عکس فگن

ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں ،

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اُسکا
حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن

غزلوں کے منتخب اشعار

لگاکے برف میں ساقی صراحی مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے، جلد وہ شے لا

یہ عجب مزا ہے یارو کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

دل لگایا ہے کہیں انشا نے شاید دوستو
اندنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی
بھول جاتا ہوں ولے تیری مدارات کے وقت

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہمصحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہے نہاں لطف و کرم چینِ جبیں کی تہ میں
ہاں چھپی صاف ہے اک اُن کی نہیں کی تہ میں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

جی میں کیا آگیا، انشا کے یہ بیٹھے بیٹھے
کہ پسند اُس نے کیا عالمِ تنہائی کو

چند مدت سے فراقِ صنمِ دیر تو ہے
چلو پھر کعبہ ہی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

غصے میں ترے ہم نے بڑا لُطف اُٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

رونے سے اپنے دل کی تپش گرد ہو گئی
دو چار بوندیوں میں ہوا سرد ہو گئی

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اُسکی ہم انشا
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

مرزا سعادت یار خاں رنگینؔ

در نشست الفاظ و چیدگی کلمات و درستی عبارت و ایراد و الفاظ مقابلہ و صحت محاورہ چناں بود کہ ہرچہ کملائے ہم عہدش از ایراد بعض الفاظ رکیکہ ہندی و تنگی نشست آں بعد رفع کلمات ثقیلۂ قدما رجائز نبند اشتند و در شعر خود ہا درج کردند آں ہم از اشعار خود برانداخت داده - (مجموعہ نغز [illegible])

سعادت یار خاں نام، رنگین تخلص تھا، ان کے والد مرزا طہماسپ بیگ خاں توران سے آکر چند روز لاہور میں نواب حسین الملک میر منو رخاں کی سرکار میں ملازم رہے، اس کے بعد دلی میں نواب ضابطہ خاں اور نواب نجف خاں وغیرہ امرائے دربار کے ساتھ نوبت بہ نوبت آسودگی سے زندگی بسر کی،

رنگین کی ولادت سرہند میں ہوئی، مگر نشو و نما دلی میں پایا، سپاہی کے بیٹے تھے، شہسواری اور تیر اندازی میں خوب کمال پیدا کیا، گھوڑوں کے پہچاننے اور ان کے معالجہ میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے،

ان کی عمر کا بیشتر حصہ شاہزادوں کی مصاحبت میں بسر ہوا، کبھی کبھی تجارت کا مشغلہ بھی کر لیتے تھے، اسی تقریب سے لکھنؤ کئی بار آئے اور شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ[1] کی سرکار میں

---

[1] مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ دہلی بڑے علم دوست اور ہنر پرور شاہزادے تھے، باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی، جس وقت شاہ عالم سلطنت کے ساتھ غلام قادر کی نمک حرامی سے نور بصارت بھی کھو بیٹھے، اس کے دوسرے دن کسی بہانہ سے قلعۂ معلی سے نہایت بے سر و سامانی کیساتھ نکل کھڑے ہوئے، رامپور میں نواب فیض اللہ خاں نے اپنی حیثیت کے موافق پیشکش نذر گذرانی، جس سے کچھ سامان درست کیا، اور سنہ ١٢٠٥ھ میں لکھنؤ پہنچکر تین کوس پر خیمہ کیا، ان سے پہلے مرزا جواں بخت آچکے تھے، اور نواب آصف الدولہ نے انکی بڑی آؤ بھگت کی

عزت و احترام سے عرصہ تک رہے، آخر عمر میں تجارت اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، اور وہیں سنہ ۱۲۵۱ھ میں اسّی برس کی عمر پاکر وفات پائی،

(بقیہ حاشیہ ۲۶۸) مگر صحبت برآر نہ ہونے سے انکو بنارس جانے کی تکلیف دی گئی، اسی بنا پر اس مرتبہ نواب نے حاضری سے معذرت کی اور نواب گورنر جنرل پر ٹالا، تین مہینے تک مرزا سلیمان شکوہ پانچہزار سوار و پیدل و شاگرد پیشہ کی جماعت سے لکھنؤ سے تین کوس پر ڈیرے ڈالے ہوئے پڑے رہے، تین مہینے کے بعد لارڈ کارنوالس کی تحریک سے نواب وزیر استقبال کو نکلے، اور شہزادہ کو ہاتھی پر سوار کر کے خود خواصی میں چنور لیکر بیٹھے اور نہایت تجمل کیساتھ شہر میں اُتارا، اور چھ ہزار روپیہ ماہوار ان کے جیب خرچ کیلئے مقرر کر دیئے، کچھ دنوں شہزادے نے ریزیڈنسی کے قریب مرزا خلیل کے بنگلہ میں لب بام قیام کیا، اس کے بعد جنرل مارٹن کی ڈیڑھی کوٹھی خرید کر کے اسمیں مستقل سکونت اختیار کی اور عرصہ دراز تک لکھنؤ میں عزت و احترام سے رہے، نواب وزیر عہد بعہد ان سے فدویانہ سلوک کرتے رہتے تھے، خود نواب آصف الدولہ باوجود تنعم و نازپروری پانچوں ہتھیار لگائے ایک ہاتھ الاچی ادھ گلوری کی نوازش پر آداب گاہ جا کر بار بار آداب بجالاتے تھے، جب نواب غازی الدین حیدر نے لارڈ ماڑا کے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کے اشارے سے خطاب بادشاہی قبول کیا تو انکو خواہش ہوئی کہ مرزا سلیمان شکوہ مساویانہ حیثیت سے ملاقات کریں، جان مسٹن ریزیڈنٹ لکھنؤ نے شاہزادہ سے کہلا بھیجا کہ اب تک نواب وزیر تھے وہ بآداب وزارت حاضر ہو کر نذر دیا کرتے تھے، اور خلعت پہنتے تھے، اب بحکم گورنمنٹ انگریزی وہ بادشاہ ہوئے ہیں، لہذا ان سے حضور مساویانہ حیثیت سے ملیں، شاہزادے نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے، میں ملاقات کرونگا تو اسی طرح سے کرونگا، پھر ریزیڈنٹ نے کہلا بھیجا کہ کل بادشاہ اور فدوی ملنے کو آئیں گے، ملاقات کے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے، شاہزادے کو ناگوار ہوا، مگر مجبور، دوسرے روز بادشاہ اور ریزیڈنٹ مع امرا وارکان دولت شاہزادے کے جلوخانہ میں تشریف لائے، نواب ناظر نے چلمن اُٹھائی اور حسب دستور آواز دی، اہل دربار خبردار ہو جاؤ، حضور برآمد ہوتے ہیں، شاہ اودھ نے موافق اپنی عادت کے ذرا خم ہو کر سلام کیا، اور چوبدار نے آواز دی جہاں عالم و عالم پناہ سلامت، شاہزادے نے سلام کا جواب بطریقہ اسلام دیا، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۰ پر)

شعر و سخن کا شوق عنفوانِ شباب سے تھا، شاہ حاتم سے مشقِ سخن کی اور چند دنوں کی محنت و جانکاہی میں اپنے بہت سے ہمعصروں سے آگے نکل گئے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۹) فقط یہ کیا کہ دہنے ہاتھ میں شاہ اودھ کا ہاتھ، بائیں میں رزیڈنٹ کا ہاتھ لیکر دیوان خاص میں ایک ڈنگل پر اپنے پاس شاہ اودھ کو بٹھا لیا، رزیڈنٹ سامنے کرسی پر بیٹھے، فرمایا کہ سرکار کمپنی کی خوشی ہو گئی، تمھارا محل قریب المرگ ہے، میں اسکو سکرات میں چھوڑ آیا ہوں، اسوقت فرصت نہیں ہے، پھر ملاقات ہوگی یہ کہکر اٹھ کھڑے ہوئے کشتیاں آئیں، شاہ اودھ نے ایک شاہی رومال اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا، اور اسی طرح مکان خاص تک آ کر رخصت کیا، مگر دل میں بہت کبیدہ ہوئے، اُس دن سے پھر نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات نہیں ہوئی، بادشاہ کو یہ دھن تھی کہ میں بادشاہ ہوا ہوں تو میرے بیٹے کی شادی تیموریہ خاندان میں ہونی چاہیے جوڑ توڑ لگا کر اور شے دلا کر شاہزادے کے مصاحبوں کو ہموار کر کے نصیر الدین حیدر کی شادی مرزا سلیمان شکوہ کی بیٹی سے کر لی، چھ ہزار پہلے سے تھے ایکہزار روپیہ ماہوار شادی کے وقت اور پانچہزار مسادیانہ ملاقات کے وقت جملہ بارہ ہزار ماہانہ پیشکش مقرر ہو گیا، جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور انھوں نے ہاتھ پاؤں نکالے تو ایک لڑکی پر ڈورے ڈالے جسکو شہزادی بیگم نے پرورش کیا تھا، اور اسکا نام قمر چہرہ تھا، پہلے تو گفت و شنید رہی اسکے بعد کٹنی کو بھیج محل سے اڑوا لیا، شاہزادہ کو سخت ناگوار ہوا، رزیڈنٹ تک بات پہونچی، اُسنے بادشاہ کو سمجھا کر قمر چہرہ کو واپس کرا دیا، مگر شاہزادے ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ کرنل کارن رئیس کاسگنج کو بلا بھیجا، اُسکی پوتی شاہزادے کی بیٹے سے منسوب تھی، انہی کے ساتھ کاسگنج چلے گئے، پانچہزار روپیہ جو غازی الدین حیدر نے بوقت ملاقات مسادیانہ مقرر کئے تھے وہ بند ہو کر سات ہزار میں سے ایکہزار خزانہ شاہی سے اور چھ ہزار بتوسط رزیڈنٹ شاہزادہ کو ملتے رہے، وہاں یہ گل کھلا کہ کرنل صاحب کے بیٹے قمر چہرہ کو لے اڑے، اور الور جا کر عیش کرنے لگے، اس سے شاہزادہ وہاں سے بھی دل برداشتہ ہو گئے، اور اکبر آباد جا کر بود و باش اختیار کی آخر کار ذیقعدہ سنہ ۱۲۵۳ھ میں فوت ہو کر سکندرہ مقبرہ اکبر شاہ تیموری میں مدفون ہوئے، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۱ پر)

شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ رنگین کی طبیعت ایجاد پسند واقع ہوئی تھی، اسی بنیاد پر ریختہ سے ریختی نکالی، جس کو ان کے لنگوٹیے یار میر انشاء اللہ خاں نے چمکایا، اور لکھنؤ میں یہ رنگ خوب مقبول ہوا،

رنگین ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے، ہر رنگ میں اُنھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں جو ان کے مجموعۂ تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے،

رنگین کے مجموعۂ تصانیف کا نام نورتن ہے، جسمیں چار دیوان اُردو کے ہیں، ریختہ، بیختہ، آمیختہ، انگیختہ، ان میں سے تیسرا دیوان ہزلیات کا ہے، جسمیں ایک قصیدہ شیطان کی مدح میں بھی ہے، چوتھا دیوان ریختی کا ہے،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۰) شاہزادہ کو شعر و سخن کا بہت ذوق تھا، جب تک دلی میں رہے شاہ حاتم کو کلام دکھاتے تھے لکھنؤ میں ولی اللہ محب شاگرد مرزا رفیع سودا پھر شیخ غلام ہمدانی مصحفی، پھر انشاء اللہ خاں کو سرفراز فرمایا،

رہ گئے ہوش و حواس و خرد و طاقت سب — یوں ترے کوچے سے میں بے سر و ساماں نکلا
تیرے بیمار کی سنتے ہیں یہ حالت ہے کہ اب — جو گیا اُس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا

جان دی راہ محبت میں الٰہی صد شکر — بات جو ہم نے کہی تھی سو بناہی صد شکر

غیر کا نام جو تم پیار سے لیتے ہو تو بس — ایک برچھی ہے کہ پہلو میں چبھو دیتے ہو

جبہ سائی کا نشاں جائے جبیں سے کیونکر — کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں
تاج و تخت اپنے سلیماں کو یا شاہ نجف — آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں

علاوہ ازیں اُن کی پانچ کتابیں اور بھی ہیں، ایجادِ رنگیں، فرس نامہ، رنگین نامہ، مجالس رنگین، مثنوی دلپذیر، جو زبان کی صفائی و پاکیزگی میں سحرالبیان کے بعد اُس زمانہ کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے،

وہ آیا تھا یہاں اے حضرتِ دل بھول شب کو   جو تم اُس وقت پہلو سے نہ چلاتے تو کیا ہوتا
وہاں اپنی ہی اپنی پڑ گئی اے ہمدم ہو جا کر   کوئی مطلب کی میری بات فرماتے تو کیا ہوتا
نصیحت رات دن ناصح کیا کرتے ہو ناحق تم   اُسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

کھینچ لائی ہے اُسے اے کششِ دل یہاں تک   بارے صد شکر کہ تجھکو بھی یہ مقدور ہوا

جو نالہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا   تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا

آج آنا ہے نہیں آتا تو دے مجھکو جواب   بھیج کر پیغام جھوٹے روز مت حیران کر
دل بغل سے لیگئی رنگیں وہ دزدیدہ نگاہ   ورنہ دل دیتا ہے کون اپنا کسی کو جان کر

دل تھا جو بساط اپنی سو گذران چکے ہیں   جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

نرگس کو وہ چمن میں کیا بھر نگاہ دیکھے   وہ انکھڑیاں نشیلی جسکو خوش آئیاں ہیں

نبھے گی صحبت اُس سے کس طرح کچھ کہہ نہیں سکتے   وہ ہرجائی ہے اور بن شغل ہم بھی رہ نہیں سکتے

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں ہوتا ہے　　مجکو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے
جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی　　کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں ہوتا ہے

جو کوچے میں اُس نازنیں کے نہ ٹھہرے　　تو پھر یہ کہو ہم کہیں کے نہ ٹھہرے

وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگیںؔ　　اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

دمبدم بس کہ ترا حسن فزوں ہے ظالم　　روز جی میں ہے کہ کھنچوائیے تصویر نئی

حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ

جوان حلیم و سلیم و خوش فکر و شیریں گفتار، استفادہ شعر از خواجہ میر دردؔ کردہ بلکہ ذات شریفش را ہمیشہ از کاملین قیاس می کرد، آخر پیش بچشم فقیر تحصیل علم طب کردہ نام بطبابت برآورد دیوان ریختہ اش شستہ و رفتہ است، فقیر در شاہجہان آباد بود، رابطۂ دوستی او روز بروز ترقی داشت (تذکرہ مصحفی)

ثناء اللہ خاں نام، فراقؔ تخلص، حکیم ہدایت اللہ خاں کے بھتیجے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں حضرت خواجہ میر دردؔ اور ان کے شاگردوں اور مریدوں کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی حکیم قدرت اللہ خاں قاسمؔ[1] (متوفی سنہ ۱۲۴۶ھ) سے طب کی درسی کتابیں پڑھ کر

---

[1] حکیم قدرت اللہ خاں عباسی قاسمؔ تخلص، دلی کے نامور عالموں اور طبیبوں میں شمار کئے جاتے تھے، مولانا فخرالدین علیہ الرحمہ سے بیعت تھی، شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، شعرائے اردو کا ایک بسیط تذکرہ لکھا ہے (بقیہ حاشیہ ص ۲۷۴ پر)

انھی کے مطب میں نسخہ نویسی کی اور اس فن میں ایسی استعداد بہم پہنچائی کہ چند روز کے بعد ان کا شمار دلّی کے مشہور اور نامور طبیبوں میں ہونے لگا، اور دلّی جیسے شہر میں یہ مرجع اور مقصد بن گئے، شعر و سخن سے اُن کو خداداد مناسبت تھی، حضرت خواجہ میر دردؔ کے فیضِ صحبت سے اسمیں ترقی ہوئی، اور چند روز کی مشق میں اُنھوں نے قدرتِ کاملہ بہم پہنچائی،

خبر دیتا تھا کس کے وصل سے شوقِ ہم آغوشی
کہ میرا رات کو کچھ خود بخود بازو پھڑکتا تھا

جوں ریگِ رواں خانہ نشیں ہوں میں ازل سے
نہ قصدِ وطن کا نہ ارادہ ہے سفر کا

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

صاف دل کو کیا اور داغِ جگر کو دھویا
کام کیا کیا نہ مرے دیدۂ تر سے نکلا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳) جو میری نظر سے نہیں گزرا[ل]، دیوان بھی دیکھنے میں نہیں آیا، گلشن بیخار میں جو شعر نواب مصطفےٰ خاں نے نقل کیے ہیں، اُن میں سے چند یہ ہیں:-

ہمیں بھی رخصتِ سیرِ چمن ہو ٹک صیّاد
کہ اب کی شور ہے ظالم بہار آنے کا

وہ آئے بغل میں کہیں یا جی ہی نکل جائے
مٹ جائے کسو طرح تو یارب خلشِ دل

جان جاوے یا رہے دانستہ دیکھیں گے اُسے
ہے ارادہ یہ مصمم دیکھیے کیسی بنے

[ل] اب لاہور میں چھپ گیا ہے۔ (س)

بعد مرنے کے بھی اک گردش رہی ہمکو مدام
مشتِ خاک اپنی رہی تھی کچھ سو پیمانہ بنا

انگلیاں گھس گئیں ہاں ہاتھوں کو ملتے ملتے
لیکن افسوس نوشتہ نہ مٹا قسمت کا

حسرت ذرا بھی دل کی نہ نکلی ہزار حیف
نکلا اِدھر وہ گھر سے اُدھر جی نکل گیا

سمجھے تھے دامِ زلفِ سیہ ہے بلاے جاں
پر کیا کریں کہ لے گئی تقدیر کھینچ کر

خوش آتی ہیں پاؤں کی تری ٹھوکریں ظالم
سر کو کبھو قدموں سے اٹھانے کے نہیں ہم

کس زلف کا شیدا ہے مرا دل نہیں معلوم
کس چشم کا زخمی ہے یہ بسمل نہیں معلوم
ہر غنچہ میں بو ہے تری، ہر گل میں ترا رنگ
جس پر بھی تری شکل و شمائل نہیں معلوم
سمجھائے کسی کے بھی سمجھتے ہیں دوانے
کیوں پاؤں میں پڑتی ہیں سلاسل نہیں معلوم
مجنوں کے سوا دیکھئے اب دشتِ جنوں میں
ہو کون فراق اپنے مقابل نہیں معلوم

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں
بھولے سے اُس نے یاد کیا ہو عجب نہیں

آنکھ اُس شوخِ ستمگر سے لڑا بیٹھے ہیں
بس چلے یا نہ چلے جی تو چلا بیٹھے ہیں

تم گالیاں جو دو تو میں چسکی بھی کیا نہ لوں
پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زبان چلے

دور سوم

از طبقۂ متوسطین

شاہ نصیر الدین نصیر

پیرزادہ میر صدر جہان است، جوان خوش گو فقیر در ایامے کہ در شاہجہان آباد بود اکثر در مشاعرہ می آمد، در ہمہ عالم تو مشقی در طبعش روانی بود، حالا می گویند کہ قوت شاعری بسیار پیدا کردہ (اھ تذکرۂ مصحفی)

از مدت شصت سال بر سر عشق ریختہ است باکثر معمورہائے مشہور مثل لکھنؤ و حیدر آباد کمیر رفتہ و بہ شعرائے اشتہر ہر دیار برخوردہ و مطارحۂ مشاعرہ کردہ و بہ استادی نام برآوردہ (اھ گلشن بیخار)

شاہ نصیر الدین دلی کے رہنے والے تھے، ان کے والد شاہ غریب نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی، مگر ان کی قسمت میں شاعری کے سوا اور کچھ نہ تھا، طبیعت کا رجحان ادھر پا کر شاہ محمدی مائل[1] کے شاگرد ہو گئے۔

---

[1] شاہ محمدی مائل بھی دلی کے رہنے والے تھے، فقر و تصوف کی طرف مزاج مائل تھا، آزاد کہتے ہیں کہ مشق سخن قیام الدین قائم سے کی تھی، مگر میر حسن فرماتے ہیں کہ شاہ قدرت اللہ قدرت کو کلام دکھلاتے ہیں، گلشن بیخار میں بھی انکو قدرت کا شاگرد لکھا ہے، دلی کی تباہی کے وقت مرشد آباد چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی، کیا عجب ہے کہ ابتدا میں شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لی ہو اور جب مرشد آباد میں رہنے لگے تو شاہ قدرت اللہ کے شاگرد ہو گئے ہوں، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۷ پر)

چند روز کی مشق میں اچھا کہنے لگے، شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ تھا، وہ خود شاعر تھے اس وجہ سے بآسانی دربار تک رسائی ہو گئی، شعرائے دربار کے ساتھ یہ بھی طبع آزمائی کرتے رہے،

دربار شاہی سے ان کے بزرگوں کے نام چند گاؤں آل تمغا معاف تھے، خاندانی عظمت کے ساتھ اہل کمال کو عیدوں اور جشنوں میں انعام بھی ملتا رہتا تھا، اس سے گذر ہوتی تھی، مگر انکی بلند پروازی کی آنکھیں لکھنؤ اور حیدر آباد کو ڈھونڈتی تھیں، جہاں سونے اور چاندی کی گنگا جمنا بہ رہی تھیں،

دو بار لکھنؤ آئے، پہلی مرتبہ مصحفی اور انشاء کا زمانہ تھا، مشاعروں میں غزلیں پڑھیں اور داد سخن پائی، دوسری بار آئے تو زمانہ پلٹا ہوا پایا، شیخ امام بخش ناسخ نے عہد قدیم کو منسوخ کر دیا تھا اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لوگوں کو گرما رکھا تھا، اس لئے ان کی جیسی قدر ہونی چاہئے تھی، اس مرتبہ نہ ہوئی،

حیدر آباد میں راجہ چندو لال دیوان[1] تھے جنکی سخاوت کا گھر گھر چرچا تھا، یہ وہاں پہونچے،

حال کہنے کی نہ دی گریہ نے فرصت رات کو
آج پھر کہیو اُسے مائل وہ کیا افسانہ تھا

(نغمۂ [illegible] ص ۲۷۲)

کیا کیا کہوں میں تجھ سے دلِ زار کی ہوس
مشہور ہے جہاں میں بیمار کی ہوس

کہتا نہ تھا کہ باز آ ہر دم کی اس ہنسی سے
آخر گیا نہ ظالم اک بے گناہ جی سے

[1] راجہ چندو لال کا "راجہ راجایان" مہاراجہ بہادر خطاب تھا، قوم کا کھتری تھا، اس کا پر دادا مولچند نواب آصفجاہ اول کے ساتھ حیدر آباد گیا تھا، آصفجاہ نے اسکو کروڑگیری کے محکمہ کا افسر اعلیٰ مقرر فرمایا، اس کے بعد اس کا بیٹا لچھمی رام، پھر اس کا بیٹا نانک رام اسی خدمت پر سرفراز ہوا،

نانک رام چندو لال کا چچا تھا، اُس نے چندو لال کو باپ کے مرنے کے بعد پرورش کیا، اور عمدہ تعلیم دلائی، جب نانک رام مرا تو اس کا بیٹا نکھت رائے مقرر ہوا، (بقیہ حاشیہ ص ۲۷۸ پر)

تو ان کے جواہرات نے خاطر خواہ قیمت پائی، مگر دلی کا چٹخارہ ایسا نہ تھا کہ انسان بھول جائے اس لئے انعام واکرام سے مالا مال ہو کر واپس آئے، اور تین بار پھر گئے، چوتھی بار جانے کو تھے کہ راجہ چندولال نے سات ہزار روپیہ بھیج کر بلا بھیجا، وہاں پہونچے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۷) وہ دو ہی برس کے اندر مر گیا، اسکی جگہ چندولال کو ملی، یہ تعلیمیافتہ، فریس و فہیم نہایت محنتی وجفاکش، سرکاری کام میں چست وچالاک تھا اور ہر ایک کام کو بذات خود انجام دیتا تھا،

اُس نے اپنی ہوشیاری سے دربار آصفجاہی میں رسائی پیدا کی اور سنہ ۱۲۱۲ھ میں کڑپہ وغیرہ ممالک مفتوحہ کا انتظام اور خطاب ’’راجہ بہادر‘‘ اس کو عنایت ہوا، اور سنہ ۱۲۱۹ھ میں پیشکاری کے عہدۂ جلیلہ پر ترقی کی،

اس زمانہ میں نواب منیر الملک وزیر تھے، ان کی ناقابلیت کی وجہ سے سارا انتظام ملکی ومالی اسکے ہاتھ میں آگیا، سنہ ۱۲۳۵ھ میں ’’مہاراجہ بہادر‘‘ کا خطاب، ہفت ہزاری منصب، نوبت، گھڑیال، جواہر گراں بہا اور جاگیر سے سرفرازی پائی، سنہ ۱۲۴۵ھ میں راجہ راجایان کا خطاب ملا اور باوجودیکہ عہدہ وہی رہا مگر وزارت اور دیوانی کے اختیارات اسکے قبضۂ اقتدار میں آگئے، نواب منیر الملک صرف خطاب وجاگیر کے مالک تھے،

لکھنؤ میں آغا میر کو جو دسترس واقتدار حاصل تھا، وہ اس کو حیدرآباد میں ہوا، اور لطف یہ کہ دونوں ہمعصر اور سخاوت وفیاضی میں ایک دوسرے کی نظیر تھے، فرق اتنا تھا کہ آغا میر کی گرم بازاری جوڑ توڑ اور سازش کی بدولت تھی اور یہ اپنی قابلیت کے زور سے کام نکالتا تھا، یہی وجہ ہے کہ آغا میر کا ستارۂ اقبال گیارہ برس چمک کر ماند پڑ گیا، اور اُس نے پچاس برس تک والاجاہی کی،

اس سخاوت وفیاضی کے کارنامے اتنے زبان زد ہیں کہ ان کے لکھنے کی حاجت نہیں، ہمارے بچپن تک کوئی حیدرآباد سے آتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ فلاں شخص چندولال کے حیدرآباد سے آیا ہے، اگر جاتا تو کہتے کہ چندولال کے حیدرآباد جاتا ہے، گویا حیدرآباد کی نسبت چندولال کی طرف ہو گئی تھی، اس سے اسکی نیکنامی اور شہرت کا اندازہ کرنا چاہئے،

اس کا معمول تھا کہ صبح سے بارہ بجے رات تک مہمات سلطنت میں مشغول رہتا تھا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹ پر)

تو پچیس روپیہ یومیہ ان کا مقرر ہو گیا، مگر افسوس ہے کہ اس مرتبہ ان کو دلی آنا نصیب نہیں ہوا، وہیں سنہ ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی،

شاہ صاحب نے خود اپنا دیوان مرتب نہیں کیا، ان کے مرنے کے کچھ دنوں بعد میر حسین تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمن نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ان کے کلام کا جمع کیا، جس کو نواب رامپور نے خرید لیا، مگر حیدرآباد میں ان کی غزلوں کا مکمل دیوان ان کے کسی شاگرد کے پاس تھا، وہ چھپ گیا ہے، اس میں صرف غزلیں ہیں، قصائد، قطعات، رباعیاں اور مخمس وغیرہ کچھ بھی نہیں ہیں،

کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں، زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں، جس میں شعر کا سر سبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں، زبان سید انشا اور جرأت کی ہے کچھ الفاظ ان کے ہاں متروک ہیں، مگر اتنے نہیں ہیں کہ ناسخ و آتش کے ساتھ ان کو جگہ دی جائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۵) اس کے بعد شعرا اور علما حاضر ہوتے ان سے مشاعرہ و مذاکرہ رہتا، اس میں ڈھائی بج جاتے اس کے بعد خوابگاہ میں جا کر استراحت کرتا تھا،

کم و بیش پچاس برس تک پیشکاری کی خدمت انجام دینے کے بعد سنہ ۱۲۶۰ھ میں مستعفی ہوا، اور سنہ ۱۲۶۱ھ میں بیاسی ۸۲ عمر میں جی کر زندگی سے استعفیٰ دیدیا، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتا تھا، اور شاداں تخلص تھا،

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

شاداں وہاں بھی کیا ہے حسینوں کی انجمن
جاتے ہیں لوگ کیوں عدم آباد کی طرف

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقت صبح صادق کو
اثر رکھتی ہے اگر ہو دعائے صبح صادق ہو

افسوس کہ نرگس کی طرح باغ جہاں میں
کچھ ہم نے بجز حسرت دیدار نہ پایا

کمان و تیر نمط مجکو ربط تھا اُس سے
جب اُس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

آہ کچھ ہم کو نہ تھی فرصت یکدم کی خبر
اے حباب لب جو تو نے یہ عقدہ کھولا

نصیر اُس شوخ کی یہ کج ادائی کوئی جاتی ہے
مثل مشہور ہے رسی جلی لیکن نہ بل نکلا

چشم وہ کیا ہے کہ جس میں ایک آنسو بھی نہیں
آبرو تب ہے صدف کی جب کہ ہو گوہر سمیت

کس کی نگہ نے جلوۂ برق اب دکھا دیا
آنکھیں جو اپنی ہو گئیں بے اختیار بند

خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

جہاں سے گو بت مغرور اُٹھ گیا انصاف
خدا کے روبرو ہو گا مرا ترا انصاف

عاشق سوا ہے کس کو ہوائے شکست رنگ
دل کی شکستگی ہے بنائے شکست رنگ

بلبل ہزار حیف نہ ہو ہمکنار گل
اور مفت میں نسیم تو لوٹے بہار گل

برقع کو اُلٹ منہ سے جو کرتا ہی تو باتیں
اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

برباد رفتگانِ محبت کی خاک ہے
اے قیس دشت میں یہ بگولا نہیں اٹھا

حباب وار غنیمت ہے فرصت اک دم کی
ہوا پہ زندگی مستعار رکھتا ہوں

سیر مژگاں سے وقتِ نالہ آنسو کو ترستے ہیں
یہ سچ ہی جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

وجہ معلوم تو ہو چیں بجبیں ہونے کی
سچ کہو جی میں ہو کیا کس سے لڑا چاہتے ہو

واشد نہیں ہے غنچۂ تصویر کی طرح
کیا جانے کیا ہوا دلِ آفت رسیدہ کو

دل یہ کہتا ہے کہ مت یادِ بتاں دلواؤ
چھیڑنے کا مرے تب آپ مزا دیکھیں گے

دیکھ لیتی جو اٹھا کر ترے کیا ٹوٹتے ہاتھ
لیلیٰ اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

وحشت سے مجھے ہاتھ اٹھانے نہیں دیتے
پڑتے ہیں مرے پاؤں سلاسل کئی دن سے

قطعہ

یہ مجنوں ہے نہیں آہوے لیلیٰ
بھیں کر یہ تیں نکلا ہے گھر سے

جسے تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار
لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

میر نظام الدین ممنونؔ

جوانانِ سعادت مند و ذی شعور ست، در حینِ حیاتِ پدرِ بزرگوار بعد تحصیل کتبِ فارسی بمقتضائے موزونیِ طبع خود را مصروفِ گفتنِ شعر ہندی و فارسی میداشت تا آنکہ در عرصۂ قلیل قوتِ شاعری را چنانچہ باید پیدا کرد، کلام خود را ہم رتبۂ کلام پدر رسانیدہ اکثرے از موزونانِ شہر استفادۂ شعر ازو می کنند، (از تذکرۂ مصحفی)

گفتارش خیلے دلچسپ و دلنشین است ملاحت کلامش نہایت عذب و شیرین در بستن مضامین بیگانہ یگانہ است فکرِ صحیحش صائب از غلطش استادانہ قوتِ نظم اکثر اصنافِ سخن وا داد (از گلشن بیخار)

میر نظام الدین نام، ممنونؔ تخلص، میر قمر الدین منتؔ[1] کے بیٹے تھے، سونی پت وطن تھا، مگر مولانا شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے اُن کے والد دلی آ رہے تھے

---

[1] میر قمر الدین منتؔ سونی پت کے رہنے والے امام ناصر الدین مشہدی کی اولاد میں تھے، شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے دلی میں ان کا نشو و نما ہوا، علوم و فنون کی تمام درسی کتابیں شاہ صاحب موصوف سے پڑھیں اور مدت تک اُن کی صحبت میں رہے،

فارسی زبان کی تحقیق اور مشق سخن میر شمس الدین فقیرؔ سے کی اور اُردو کی شیخ قیام الدین قائمؔ سے، دونوں زبانوں میں شعر اچھا کہتے تھے جب تک دلی میں رہے سنی مذہب کے پابند رہے طریقۂ چشتیہ میں مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ سے بیعت تھی، لکھنؤ تشریف لائے تو مذہب شیعہ اختیار کیا، مدت تک لکھنؤ میں رہے اور نواب وزیر سے قصائد کے صلے خاطر خواہ حاصل کئے،

لکھنؤ سے کلکتہ تشریف لے گئے، عماد الدولہ لارڈ ہسٹنگز کی تعریف میں قصیدے لکھکر (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۳)

وہیں ممنون پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی،

درسی کتابیں والد ہی سے پڑھیں اور مشقِ سخن بھی انہی سے کی، چند روز کی فکر و کاوش میں دلی جیسے شہر میں اُن کی شاعری کا سکہ رائج ہو گیا، اکبر بادشاہ نے فخر الشعراء کا خطاب عنایت کیا، اور کثرت سے لوگ اُن کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے، لوگ کہتے ہیں کہ مفتی صدرالدین خان

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۲) پیش کئے اور ملک الشعرا کا خطاب پایا، سنہ ۱۲۰۰ھ میں گورنر جنرل نے آصفجاہ ثانی کی خدمت میں ایک خاص سفارت پر انکو حیدرآباد روانہ کیا، وہاں پہونچکر نواب مذکور کی مدح میں قصیدہ پیش کیا، جس کے صلہ میں ہزار روپیہ نقد اور دو سو روپیہ ماہوار کا منصب پایا،

حیدرآباد سے فائز المراد ہو کر پھر لکھنؤ تشریف لائے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر کلکتہ تشریف لے گئے، وہاں پہنچے ہی تھے کہ سنہ ۱۲۰۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، ضخیم دیوان اور متعدد مثنویاں یادگار چھوڑیں، نثر میں بھی ایک کتاب گلستان سعدی شیرازی علیہ الرحمہ کے جواب میں لکھی ہے، اسکا نام شکرستان ہے، ان کا شمار پرگو شاعروں میں تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

دریں عمر دہ مثنوی گفتہ ام   بآئین طرز نوی گفتہ ام۔
چو اشعار من در عدد می رسد   شمار قصائد بصد می رسد
بود شعر من در غزل سی ہزار   ز پانصد رباعی گرفتم شمار

اردو اشعار کا نمونہ

علاج دل کو آئے تھے مسیحا سخت دعوے سے   یہاں کیا ہو گیا وہ معجزہ حضرت سلامت کا

اس آنے کا کچھ ہے ٹھکانا پیارے   ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

قدم رکھ گیا کون سینے پہ اپنے   گلِ داغ میں آج مہندی کی بو ہے

آرزو نے بھی ان سے اصلاح لی ہے، بہرحال ان کی شاعری نے ترقی کی، اسی زمانہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے اور سرکار اودھ کی طرف سے خاطر خواہ قدردانی ہوئی، مگر بڑی قدردانی گورنمنٹ انگریزی نے کی جو ان کو اجمیر میں صدر الصدور کر دیا، ایک مدت تک اس جلیل القدر عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے، جب کبرسنی نے مجبور کیا تو دلی جا کر خانہ نشین ہو گئے اور ۱۲۶۰ھ میں ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑ کر دنیا سے چل بسے زبان ان کی صاف اور شیریں ہے، اس میں جا بجا محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے، پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے،

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہو گئے نہ واں خو یاد آنے کی، نہ یاں شیوہ تقاضا کا

اے آہ بے ادب نہ اسے پھونکیو کہ ہے دل جلوہ گاہ پردہ نشینانِ راز کا

دعائیں زیرِ لب آہستہ آہستہ اسے دوں ہوں جو یاد آتا ہے لب تک آ کے رک جاتا وہ گالی کا

ممنون قضا نے ہم کو دیا کیا بغیر دل سو وہ بھی نذرِ کاہش و تشویش ہو گیا

کل ترے بیمار نے غش سے ذرا کھولی تھی آنکھ تو نہ تھا سو دیکھ بالیں کو وہ بیدل رہ گیا

اے بادِ آہ جنبش اتنی بھی تھی نہ لازم
اک ایک پارۂ دل آخر اڑا کے چھوڑا

دل میں کیا کیا ہوسِ عرضِ تمنا تھی ولے
تیری چتون کا وہ ڈھب مانعِ تقریر رہا

اُس کی آنکھوں سے ستاروں کی نظر پڑتی تھی
صبح تک جس کا کھلا دیدۂ بیخواب رہا

کس بے ادب کو عرضِ ہوس ہر نگہ میں تھی
آنکھ اُس نے بزم میں نہ اٹھائی تمام شب

آمد سے تیری ہم پہ جو ہونی تھی سو ہوئی
اب وعدۂ حشر نہ پر ڈالے قیامت

کشتیٔ طاقت شکستہ اور بحرِ غم کا جوش
مژدہ نومیدی نہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ

یہ نہ جانا تھا کہ اُس محفل میں دل رہ جائیگا
ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھکر

مدت سے آب ہو کے بہا چشمِ تر کی راہ
ممنون کیا بیاں کروں میں ماجرائے دل

تپشِ دل نے نہ چھوڑا کہ کبھی ہم اک بار
لائیں تسکین کے لئے لب پہ ترا نام تمام

اس ذوق سے کہتے ہیں حدیثِ لبِ شیریں
گویا ترے ہونٹوں ہی سے لیتے ہیں مزا ہم

شبِ وعدہ چشم ہے براہ پہ جو ذرا بھی کھٹکے کسی کا در
تو صدائے پا تری جانکر کہوں ابتلک تھے کہاں کدھر

ممنون ہیں مبادا آئے کوئی ہجرِ ناگہاں
ناکامیوں سے وصل ہی میں آؤ خو کریں

اُس مرگ پہ سو جان مری صدقے کہ دمِ نزع
گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھئے کیا ہو

کون آئے ہے کہ سینہ میں بیدار ہو گئیں
صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

دل گرمیاں وہ ہم سے کہاں اب کہ آجکل
ہنگامۂ محبتِ اغیار گرم ہے

رات تھوڑی سی حسرتیں دل میں بہت
صلح کیجے بس لڑائی ہو چکی

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا مومن
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

نگاہِ ناز و نیاز التماس راز میں تھی
وہاں سے عذرِ ستم یہاں سے سو گلے نکلے

بھری آتی ہے چھاتی یاد میں یارانِ رفتہ کے
یہ دل اور اس قدر صدمے بھلا کس کس کا غم کیجے

شیخ محمد ابراہیم ذوق

از مدت سی ۳۰ سال بمشق سخن می پردازد و در سرکار مرشد زادہ آفاق مرزا ولیعہد بہادر علم امتیاز می افرازد، قوت مشقی کہ او راست دیگرے را دیدہ نشد و لہذا رطب و یابس کہ شیوہ بسیار گویان است در کلامش کمتر و بر جمیع اصناف سخن قدرت تمام دارد (از گلشن بیخار)

صاحب قوت فکر خداداد است بر جمیع اصناف سخن قدرتی کہ او راست در ریختہ سرایان سوا یافت، گفتارش در پاکیِ زبان و بلندیِ معانی و شوخیِ اشارت و کرسی نشینیِ ترکیب و بست قافیہ و نشست ردیف طرز یکتائی دارد، (از طور کلیم)

محمد ابراہیم، ذوق تخلص، دلی کے رہنے والے اور شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے، ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے، حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی، وہ شاعر بھی تھے، شوق تخلص تھا، انہی کی صحبت میں ان کو بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا، تو کچھ کہنے لگے، جب سن تمیز کو پہونچے تو شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے اور بحکم ضرورت فارسی اور عربی کی کچھ درسی کتابیں بھی موقع پا کر کسی سے پڑھ لیں،

طبیعت مناسب تھی، چند روز میں مشق سخن بڑھ گئی، مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے، رفتہ رفتہ مرزا ابوظفر کے دربار میں رسائی ہوگئی، جو اُس زمانہ میں ولیعہد تھے، چند دنوں سے وہ اپنا کلام اصلاح کے لئے اُن کو دینے لگے،

اُسی زمانہ میں اُنھوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک پرزور قصیدہ لکھا، جس کے صلہ میں ان کو "خاقانیِ ہند" کا خطاب عنایت ہوا، ان کا سن اُس وقت انیس سال کا تھا، جب مرزا ابوظفر بادشاہ ہوئے، تو سو روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ کر دی، اور اخیر میں ایک گاؤں بھی

جاگیر میں دیا، مگر اُس سے زیادہ متمتع نہیں ہو سکے، ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ میں غدر سے دو برس پہلے وفات پائی،

غدر میں ان کا سارا کلام تلف ہو گیا، حافظ غلام رسول ویرآن نے جو ان کے شاگرد رشید تھے کچھ اپنی یاد سے اور کچھ احباب کی مدد سے ایک مختصر دیوان مرتب کر کے شائع کیا، جس میں اکثر غزلیں تمام، اکثر ناتمام، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں،

بہت دنوں کے بعد مولوی محمد حسین آزاد نے کوشش کی اور ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا، جس سے کچھ ناتمام غزلیں پوری ہو گئیں، کچھ قصیدوں اور غزلوں کا اضافہ ہو گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے فنافی الشعر آدمی کی یہ ساری کمائی نہیں ہو سکتی، اگر کلام ضائع نہ جاتا تو تین چار ضخیم جلدیں بھی اُس کی متحمل نہ ہو سکتیں، کلام کے باب میں جو رائے آزاد نے دی ہے، اس پر کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا، اُنھوں نے ٹھیک کہا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگیِ مضمون، صفائیِ کلام، چستیِ ترکیب، خوبیِ محاورہ اور عام فہمی ہے، مگر رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا، ابتدا میں مرزا رفیع سوداؔ کا انداز تھا، جب نواب الٰہی بخش[1] خاں معروفؔ کی صحبت

---

[1] نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ تخلص، نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالبؔ کے خسر، نہایت باذوق، زندہ دل اور درویش مزاج امیر تھے، بزرگانِ دین کی صحبت میں ترک و تجرید کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، مگر شعر و سخن کا شوق عنفوانِ شباب سے مرتے دم تک قائم رہا، مشقِ سخن شاہ نصیرؔ سے کی تھی، آزاد نے آبِ حیات میں جس طرح سے ظفرؔ مرحوم کی کاوشِ فکر پر پانی پھیرا ہے، ان کی بھی تمام فکر کو اپنے استاد ذوقؔ کے دامنِ کمال سے وابستہ کر دیا ہے، باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اُس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی، اور ذوقؔ بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہونگے، مگر جوشِ عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا، مصحفی نے تذکرہ شعرا سنہ ۱۲۰۵ھ میں تالیف کیا ہے، اسمیں ذوقؔ کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے (بقیہ صفحہ ۲۸۹ پر)

میں پہونچے جو خواجہ میر درد کے انداز کو پسند کرتے تھے، اُن کی غزلیں خواجہ صاحب کے انداز میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸) کیونکہ ذوق کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ سال بھر کی رہی ہوگی، مگر نواب الہی بخش خاں معروف کا تذکرہ ہے، لکھتے ہیں کہ "بشاگردی میاں نصیر نازش دارد، و فکر شعر نیز بر دیگراں تلاش ہمت میکند در یک دو مشاعرہ صاحب عالم شریک غزل طرحی نیز بود، بعد دو ماہ بشہر عود کرد" یہ اُس زمانہ کا قصہ ہے کہ نواب الہی بخش خاں معروف سیر و تفریح کے لیے لکھنؤ آئے اور دو مہینہ رہ کر دلی واپس گئے ہیں، اب اس کے بعد آزاد کے ان فقروں کو پڑھو "موجودہ دیوان معروف اب جو ہے وہ تمام و کمال انہی کا (یعنی ذوق کا) اصلاح کیا ہوا ہے، نواب مرحوم اگرچہ ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں نہیں بٹھا سکتے تھے، مگر اس کے حقائق و دقائق کو ایسا پہنچے تھے کہ جو ق

نواب کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہیں، اور کوئی شعر سبزی کے مضمون سے خالی نہیں، اس کا نام تسبیح زمرد ہے، آزاد کہتے ہیں کہ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پرو دی تھی،

نواب نے سنہ ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی، اشعار ملاحظہ ہوں،

معروف اب تو دیکھتے ہو تم ہمیں غریب   ٹک منہ لگائے یار تو پھر ہم کو دیکھیے

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے   مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لیجائے

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل   کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جائے ہے

گریہ و آہ و فغاں سے ایک دم فرصت نہیں   ہم سمجھتے تھے محبت کام بیکاروں کا ہے

درد سر میں ہے کسے صندل لگانے کا دماغ   اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے

بنانے لگے، مرزا ابو ظفر نوجوان تھے، وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے، اُن کی غزلیں جرأت کے انداز میں بناتے تھے، نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ خود اُن کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی، دو تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے،

(دیکھو آبحیات)

مے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم　　کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا
کہیں تجکو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا　　پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا
گھسے سب ناخن تدبیر اور ٹوٹے سر سوزن　　مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

سب کو دیکھا اُس سے اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ　　وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

مجھ میں اُس میں ربط ہے گویا برنگ بوئے گل　　وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

موت اُسکو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور　　یوں ترا بیمار غم جو ہچکیاں لینے لگا

عشق نے ڈالی تھی جب قصر محبت کی بنا　　لکھ دیا تھا کوہکن بھی نام اک مزدور کا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا　　کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

سکے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا　　کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا
ذوق بیمار محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جانبر نہ ہوا

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

اس سے تو اور آج وہ بے درد ہو گیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا
سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منھ زرد ہو گیا

لگائی زلف کو شانہ نے جب انگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی اے بے ادب آیا
ترے ڈر سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا

سن کے مجنوں نے مرے شور جنوں کو یوں کہا
واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈھ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

ریشِ سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

ٹھہری ہے اُس کے آنے کی یاں کل یہ جا صلاح
اے جانِ بر لب آمدہ اب تیری کیا صلاح

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے دل
باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں

نازک کلائیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

نچھوڑا تار وحشت نے ہماری جیب داماں میں
مگر تارِ نفس سینہ میں سمجھو یا گریباں میں

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

جو مانگوں موت دردِ ہجر سے مجکو نہیں ملتا
کہ نامِ عشق لوں اور اس قدر راحت طلب ہوں میں

سینہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

مر گئے پھر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے میں

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھدیا اُسے کیا اضطراب میں

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پُرنم سے کم نہیں
دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہو جس کے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اُس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

ہم متبرک ہیں بس اب کرنے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ لب پہ آئی ہنسی، دیکھو مسکراتے ہو

دیکھا دمِ نزع دلِ آرام کو
عید ہوئی ذوق دے شام کو

نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیرِ جاناں کو
نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے، نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو

لبیک و اذاں، ناقوس و جرس یا خندۂ قلقل، نالۂ نے
دل کھینچنے میں ہاں کوئی ہو، پر ایک نوائے دلکش ہو

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

ترے کوچہ کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے
نگہ کیا اور مژدہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیرِ قضا، اوس کو پرِ تیرِ قضا سمجھے
ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اوس بت سے خدا سمجھے
ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے
فلک کو ہم کسی کافر کی چشمِ سرمہ سا سمجھے
نہ دی رخصت نظر کو میری جانب کیوں تغافل سے
اسے بھی آپ کیا میرا ہی بختِ نارسا سمجھے
حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے خوں نکلا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
نہیں جز شمع مجاور مری بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے
کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے

ہے تیرے کان لفِ معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی
بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خمِ مے کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مہر ہے منہ پر لگی ہوئی
کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی
اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مرے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیوں کہ بے وضو کرتے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
سراغ عمرِ گذشتہ کا کیجئے گر ذوق
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

جو پاس مہر و محبّت یہاں کہیں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے
وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

قسمتِ برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادھر
سو بھی آ کر تا سرِ مژگاں حیا سے پھر گئی

زخمی میں ہوا ہوں تری دزدیدہ نظر سے
جانے کا نہیں چور مرے زخم جگر سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پہ کسی کے آن لگی

فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہمسر چشمِ فتّاں سے
گرا تھا یہ بھی اشکِ سرمہ آلود اسکی مژگاں سے

دل صاف ہو تو چاہئے معنی پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہی صورت پرست ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

ساقیا عید ہے لا ساغر و مینا بھر کے
بادہ آشام پیاسے ہیں مہینہ بھر کے

نہیں مژگاں پہ خونِ خارِ غم بھی دل نشیں نکلے
جنوں یہ نیشتر کیسے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل
سو بار آبلے اُسے آنکھیں دکھا چکے

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے
کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

مری طاعت سے اب تو معصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ توبہ استغفار کرتی ہے

اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے
لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی
آپ کی گر یوں خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

بہادر شاہ ظفرؔ

بہ اکثر صفات موصوف و بجامع مکارم معروف، در اکثر خطوط دستگاہے شایستہ دارد و باین خوبیہا مالوف ہست، شیخ ابراہیم ذوقؔ از مائدۂ نعمتش زلہ ربا و وظیفہ خوار است۔ (از گلشنِ بیخار)

در خطاطی دست بلند داشت و در سخن پایہ ارجمند، گفتارش اگرچہ سادہ پرکار ہست، با ہمہ خاطر شکار ہست، محاورہ گوئی از زبان او ست، معاملہ نویسی زیر فرمان او۔ (از بزمِ سخن)

ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ، اکبر ثانی کے بیٹے تھے، اور شاہ عالم بادشاہ کے پوتے تھے، ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جا چکی تھی، ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے

برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے، اور ان کی حکومت دہلی میں قلعۂ معلّیٰ کی چاردیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی،

لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی، اور اردوئے معلّیٰ اُن کے زیرنگیں تھا، افسوس ہے کہ اس کو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر اُستاد ذوق کو بخشدیا

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

آبحیات میں استاد ذوق کے حالات پڑھو، ظفر کے ہاتھ کیا رہتا ہے، کوئی شعر پورا کوئی ڈیڑھ مصرع کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف وقافیہ باقی بخیر، استاد ذوق ان ہڈیوں پر گوشت و پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے، پہلا دیوان نصف سے زیادہ باقی تین دیوان سراپا حضرت مرحوم (استاد ذوق) کے ہیں،

لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے، وہ ایک دیوان کی شکل میں شائع ہو چکا ہے ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو، پھر اپنی فطرتِ سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوق پھر بھی ذوق ہیں، ظفر کے استاد، انکے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں، ظفر کے ہاں جو سامان نظر آئیگا، وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا، اور ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی، مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بنکر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگردوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انھیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا،

سنہ ۱۲۷۱ھ میں جب شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا تو مرزا نوشہ غالب کے متعلق،

خدمت ہو گئی تھی، مولانا حالی نے یادگار غالب میں جہاں اس کا ذکر کیا ہے، وہاں انھوں نے بھی بجائے ذوق کے غالب کے متعلق ناظر حسین مرزا کی زبانی آزاد کے اسی مضمون کو دہرا دیا ہے؛ مگر مقدمہ دیوان حالی میں ایک موقع پر ذوق و ظفر کے کلام میں قریب قریب اسی طرح کا فرق بیان کیا ہے، جو میں نے لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "ذوق کی غزلوں میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے، مگر وہ جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اُس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے"۔

اس بحث کے بعد میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ ظفر کی کمزوری صحیح اور ان کے اساتذہ کی کاوش فکر مسلّم، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر کر استاد ذوق کو ان کے دیوانوں کا مالک بنا دیا جائے،

اس بدنصیب بادشاہ کی ساری زندگی روتی جھینکتی گذری، دلوں کے ارمان دل ہی میں رہے، سلطنت کا خواب جو دیکھا تھا اس کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد قلعہ معلیٰ سے بھی نکال کر رنگون پھینک دیئے گئے،

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

جوان جوان بیٹے اور پوتے اُن کی آنکھوں کے سامنے کھڑے کر کر کے گولی مار دیئے گئے طوق و سلاسل اور خدا جانے کیا کیا جو کچھ بھی اس منحوس شاعری کی بدولت انکو ہوس ہوتی ہو گی وہ سب نکل گئی، اور جتنے دنوں کی زندگی تھی رنگون کے بلاخانہ میں بے کسی و بے بسی کے ساتھ پوری کر کے سنہ ۱۲۷۹ھ میں پیوند خاک ہو گئے، اب کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ انکو گور و کفن ملا تھا یا نہیں، تسلیم،

نہ شامیانہ، نہ شمعِ تربت، نہ موجِ سبزہ، نہ چادرِ گل   بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہی بیکسی کی

ظفر مرحوم کا کلام ملاحظہ ہو،

ہم اپنے کنجِ غم میں نالہ و فریاد کرتے ہیں   ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

سر تلک دستِ ستم جوں ہی ترا قاتل بڑھا   خونِ جسمِ ناتواں تل تل گھٹا تل تل بڑھا

تم لاکھ کرو حضرتِ دل نالہ و فریاد   چاہو کہ ہو کچھ اُس کو اثر، ہو نہیں سکتا

کیا کان بھر دیئے ہیں خدا جانے غیر نے   غصہ میں جو بھرے ہے وہ کافر بھرا بھرا

ظالم ترے چپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا   کیا جانے کہ ہے دل میں ترے کیا نہیں کھلتا

دنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا   ہم نے یہی پایا کہ برا نام نہ پایا

ضبط فریاد کروں، گریہ کو روکوں لیکن   دلِ بے تاب کو تھاموں یہ نہیں ہو سکتا

وہ کھا گئے سوگند مرے آگے قسم جھوٹ   اور پھر ہے یہ دعوی کہ نہیں بولتے ہم جھوٹ

ہوں جو ٹیڑھے ترچھے دکھلا انکو اپنا بانکپن   ہم ہیں سیدھے سادھے ہم سے بات کر سیدھی طرح

صد آرزوے وصال و حیات نیم نفس
نفس شماری و اندوہ بے شمار دریغ

یوں تو مدت سے ہی الطاف و عنایات میں فرق
لیکن ایسا نہ ہو آجائے ملاقات میں فرق

رہا تھا کیا وہ مجھ سے چھین کر لیتے تو کیا لیتے
دل و دیں دے چکے تھے اب اگر لیتے تو کیا لیتے

برسوں گذرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
ابتو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں

دل دے کے انکو ایسی اذیت ہوئی ہمیں
اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں

ہو گیا اور زیادہ وہ کشیدہ ہم سے
دوستو کیا کششِ دل کا اثر پوچھتے ہو

نہیں معلوم ظفر اُس سے ہوئیں کیا باتیں
چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبہ کا
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اُسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں پوچھتا پھرتا
دلِ گم گشتہ کی اپنے خبر لیتے تو ہم لیتے

خدا بچائے ظفر دوستی سے اِس دل کی
جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

نہ پہنچا کوئی اپنے پاس پہنچا جب کہ وقت اپنا
اجل کو آفریں ہو، وقت پر پہنچی تو یہ پہنچی

وقت پر جو کام آئے دوست اُسکو جانئے
ورنہ رہتا ہے ظفر یاں کام کس کا بند ہے

جنون میں کیا مرے پیوند پیرہن میں لگے
کہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن میں لگے

اُسی کو دوست سمجھتے ہیں وہ جو کچھ نہ کہے
کرے جو اُن سے سوال و جواب دشمن ہے

یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے اپنا حال
منھ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

میں جو کہتا ہوں بے وفا ہے رقیب
وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو کیا ہے

حکیم محمد مومن خاں مومنؔ

بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ، در ہر جنس آنچناں مکانتی دانی دارد کہ کسے را در یک صنعت ہم میسر نیامدہ، اگر حظے از فہم خداداد داری، بیا و بدیوانش نظر کن و بتصدیق و تکذیب من زبان انصاف بکشا، (از گلشن بیخار)

محمد مومن خاں نام، مومن تخلص، حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے، ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبد القادر علیہ الرحمہ سے عربی کی کتابیں پڑھیں، جب استعداد درست ہوگئی تو والد اور چچا حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انہی کی زیرنگرانی

نسخہ نویسی کی،

اُسی زمانہ میں نجوم کا شوق پیدا ہوا، اسکو بھی اہلِ کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی، شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی، عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا، ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا، پھر ذہنِ خداداد کے اطمینان پر اصلاح لینی چھوڑ دی، اور بطور خود مشق سخن کی،

رنگین طبع رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس اور عاشق مزاج آدمی تھے، غزل دردناک آواز اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، باایں ہمہ دینداری کے خیال سے بھی خالی نہ تھے، جوانی میں حضرت سید احمد شہید سعیدؒ کے مرید ہوئے، اور آخر عمر تک عقائد میں انہی کے پیرو و تبع رہے، کلیات میں ایک مثنوی جہادیہ ہے، جو اس وقت لکھی تھی جب سید صاحبؒ سکھوں سے جہاد کر رہے تھے، علاوہ اس کے دو قطعۂ تاریخ اون کی امامت کے ہیں جن میں سے ایک کے دو چار شعر یہ ہیں،

گلاب ناز سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ
کہ فکر مدحت سبط قسیم کوثر ہے
وہ کون امام جہان و جہانیان احمدؒ
کہ محض مقتدیِ سنت پیمبرؐ ہے
زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعوی نور
کہ اس کا رایت اقبال سایہ گستر ہے
زبسکہ کام نہیں ہے اُسے سوائے جہاد
جو کوئی اُس سے مقابل ہو سو وہ کافر ہے
وہ بادشاہِ ملائک سپاہ کوکب دین
کہ نورِ شمس و قمر جس کی گرد لشکر ہے
وہ برق خرمنِ ارباب شرک اہلِ ضلال
کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جس کا سال خروج
امام برحق مہدی نشان عسکر ہے
۱۲۴۲ھ

تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ و تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے، مگر ان کے ذہن و ذکاوت طبع کی

تعریف نہیں ہو سکتی کہ ان کی طبع رسا نے اس کو محسنات میں داخل کر دیا ہے، مولانا شاہ عبد العزیز کی وفات کی تاریخ کہتے ہیں،

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
۱۲۳۹ھ

اپنے والد کے تاریخ وفات میں کہتے ہیں،

بمن الہام گشت سال وفات
کہ غلام نبی بحق پیوست
۱۲۴۱ھ

صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات،

خاک بر فرقِ دولتِ دنیا
من فشاندم خزانہ بر سر خاک
۱۲۶۳ھ

بیٹی کی تاریخ ولادت،

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ دختر مومن
۱۲۵۹ھ

کلیات میں قصائد بھی ہیں جو اپنے درجہ میں عالی رتبہ رکھتے ہیں، لیکن اُنھوں نے صلہ کی اُمید پر ارباب دنیا کی مدح میں کبھی قصیدہ نہیں کہا، راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے، اس کا ایک خاص سبب ہے، ایک دن راجہ اپنے مصاحبوں کو لیے ہوئے دلی میں سر راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے، خاں صاحب کا اُدھر سے گذر ہوا، لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر بھی ہیں، راجہ نے آدمی بھیجکر بلوایا، عزت و تعظیم سے بٹھایا اور حکم دیا ہتھنی کس لاؤ، ہتھنی آئی تو خانصاحب کو عنایت کی، یہ قصیدہ اُسی کا شکریہ ہے،

نواب وزیر الدولہ بہادر فرماں روائے ٹونک کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ ہے، جس کا مطلع ہے،

یاد ایام عشرت فانی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

مگر یہ قصیدہ بھی صلہ کی امید پر نہیں لکھا، بات یہ تھی کہ نواب ممدوح کو حضرت سید احمد شہید

قدس سرہٗ سے بیعت تھی، بیعت ہی نہیں بھی عشق تھا، اس لحاظ سے مومن خاں اُن کے روحانی بھائی تھے، وہ چاہتے تھے کہ مومن ٹونک آئیں، اور نواب کے ساتھ رہیں، مگر خانصاحب سے دلی کی گلیاں کب چھٹ سکتی تھیں، علاوہ اس کے ایسے رنگین مزاج کا نواب جیسے مقدس اور متشرع کے ساتھ گذر کیسے ہو سکتا تھا، ع

میں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

کچھ سمجھ بوجھکر معذرت کا قصیدہ لکھکر بھیجدیا،

ان دونوں قصیدوں کے سوا ایک قصیدہ حمد و مناجات میں ہے، ایک نعت میں، ایک ایک خلفائے راشدینؓ اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی منقبت میں،

کلیات میں آٹھ مثنویاں ہیں جن میں سے ایک دو ناتمام ہیں، اور ان کا انداز وہی ہے جو غزلوں کا ہے، مگر افسوس ہے کہ اخلاقی حیثیت سے یہ بہت گری ہوئی ہیں،

دیوان میں مخمس، مسدس، ترجیع بند، مرثیہ وغیرہ سبھی کچھ ہے، اور خانصاحب کا انداز ہر جگہ قائم ہے، اس کلیات کو پہلے ان کے شاگرد رشید نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے جمع کیا تھا، پھر میر عبد الرحمٰن خلف میر حسن تسکین (خانصاحب کے فرزند نسبتی) نے از سر نو مرتب کیا، جو کئی بار چھپ چکا ہے،

علاوہ اس کے ان کا دیوان فارسی بھی چھپ گیا ہے، وہ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے، اور جو دل فریبیاں مومن خاں کے اردو کلام کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ اس میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں[1]،

---

[1] ایک انشائے فارسی ہے، دیوان فارسی اور انشا حکیم احسن اللہ مرحوم نے مرتب کی اور مطبع سلطانی میں ۱۸۵۷ء سے قبل چھپی،

آزاد نے آبحیات میں مومن کے کلام کی نسبت جو رائے ظاہر کی ہے، اُس کو سن لو پھر جو بات رہ جائے گی اُس کو میں بیان کرونگا،

"اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں، استعارہ اور تشبیہ کے زور سے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہونچایا ہے، ان میں معاملاتِ عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں، اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے، اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے، وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفتِ خاص کے لحاظ سے ذاتِ شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف و لطیف بلکہ معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں، اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیں فارسی کی اور استعارے و اضافتیں اردو میں استعمال کر کے کلام کو نمکین کرتے ہیں"

بات یہ ہے کہ جو جذبات و خیالات غزل میں بیان کئے جا سکتے ہیں، وہ سب قدما کے حصے میں آگئے، اور جتنے لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان کے ہو سکتے ہیں، وہ سب ختم ہو گئے، ممکن تھا کہ متاخرین اُس دائرہ سے نکل کر ہر قسم کے خیالات پر اپنی شاعری کی بنیاد قائم کر دیتے تو ان کو زیادہ وسیع اور فراخ میدان مل جاتا، مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا، اسی محدود دائرے میں اپنے اپنے مبلغِ فکر کے موافق لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں،

مومن خاں کے ہمعصروں میں مرزا غالب نے اس میں نمایاں حصہ لیا ہے، مگر جیسا کہ خود مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے کہ مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے، حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانیِ طبیعت کا تماشا گاہ ہے، قصیدوں میں، غزلوں میں، مثنویوں میں، ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں مگر افسوس ہے کہ ان کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوشِ فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا

ان کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے، جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے، کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں، مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے، کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اُس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے، جس میں کبھی کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے، اور اس کے سمجھنے میں کاوش فکر کی ضرورت پڑتی ہے،

افسوس ہے کہ اس جامع کمالات ہستی نے بہار زندگی کے صرف باون ۵۲ سال مرے بیکر سنہ ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی اور مہندیوں میں دلی دروازہ کے باہر حضرت شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ کے مقبرہ کے پاس سپرد خاک کئے گئے،

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیرے خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

نہ جاؤنگا کبھی جنت میں میں نہ جاؤنگا
اگر نہ ہووے گا نقشا تمہارے گھر کا سا

کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے میں کچھ نہیں کہتا

اللہ ری ناتوانی جب شدت قلق میں
بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل   میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل   تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا
درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری   چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے   جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

نہ مانوں گو نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا   کہ ہر ہر بات پہ ناصح تمھارا نام لیتا تھا

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں   کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کشی یوں   نہیں کوئی دنیا میں گویا کسی کا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا   میں الزام اسکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے   یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا   جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا
بد کام کا مآل برا ہے جزا کے دن
حالِ سپہرِ تفرقہ انداز دیکھنا

دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے
تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا

ہجرِ بتاں میں تجکو ہے مومن تلاشِ زہر
غم پر حرام خور توکل نہ ہو سکا

مٹی نہ دی مزار تلک آکے اس پہ بھی
کہتے ہیں لوگ خاک میں اُس نے ملا دیا

چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا
جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہوا

اس ضعف میں تو آتا ہے سینہ سے لب تلک
کہتے ہیں اپنے نالہ کو ہم نارسا عبث

مرجائیں کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بری طرح

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
اُس کوچہ میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق
آج اور زور کرتے ہیں ناطاقتی سے ہم

خنجر کو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

گر ہے دلِ غیر نقشِ تحریر — تو تیرے لئے جلائیں گے ہم

اے تپِ ہجر دیکھ مومن ہیں — ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

نہ میں اپنا، نہ دل اپنا، نہ تم میرے نہ جاں میری — اثر کس کس کو ہو ہووے بھی گر فریادِ بیکس میں

ذرا سمجھو تو جانِ من وصالِ غیر پر ہر دم — مری جاں کون ہے یہ کس کی جھوٹی کھاتے ہو قسمیں

یار تھے یا دشمنِ جاں تھے الٰہی چارہ گر — لے چلے مرتے ہی زنداں سے سوے صحرا ہمیں

شیریں ہے طعنِ تلخیِ فسمہ ہاو کس لئے — مجکو بھی کچھ مزا نہ ملا تیری چاہ میں
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ

بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں — ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں
ناصح کہاں تلک تری باتیں اُٹھا سکوں — یہ سچ ہے کہ مجھ میں طاقتِ جور و ستم نہیں

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات — ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں
خیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ — آرزوہاے دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں

* * *

نہ چاہوں روز جزا داد یہ ستم دیکھو   کب آزماتے ہیں جب وقت امتحاں نہیں

ہیں غیر مرے نکلنے سے خوش   گویا کہ میں اُن کا مدعا ہوں

کیا کیجیے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں   جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
جز نہ سپہر ہیں مرے دشمن تو اور بھی   لیکن بڑے ستم یہی دو تین چار ہیں
کیسے گلے رقیب کے، کیا طعنِ اقربا   اپنا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا و لے   مجھ سے بیاں نہ کیجے عدو کے پیام کو

کچھ شورِ محبت کی تو لذت ہی نہ پوچھو   ہے آپ کے بھی حسن سے کتنا نمکیں یہ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی   آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

توبہ گنہ عشق سے فرماتے ہے واعظ   یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں   اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس   ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن   آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اوس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے
چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

عیش میں بھی، تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے
بختِ بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

عذابِ ایزدی جانکاہ ہی مانا بس اب مومن
خدا کے واسطے ذکرِ ستمہائے بتاں کیجے

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال تو ہے
نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے
جفائے یار پہ سونپا معاملہ دل کا
اب آگئے ہو نہ ہو، امیدِ انفصال تو ہے

کیونکر نہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

تسلی دمِ واپسیں ہو چکی
ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے
زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
کسی نے گر کہا مرتا ہے مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

مرزا اسد اللہ خاں غالب

"در اوائل حال بتقاضائے طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن می گفت و وقت آفرینیہا میکرد، آخرالامر ازاں طریقہ انداز نے مطبوع ابداع نمودہ بعد ترتیب و تکمیل دیگر نگردید، فراواں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ قدر قلیلے انتخاب زدہ"

(اھ گلشن بیخار)

اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ لقب، "نجم الدولہ دبیر [illegible] نظام جنگ" خطاب تھا، پہلے اسد تخلص کرتے تھے، پھر بمناسبت اسد اللہ غالب کے غالب اختیار کیا، والد کا نام عبداللہ بیگ تھا، جب پانچ برس کی عمر ہوئی اس وقت باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مرزا نصر اللہ بیگ حقیقی چچا لارڈ لیک کے لشکر میں چار سو سواروں کے رسالدار تھے، ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے نواح آگرہ میں سرکار سے مقرر تھے، انھوں نے بھتیجے کی پرورش کی، چچا کے مرنے کے بعد ان کے وارثوں کی پنشن سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست میں مقرر کرادیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی غدر تک ملتا رہا، پچاس روپیہ ماہوار خلعت و خطاب کے ساتھ تاریخ خاندان تیموریہ کے لکھنے کے معاوضہ میں ابوظفر بہادر شاہ نے مقرر کر دیئے تھے،

غدر کے بعد یہ تنخواہ بند ہوگئی، اور بہادر شاہ سے تعلقات رکھنے کی پاداش میں پنشن بھی جاتی رہی دو برس انھوں نے جس مصیبت سے کاٹے وہ انھی کا کام تھا اس کے بعد رامپور

بعد یہ رام پور چلے گئے۔ اور نواب یوسف علی خان[لہ] ناظم رامپور نے ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی اور اگر رامپور مین رہین تو سو روپیہ مہینہ دعوت کا۔ مگر دلی چھوڑ کر رام پور کیونکر رہ سکتے۔ واپس آئے اور تین سال کی جد و جہد مین پنشن بھی جاری ہو گئی۔ علاوہ اس کے قصیدون کے صلے فتوح غیبی کے طور پر کبھی کبھی مل جاتے تھے۔ اس مین جس طرح سے بن پڑا زندگی بسر

[لہ] نواب یوسف علی خان خلف نواب محمد سعید خان والیِ رامپور علم دوست اور ہنر پرور رئیس تھے مولانا فضل حق خیرآبادی، مرزا نوشہ غالب، میر حسین تسکین، مظفر علی خان اسیر، منشی امیر احمد اور بہت سے علماء و شعراء انکے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ ابتدا مین حکیم محمد مومن خان مرحوم سے مشق سخن کی۔ ان کے بعد مرزا نوشہ غالب کے شاگرد ہوئے، پھر منشی مظفر علی اسیر کو کلام دکھلانے لگے۔

غدر ۵۷ء مین گورنمنٹ انگریزی کی مدد دینے کے صلہ مین کچھ علاقہ بھی ان کو ملا۔ اور علاوہ دیگر خطابات کے فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ کا خطاب عنایت ہوا۔ سنہ ۱۲۸۱ھ مین وفات پائی۔ صاحب دیوان ہین، صرف ایک غزل ان کی یہان نقل کرتا ہون۔

مین نے کہا کہ دعوی الفت مگر غلط   کہنے لگے کہ ہان غلط اور کس قدر غلط
تاثیر آہ و زاریِ شبہائے تار جھوٹ   آوازۂ قبول دعائے سحر غلط
سوز جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا   شور فغان سے جنبشِ دیوار و در غلط
ہان سینہ سے نمایشِ داغِ درون دروغ   ہان آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط
آجائے کوئی دم مین تو کیا کچھ نہ کیجئے   عشقِ مجاز چشمِ حقیقت نگر غلط
بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہین   اظہار پاکبازی و ذوقِ نظر غلط
تو صاحب آفتاب کہان اور ہم کہان   احمق نہین ہم اس کو نہ سمجھین اگر غلط
مٹھی مین کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی   جان عزیز پیشکش نامہ بر غلط

کردی، نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی سے تیرہ برس کے سن مین شادی ہوگئی تھی، اس تقریب سے دلی آرہے تھے، مگر زندگی بھر گھر نہین بنایا، دوستون کے گھر مین مستعار رہے، یا کرایہ کے مکان مین عمر کاٹ دی، بیٹے بیٹیان بہت سی ہوئین مگر بچپنے مین مر مر گئین، آخر مین بیوی کے بھانجے نواب زین العابدین خان عارف کے دو یتیم بچون کو لیکر پرورش کیا، اور ان ہی کو بیٹا بیٹی سمجھتے رہے،

مرزا شگفتہ مزاج تھے، ذہن وذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی لاجواب رکھتے تھے، شوخی اور ظرافت اُن کے دم قدم کیساتھ تھی، تحریر ہو یا تقریر کوئی بات اُن کی لطافت وظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی، میرزایانہ تمکنت مزاج کے ساتھ مروت ودوستی کا نباہ اور وضعداری کا پاس ولحاظ حد سے زیادہ تھا،

شعروسخن سے ازلی مناسبت تھی، حسنِ اتفاق سی ہرمزد نام ایک پارسی نے جو ژند وپاژند کا عالم تھا اسلام قبول کیا، اور اُسکا اسلامی نام ملا عبدالصمد رکھا گیا، وہ ایام سیاحت مین ہندوستان آنکلا اُس وقت مرزا کی عمر چودہ برس کی تھی، مگر وہی مناسبت ازلی طبیعت مین تھی، اُس کو دو برس تک گھر مین مہمان رکھکر اکتسابِ کمال کیا اور فارسی مین روانی طبیعت کے وہ جوہر دکھائے کہ باید وشاید،

عربی مین صرف ونحو کے سوا اُستاد سے اور کچھ نہین پڑھا تھا، مگر چونکہ علم سے فطری مناسبت تھی، اُن کی اردو فارسی کی نظم ونثر دیکھ کر کوئی یہ نہین کہہ سکتا کہ یہ شخص عربیت سے ناواقف ہے، عربی الفاظ کو ہر جگہ اسی سلیقہ سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل سے اس کی توقع ہو سکتی ہے،

ملا عبدالصمد کی صحبت مین فارسیت کا رنگ اُن کی قوتِ متخیلہ پر خوب چڑھ گیا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۳)

وہ پوچھتے پھرین کہ جنازہ کدھر گیا — مرنے کی اپنی روز اُڑائی خبر غلط
یہ کچھ سُنا جواب مین ناظم ستم کیا — کیون یہ کہا کہ دعوی الفت مگر غلط

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا مین مرزا عبد القادر بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، اسی وجہ سے جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان مین اختراع کی تھی، مرزا نے اردو مین اسی پر چلنا شروع کر دیا،

مولانا حالیؔ نے یادگار غالب مین کچھ اشعار اس زمانہ کے نقل کئے ہین[1]، مگر اب بھی اُن کے دیوان مین ایک ثلث کے قریب ایسے اشعار موجود ہین جن پر اردو زبان کا اطلاق بہ مشکل ہو سکتا ہے، مثلاً:۔

شمارِ سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا　　　تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل　　　کہ اندازِ بخون غلطیدنِ بسمل پسند آیا

شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا　　　تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکان کھلا　　　جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ　　　اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

---

[1] جو اشعار مرزا نے دیوان سے نکال ڈالے ہین، اُن مین سے سات شعر مولانا حالیؔ نے یادگار غالب مین نقل کئے ہین بطور نمونہ کے دو چار شعر نقل کرتا ہون ؎

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جان بخشیِ خوبان　　　خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے ترجبین پایا
پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبہ بالش　　　خیالِ شوخیِ خوبان کو راحت آفرین پایا

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ　　　اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا　　　گویا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

کرے گر فکر تعمیر خرابیہائے دل گردون　　　نہ نکلے خشت مثل استخوان بیرون ز قالبہا

سنا گیا ہے کہ مرزا کے اس ناپسندیدہ انداز سے مفتی صدر الدین خان بہت آزردہ رہتے اور ہر موقع پر ان کی اس بے راہ روی کی مذمت فرماتے تھے، دلی کے بعض ظرفا مشاعرون مین غزلین لکھ کر لیجاتے، جو الفاظ اور ترکیبون کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھین، مگر معنی ندارد گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے[1]

---

[1] آزاد نے آبحیات مین حکیم آغا جان عیش اور ہدہد الشعرا کے تذکرہ کے ضمن مین بیان کیا ہی کہ حکیم صاحب کے اشارے پر یہ ہدہد بلبلان سخن کو ٹھونگین بھی مارتا تھا، چنانچہ بعض غزلین سر مشاعرہ پڑھتا تھا جس کے الفاظ نہایت شستہ اور رنگین لیکن شعر بالکل بے معنی اور کہدیتا تھا کہ یہ غالب کے انداز مین غزل لکھی ہی ایک مطلع یاد ہے

مرکز محور گردون بہ لب آب نہین
ناخن قوس قزح شبہہ مضراب نہین

ایک مرتبہ مشاعرہ مین مرزا بھی تھے اور حکیم آغا خان عیش بھی، انھون نے طرحی غزل مین یہ قطعہ پڑھا۔

گر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھین یا خدا سمجھے

ایک دفعہ مولوی عبد القادر رامپوری نے جو نہایت ظریف اور خوش مذاق فاضل تھے، مرزا سے کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ مین نہین آتا اور اسی وقت دو مصرعے موزون کر کے مرزا کے سامنے پڑھے۔ ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے مین ڈال

مرزا سُنکر حیران ہوے کہا کہ یہ میرا شعر نہین ہے، انھون نے اصرار کیا، آخر کو مرزا سمجھ گئے کہ مجھ پر اس پیرایے مین اعتراض کرتے ہین اور جتاتے ہین کہ تمھارے اسی قسم کے اشعار ہوتے ہین،

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیون پر اردو اور فارسی مین جا بجا اشارہ کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہین ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہین ہین مرے اشعار مین معنی نہ سہی

ایک اور اردو غزل کا مطلع ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفاے حال ہے
خوش ہون کہ میری بات سمجھنی محال ہی

حسن اتفاق دیکھو مولانا فضل حق خیرآبادی دلی میں سررشتہ دار کمشنری تھے، بزرگوں کے وطن کے لحاظ سے، ان کو خیرآبادی کہو، مگر حقیقت میں ان کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا سب دلی میں گذرا تھا، یہ اور مفتی صدرالدین خاں ہمسن و ہم سبق اور دوستی کے لحاظ سے یکجان او دو قالب تھے، مرزا نوشتہ دلی میں رہے تو ان سے بھی ربط پیدا ہوئی، اور رفتہ رفتہ بڑھ گئی، یہانتک کہ مرزا ان کو اپنا مخلص بے ریا سمجھنے لگے، مفتی صاحب کی طعن و تعریض کو تو شاید کسی اور بات پر بھی محمول کرتے ہوں، مگر جب مولانا فضل حق نے روک ٹوک شروع کی، تو ان کے کان کھڑے ہوئے، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنا کلام سے دو ثلث سے قریب اشعار نکال ڈالے، اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا،

مرزا کی خصوصیات شاعری پر حالی نے بہت استیعاب کے ساتھ بحث کی ہے، یہ موقع اسکی تفصیل کا نہیں ہے، تاہم جہانتک ممکن ہی اختصار کے ساتھ کچھ کچھ بیان کرونگا، حالی کی رائے ہے کہ میر و مرزا سے لیکر ذوق تک جتنے شعرا گذرے ہیں، اُن کا ایک محدود دائرہ ہے، جس سے وہ کم نکلتے ہیں، ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہی کہ جو مضمون پہلے کسی طور پر بندھ چکا ہی، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب سے بیان کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے، برخلاف ان کے مرزا نے اپنی غزل کی بنیاد ایسے اچھوتے مضامین پر رکھی ہی جن کو اور شعرا کی فکر نے مس نہیں کیا تھا، اور معمولی مضمون ایسے طریقے سے ادا کئے ہیں جو سب سے نرالا ہے

میری رائے ناقص میں یہ عقیدہ اس حد تک صحیح اور قابل تسلیم ہی کہ مرزا نے اپنے تغزل کی بنیاد ایسے اچھوتے اسالیب پر رکھی ہی جن کو اور شعرار کی فکر نے مس تک نہیں کیا، وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں، جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے

یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک مضمون اُنکا نیا ہی ہو،

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ان سے جہانتک ہو سکتا ہے بچتے ہیں، اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ وصال سے، استخواں کو خشت سے، بدن کو قالبِ خشت سے، اور اسی قسم کی بہت سی تشبیہیں اُن کے ابتدائی ریختہ میں موجود ہیں،

ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں، سودا اور انشا شوخی اور ظرافت میں غالب سے بڑھکر ہیں، مگر جب وہ شوخی پر آتے ہیں، تو متانت ان کے ہاں سے رخصت ہو جاتی ہے،

ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے، جو مومن کے سوا اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے، اُن کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اُن سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جسکی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے،

مرزا کا معمول تھا کہ وہ نظم ہو یا نثر نہایت کاوش سے لکھا کرتے تھے، مگر باوجود اس عادت کے اپنی ذکاوت اور جولانیٔ طبیعت سے بدیہہ گوئی کی بھی مشق پیدا کر لی تھی،

لطیفہ کلکتہ میں مولوی کرم حسین مرزا کے ایک دوست نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مرزا سے کہا کہ اسکی کچھ تشبیہات نظم کیجیے، مرزا نے وہیں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا، اور ان کے صلہ میں وہ ڈلی ان سے

لی، چھ سات شعر اس کے ملاحظہ ہوں،

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے — خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض — نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز — میکدہ میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے — سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض — اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

اردو میں اٹھارہ سو شعر کا ایک انتخابی دیوان چھپ گیا ہے، اُس میں اکثر تمام کچھ ناتمام غزلیں ہیں، کچھ متفرق اشعار، دو قصیدے، کچھ رباعیاں اور قطعے،

عودِ ہندی ایک مجموعہ ہے جسمیں اردو کی کچھ تقریظیں، کچھ خطوط ہیں، اردوے معلی ایک دوسرا مجموعہ ہے، جس میں شاگردوں نے جس قدر اردو کے خطوط انکے ہاتھ آئے جمع کر دیئے ہیں، ان خطوط کی عبارت ایسی ہی، گویا وہ آپ کے سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں، بقول آزاد ان کے خطوط کی طرزِ عبارت ایک خاص قسم کی ہی، کچھ ظرافت، کچھ چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں، یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لیا اوروں کو لطف دے گئے،

علاوہ ان تصنیفات کے لطائفِ غیبی، تیغِ تیز، ساطعِ برہان وغیرہ اردو میں دوسروں کے نام سے ہیں، فارسی میں کلیات ہے جو درحقیقت ان کی جولانیِ طبیعت کا تماشاگاہ ہی، ایک کتاب پنج آہنگ ہے، فارسی انشا پردازوں کے واسطے لکھی ہی جو ان کے انداز پر لکھنا چاہے

قاطع برہان یا درفش کاویانی ایک رسالہ ہے جس میں برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں، نامۂ غالب اس کا جواب الجواب ہے، مہر نیمروز تاریخ کی کتاب ہے، دری زبان میں امیر تیمور سے ہمایوں بادشاہ تک کا حال ابوظفر بہادر شاہ کے حکم سے لکھا تھا، اسی سلسلہ میں دربار شاہی سے خطاب عنایت ہوا تھا، اس کا دوسرا حصہ ماہ نیم ماہ کے نام سے لکھنا چاہتے تھے، جس میں اکبر شاہ سے لیکر بہادر شاہ تک کا حال لکھنا مقصود تھا، مگر غدر ہو جانے سے یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی، دستنبو بھی تاریخی کتاب ہے، دری زبان میں غدر کی قیامت خیز تباہی کا حال لکھا ہے، غدر کی تاریخ بھی مرزا نے رستخیز بیجا سے نکالی ہے، اورکتنا لطیف تخرجہ ہے،

سبد چین ایک مختصر مجموعہ ہے، جسمیں چند قصائد، چند قطعے چند خطوط فارسی میں جو کلیات کی ترتیب اشاعت کے بعد لکھی تھی:

مرزا کو آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا تھا، کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا، نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے، انجام کار تہتر برس کا سن پاکر ۱۲۸۵ھ میں زندگی کے دن پورے کئے، "آہ غالب بمرد" تاریخ وفات ہے،

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہ درد کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اسد بسمل ہے کس انداز پر قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجیو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

لوں دام بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

زخم سلوانے سے میرے چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
شوریدگی کے حال سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجکو اٹھا دیا کہ یوں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے قضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت کدۂ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

نظر لگے نہ کہیں اُنکے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یا رب زمانہ مجکو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آئے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھوں ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

غالب اس تلخ نوائی میں مجھے رکھیو معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میر حسین تسکین

صاحبِ فکر بلند و اسلوب گفتارش دل پسند، از حضرت مومن خاں بدرستی اشعار پرداختہ از احباب راقم است، اھ (گلشن بیخار)

میر حسین تسکین دلی کے رہنے والے میر حیدر کی اولاد میں تھے، جنھوں نے حسین علیخاں کو اثنائے سفر میں محمد شاہ بادشاہ کی رضاجوئی کے خیال سے قتل کر دیا تھا، والد کا نام میر حسن تھا، مگر میرن صاحب کے لقب سے مشہور تھے،

دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں، شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، کچھ دنوں شاہ نصیر سے مشق سخن کی، اس کے بعد حکیم مومن خاں کے شاگرد ہو گئے،

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ خاں صاحب کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے، استاد کی طرزِ ادا، معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں دلآویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومن خاں کے ساتھ اس قدر ہمرنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے

کلام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائیگا،

جب دلی میں گذر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو رامپور چلے آئے، نواب یوسف علیخان ناظم تخلص نے قدردانی فرمائی، چند روز رامپور میں آرام سے بسر کرکے پچاس برس کے سن میں ۱۷ شوال ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی،

میر عبدالرحمٰن آسی ان کے سعادتمند بیٹے تھے، جنھوں نے شاہ نصیر کا دیوان مرتب کیا تھا، وہ نواب کلب علی خاں کے زمانے تک رامپور میں رہے، حکیم مومن خاں مرحوم کے یہ بھی شاگرد تھے، اور ان کے دیوان کی تکمیل انہی کے ہاتھوں سے ہوئی ہے،

کچھ نمک کچھ مشک کچھ الماس ہووے چارہ گر
پھر خدا چاہے بھرے دو دن میں منہ ناسور کا

جس وقت نظر پڑتی ہے اس شوخ پہ تسکین
کیا کہئے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

تسکین کروں کیا دلِ مضطر کا علاج اب
کمبخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا

ہر روز وہ ڈھونڈھے ہے کوئی تازہ خریدار
صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

کوچۂ یار میں میں نے تسکین
پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

غیروں کو اشارہ ہے مرے قتل پہ ناحق
یہ جنبشِ ابرو ہے تو سر کاہے کو ہوگا،

زندگی ہووے گی کس طرح سے یارب اپنی   دم میں سو بار اگر یوں وہ خفا ہووے گا

خوبصورت نہ کوئی ہو تو نہ ہو بدنامی   سچ تو یہ ہے کہ برا ہوتا ہے اچھا ہونا

اس گلی میں اژدحام اغیار کا یاد آگیا   دل میں جوشِ حسرت و یاس و تمنا دیکھ کر
دیکھنا شوخی یہ کہتے ہیں مرے دشمن سے وہ   کیا ہنسی آئی مجھے تسکیں کو روتا دیکھ کر

گر مر کے چھٹے دل کی تپش سے تو عزیزو   تا حشر نہ نکلیں گے کبھی گور سے باہر

اے چشمِ سرمگیں تری گردش نے کیا کیا   راحت پذیر تھے ستمِ آسماں سے ہم

یاں انتظار ہی میں کٹی میری ساری رات   واں وعدہ کیا کیا تھا انھیں یاد ہی نہیں

چھیڑوں ہزار طرح سے تم کو خفا کروں   قابو میں میرے دل ہو تو کیا جانے کیا کروں

تسکیں نے لے کر نام ترا وقت مرگ آہ   کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں

باتوں ہی کے مشفق ہیں سبھی حضرت ناصح   دو دن تو رہیں پاس مرے رنج و محن میں

یہ تو سچ ہے کہ جو تم چاہو گے کر گذرو گے
پر یہ ممکن نہیں ہم پر کبھی بیداد نہ ہو

آتے ہی اُن کے جان گئی واہ رے نصیب
نکلی جو آرزو تو دمِ واپسیں کے ساتھ

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی
بات تو کرنے دے اس سے دلِ بیتاب مجھے

یہ کہہ کے شب ہجر میں کرتا ہوں تسلی
جو رنج و مصیبت ہے سو انساں کیلئے ہے

تیغ نگاہ یار اچٹنے لگی تھی پر
برسوں گذر گئے مجھے آزار کھینچتے

اے دل یہ تیرا خاک میں ملنا ہے بے اثر
وہ کر جو اس کے طبعِ مکدّر میں گھر کرے

نہ اُٹھا گیا دل کے ہاتھوں سے تسکیں
کہا اُس نے جو سب سنا بیٹھے بیٹھے

فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں
تجھکو پہچانا تری رفتار سے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہو
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر از اوان صبا بہ مشق سخن مصروف بود و عمرے دریں شغل بسر بردہ در مراتب نظم و نثر ادائے خاص دارد و بہر دو زبان ریختہ و پارسی سحرے می طرازد، اھ (طور کلیم)

نواب مصطفیٰ خاں کے دادا ولی داد خاں کوہاٹ سے دلی آئے، نواب مرتضیٰ خاں لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے، اس کے صلہ میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں ملا، جہانگیر آباد کا علاقہ انھوں نے خود خرید کیا تھا، جو اب تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے،

نواب مصطفیٰ خاں کی ولادت ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء کو دلی میں ہوئی، تعلیم و تربیت کے جو بہترین سامان ہو سکتے ہیں، وہ اُن کو میسر ہوئے، مولوی محمد نور، مولانا کرم اللہ محدث اور دوسرے نامور علماء سے تعلیم پائی، اور سفرِ حج میں شیخ محمد عابد سندی مشہور محدث سے سند حاصل کی،

شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، حکیم مومن خاں سے مشقِ سخن کی، دلی اُس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی، بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبد اللہ خاں علوی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبد الرحمن خاں احسان، میر حسین تسکین، اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا تھا، جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہونگے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا،

مفتی صدرالدین خاں[۵] اور خود نواب کے ہاں ہر ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا، اہلِ کمال اُس میں جمع ہو کر لطفِ سخن اُٹھاتے تھے،

---

[۵] مفتی صدرالدین خاں بہادر عالیخاندان، والا دودمان، سرمایۂ نازشِ ہندوستان، فضل و کمال اور فنونِ ادبیہ کی بے نظیر قابلیت میں اپنا آپ جواب تھے، سرزمین ہند میں جامعیت کے دو ہی چار شخص ہوئے ہونگے اس کے ساتھ مزاج دیکھو تو خلقِ مجسم اور لطفِ مصور،

علم و کمال میں بقول شیفتہ "در فنون ادبیہ ثانی اعشی و جریر است و در مراتب حکمیہ ثالث باقر و نصیر" عقل صواب اندیشی میں جنرل اکڑلونی کے نفسِ ناطقہ جس آسانی سے راجپوتانہ کی پیچیدگیوں کو حل کر کے سرکار انگریزی سے معاہدے کرائے ہیں، وہ انہی کا کام تھا

علما کی مجلس ہو تو اُس میں صدر نشین، مشاعرہ ہو تو اُس میں میرِ مجلس، حکام کے جلسوں میں موقر و ممتاز، بےکسوں اور محتاجوں کے ملجا و ماویٰ، سرسید آثار الصنادید میں جہاں کہیں ان کا تذکرہ کرتے ہیں پورے ایک صفحہ میں ان کے القاب و آداب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں،

ہزار بار بہ شویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

نواب مصطفیٰ خاں گلشن بیخار میں فرماتے ہیں "باعتقاد من روزیکہ بشرف مجالست ایشاں بپایاں آید داخل ایامِ عمر نیست" خدا جانے ان کے وقت میں کتنی برکت تھی، صدر الصدوری کے فرائض کے ساتھ حکام و رؤسائے شہر سے میل جول، مشاعروں کی شرکت، سب سے بالاتر درس و تدریس کا مشغلہ تھا، شاہجہان بادشاہ کا مدرسہ دار البقا سلطنت کی تباہی کیساتھ برباد ہو چکا تھا، اسکو اپنے روپیے سے زندہ کیا، عمارت درست کی طلبہ کے وظائف اور انکے پڑھانیکو اساتذہ مقرر کئے اور بطور مدرسِ اعلیٰ منتہی طلبہ کے اسباق اپنے ذمہ رکھے ہفتہ میں ایکبار تعطیل کے دن سب کو لیکر باغ جاتے طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے انکو کھلاتے اور خوش ہوتے،

شاگردوں میں نواب سید صدیق حسن خاں بہادر مولوی سمیع اللہ خاں سی ایم جی مفتی سعد اللہ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اُس زمانہ میں نواب کی سخن گوئی سے زیادہ اُن کی سخن فہمی کی دھوم تھی، مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معرفت و مداح تھے، مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن و قبح کا معیار تھی، فرماتے ہیں،

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بایں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

نواب نے سفرِ حج کے بعد اس شغلِ بے حاصل کو بہت کم کر دیا تھا، کبھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے، تصنیفات میں ایک فارسی دیوان ہے، ایک ریختہ کا دیوان، ایک مجموعہ ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۱) مولوی ذوالفقار علی، مولوی فیض الحسن اور ان جیسے خدا جانے کتنے علما ان کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر نکلے جن سے ایک عالم فیض یاب ہوا، سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اکیاسی برس کی عمر پاکر سنہ ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی، مولانا فضل امام خیرآبادی سے فنونِ حکمیہ اور شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ اور ان کے بھائیوں سے علومِ دینیہ اور معارفِ ادبیہ کی تعلیم پائی تھی، عربی اور فارسی کلام کے یہ لکھنے کا یہ موقع نہیں، اردو کے دو چار شعر نقل کرتا ہوں،

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں

کامل اس فرقۂ زہاد میں اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مکھڑا وہ غضب زلفِ سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جیے کوئی شب ایسی سحر ایسی

جس میں فارسی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ظاہر ہوتا ہے، ایک سفرنامہ ہے ترغیب السالک الیٰ احسن الممالک، فارسی نام اس کا رہ آورد ہے،

علاوہ ان کتابوں کے ایک مبسوط تالیف گلشن بیخار ہے جس میں ریختہ گو شعرا کے انتخابی کلام کو فراہم کیا ہے، اس کو دیکھ کر ان کی سخن فہمی کی بیساختہ داد دینی پڑتی ہے،

نواب دیندار اور مذہبی آدمی تھے، جوانی میں مولانا شاہ اسحٰق محدث کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ ہندوستان سے ہجرت فرما گئے، صحبت میسر نہیں ہوئی، پھر جب خدا کی توفیق نے رہبری کی، حضرت شاہ عبد الغنی محدث سے تجدید بیعت کرکے حلقۂ مشائخ میں داخل ہو گئے، اس لحاظ سے وہ دنیا خورد و عقبیٰ برد کے صحیح مصداق تھے،

ترسٹھ برس کی عمر پائی، اور سنہ ۱۲۸۶ھ میں دنیا سے انتقال کیا،

ہائے اُس برقِ جہاں سوز پہ آنا دل کا
سمجھے جو گرمیِ ہنگامہ جلانا دل کا

ایک نالہ میں ستمہائے فلک سے چھوٹے
جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ آسان نکلا

کب طالعِ خفتہ نے دیا خواب میں آنے
وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا جانے کہہ دی غیر نے کیا اُس کی بزم میں   آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آگیا

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر   کیا کوئی اور ستم یاد آیا

کہتا تھا وقتِ نزع کہ ہر اک سے شیفتہ   دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر

جو بات میکدہ میں ہے اک اک زبان پر   افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز
اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی   کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا   ملے گا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

کہتے ہیں کہا بے وفا مجھے میں نے جو یہ کہا   مرتے رہیں گے تم ہی پہ جیتے ہیں جب تلک
یاں عجز نے دیا ہے نہ واں نازِ دلفریب   شکرِ بجا رہا گلۂ بے سبب تلک

ہیں جاں بلب کسی کی اشارت کی دیر ہے   دیکھے ہے اُس نگہ کو قضا اور قضا کو ہم

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ   دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

دشمن نواز یار و فلک بوالہوس پرست   کس سے جفائے غیر کا یا رب گلہ کریں

کچھ اور تجھ بے دلی کے سوا آرزو نہیں
اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

آہ و زاری نارسا شوقِ اسیری بے اثر
کون لائے آشیانے تک مرے صیاد کو

ننگِ مہمانیٔ دشمن بھی کیا ہم نے قبول
شیفتہ لیکن نہ آئے وہ کسی تدبیر سے

ناصح تری زبان ترے بس میں نہ ہو تو پھر
انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

اے جاں لب پہ آ کے ٹھہرنے سے فائدہ
رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

ایسی رغبت سے کرے قتل، گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اس کو تو لو، تم سے محبت نکلی

اے عدو کس لئے نازاں ہے سمجھ تو آخر
جس سے ہم خوار ہوئے ہیں یہ وہی عزت ہے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

جس لب کے بوسے غیر لے اس لب کی شیفتہ
کم بخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

سحر اُن کو ارادہ ہے سفر کا　　قیامت آنے میں شب درمیاں ہے

کرامت علی شہیدی

در عروض دستگاہے معقول دارد و در حساب مکانتے مقبول، در بلاد پنجاب و گجرات بیشتر بسر بردہ، گاہ گاہ بہ دہلی وارد شدہ، ہنگام ورود دہلی با راقم آثم بارہا برخوردہ، مرد بے تکلف و وارستہ مزاج و وسیع المشرب است ازاداللہ می زید (از گلشن بیخار)

کرامت علی نام، شہیدی تخلص، عبدالرسول خاں کے بیٹے تھے، بانس بریلی وطن تھا، مگر لکھنؤ میں نشو و نما ہوا، مصحفی سے مشقِ سخن کی، جب ان کا انتقال ہو گیا تو شاہ نصیر کو دکھانے لگے، شعر و سخن میں ایسی قدرتِ کامل بہم پہنچائی تھی کہ زمین کیسی ہی سنگلاخ ہو، ایک طرح میں چو غزلہ اور پنج غزلہ لکھتے تھے، اور کوئی غزل پچیس ۲۵ اور پینتیس شعر سے کم کی نہ ہوتی،

یارباش، زندہ دل، بذلہ سنج، مرنجان مرنج اور وارستہ مزاج آدمی تھے، والد مرحوم فرماتے تھے کہ شیخ عابد علی بلندونی ایک سیر چشم، مہمان نواز آدمی ضلع فتحپور ہنسوہ کے رہنے والے اودے پور میں کسی بڑے عہدے پر مامور تھے، انکا اور شہیدی کا بہت دنوں ساتھ رہا ہے، ابتدائے ملازمت میں وہ اور شہیدی نیمچ کی چھاؤنی میں سرکار انگریزی کے ملازم ہوئے تھے،

شہیدی کا تعلق کمسریٹ سے تھا، بہت سا روپیہ یار باشی میں انھوں نے اڑا دیا، جب حساب طلب ہوا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، مگر تھے طبیعت دار، جس مکان

میں دفتر تھا، اُسی کے ایک حصے میں رہتے بھی تھے، رات کو اُس میں آگ لگا دی، انکے سامان کے ساتھ دفتر بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا، یہ کچھ دنوں کے لئے دیوانے بن گئے، اور خدا خدا کر کے جان بچی،

سرکاری ملازمت کے جاتے رہنے پر کوئی تعلق گوارا نہیں کیا سیر و سیاحت میں زندگی بسر کرتے رہے، بھوپال، دلی، اجمیر، پنجاب اور گجرات میں اکثر دورہ ہوتا رہتا تھا، اور ان مقامات میں کثرت سے دوست احباب پیدا کر لئے تھے،

۱۲۵۵ھ میں حج و زیارت کے ارادہ سے گھر سے نکلے، اسی سال فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے کہ راستہ میں بیمار پڑے، ۸ر صفر ۱۲۵۶ھ کو جس وقت تمام منزلیں طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آتا تھا، ایک حسرتناک نظر اس پر ڈالی، اور طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا،

ان کے مشہور قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ طلب ہیں، جن میں اُنھوں نے اسی کی تمنا کی ہے، کیسے خوش نصیب تھے، کہ جن کی آرزو ایک حد تک پوری ہو گئی،

ہوئی ہے ہمتِ عالی مری معراج کی طالب
میسر ہو طواف اے کاش مجھکو تیری مرقد کا
کبھی نزدیک جا کر آستانہ پر ملوں آنکھیں
کبھی گرد در بیٹھوں میں کروں نظارہ گنبد کا
فراغِ دل سے گر دانِ زندگی کا کوئی دم گذرے
حسد ہو خضر و عیسیٰ کو مرے عیشِ مخلد کا
مدینہ کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ
کسی صحرا میں واں کے طعمہ ہوں میں دام اور دد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

غزلوں کے انتخابی شعر ملاحظہ ہوں،

قدر سب چاہنے والوں کی ترے دیکھ چکے
خوار رہتا ہے پرانا، تو پشیمان نیا

عام ہیں اسکے تو الطاف شہیدی سب پر
تجھسے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح
وہ اُسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا

شہیدی حشر کے دن بھی ہمارا ہو چکا اُٹھنا
یہی عالم رہا بعدِ فنا گر ناتوانی کا

فضائے باغ سے ہے گوشۂ قفس خوشتر
گر اپنے دل میں نہ ہو دغدغہ رہائی کا

ہو چلا خنجرِ بیداد کا بسمل ٹھنڈا
لے ہوا اب تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

میں تو سمجھاؤں ہزار اُسکو شہیدی لیکن
میرے سمجھانے سے اب یہ دلِ شیدا سمجھا

اغیار کا منھ تھا مجھے محفل سے اُٹھائے
سچ یہ ہے تری رنجشِ بیجا نے اُٹھایا

بیمار محبت کو اب اللہ شفا دے
سنتے ہیں کہ ہاتھ اس سے مسیحا نے اُٹھایا

اندوہ دائمی میں کٹی کس خوشی سے عمر
گر مجکو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

کر چکے نیم نگہ پر مرے دل کا سودا
نہ خریدو یہ ابھی اور بھی ارزاں ہوگا

سیکھ لے ہم سے کوئی ضبطِ جنوں کے انداز
برسوں پابند رہے پر نہ ہلائی زنجیر

بے قراری دل کی میں کیونکر بتاؤں یار کو
سینہ پر جب ہاتھ رکھتا ہی ٹھہر جاتا ہی دل

ہر وضع کے انسان سے ملاقات ہی انکو
سب خلق مدارات کے قابل ہی مگر ہم

دوستو گر ہم سے کج خلقی ہوئی رکھنا تم معاف
فرقتِ جاناں میں اپنے جی سے ہیں بیزار ہم

رحم آتا ہی مجھے اس نوجوانی پر تری
اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں۔

اے روزِ قیامت ادب اس کا ہی تجھے فرض
ہے تجھ سے بڑی میری شبِ تار کئی دن

ناکامیِ جاوید کی ہم مانتے منت
افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

وہ وقت تو آنے دے بتا دیں گے شہیدی
بن آئے کسی شخص یہ مر جاتے ہیں کیسے

سب طالب اپنے اپنے ہوں مطلوب سے بہم
ہیں نامراد ایک ہمیں تیرے واسطے

ان کے دیوانوں کو جی کیا ضبط ہی اوقات کا
دو پہر ہنستے رہے گر دو پہر رویا کئے
دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کئے

حصہ سوم

طبقۂ متاخرین

دور اول

دلی کی تباہی کے بعد ارباب فضل و کمال کا کوئی ملجا و ماویٰ نہیں رہا، کچھ لوگ مرشد آباد و عظیم آباد چلے گئے، کچھ حیدر آباد گئے، مگر یہ مقامات دلی سے اتنے دور تھے، اور سفر میں اتنی دشواریاں تھیں کہ ہر ایک کو ان مقاموں پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، خصوصاً ایسی حالت میں کہ مرہٹوں کی ایک نئی طاقت ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کی زور آزمائی کر رہی تھی، کبھی بجلی بن کر دکن پر کوندتی، کبھی بنگالہ میں آکر گرجتی تھی، اُس زمانہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو راتوں کو میٹھی نیند سو سکتا ہو،

دلی سے قریب تر فرخ آباد اور فیض آباد دو مقام ایسے تھے، جہاں ان بدنصیب اور خانماں آوارہ لوگوں کی تھوڑی بہت قدردانی ہوتی تھی، فرخ آباد کی ریاست تباہ ہوئی اور فیض آباد سے نواب آصف الدولہ نے دار السلطنت لکھنؤ کو منتقل کیا تو صرف لکھنؤ اُن کا ملجا و ماویٰ رہ گیا،

ایک خاص سبب اور بھی فیض آباد پر لکھنؤ کی ترجیح کا یہ پیدا ہوا کہ نواب موتمن الدولہ

محمد اسحق خاں شوستری کی بیٹی امۃ الزہرا بیگم نواب شجاع الدولہ کو بیاہی گئیں، پھر ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ کی شادی نواب خانخاناں کی بیٹی سے ہوئی، ان بیگموں کے اعزہ اور متوسلین فیض آباد آبسے اور چند دنوں کے بعد لکھنؤ میں آکر بود و باش اختیار کی،

امۃ الزہرا بیگم محمد شاہ بادشاہ دلی کی منہ بولی بیٹی تھیں، نہایت سیر چشم، فیاض اور مہمان نواز، انھوں نے آدھی دلی کو اپنی طرف کھینچ لیا،

اتفاق دیکھو کہ پہلے میرزا جواں بخت شاہ عالم بادشاہ کے ولی عہد لکھنؤ آئے، یہ کچھ دنوں رہ کر بنارس چلے گئے، پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ آئے اور وہ یہیں رہ پڑے ان کی وجہ سے بھی کچھ دلی کے بھولے بھٹکے آکر جمع ہو گئے، شاہزادہ کو بھی اپنے خانہ زادوں پر لطف و کرم تھا، جہانتک ہو سکتا وہ ان لوگوں کو سمیٹے رہتے تھے،

علامہ سراج الدین علی خاں آرزو اور میر غلام حسین ضاحک وغیرہ بہت پہلے فیض آباد آکر بہو بیگم کے لائق بھائی نواب مرزا علی خاں، اور نواب سالار جنگ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہے تھے، لکھنؤ کے دار السلطنت ہونے پر میر ضاحک کے بیٹے میر حسن اور اور پوتے میر مستحسن خلیق لکھنؤ آبسے،

میر سوز اور مرزا رفیع فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند کی مہربانی سے زندگی بسر کر رہے تھے، جب وہاں کا کھیل بگڑا تو فیض آباد پھر لکھنؤ آگئے،

میر محمد تقی میر کی وضعداری نے مدتوں انکو دلی سے نکلنے نہ دیا، آخر کب تک، وہ بھی گھبرا کر لکھنؤ آگئے، پھر شیخ غلام ہمدانی مصحفی، میر ولی اللہ محب، میر غلام حسین برشتہ، میر انشاء اللہ خاں اور جرأت بھی آگئے،

مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق اختر نے بھی لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، غرض

کہ لکھنؤ میں دلی کی سبھا پوری کی پوری اٹھ کر آگئی، اور گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا،

یہ وہ زمانہ ہے کہ فرمانروایانِ اودھ "نواب وزیر" کہلاتے تھے، اور دلی کے برائے نام بادشاہ کی طرف سے خطاب اور خلعتِ وزارت انکے لئے آیا کرتا تھا، سرکار کمپنی نے ایک خاص اثر کی بنا پر ان کو شہ دی اور نواب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی سر پر رکھ کر دلی کی برائے نام وزارت سے سبکدوشی حاصل کی،

نئے بادشاہ کی نئی نئی امنگیں، دولت کی فراوانی، نواب سعادت علیخان کا جمع کیا ہوا اسی کرور روپیہ کا خزانہ، ہر طرف سے عیش و عشرت کی موجیں آنے لگیں اور گھر گھر شادیانے بجنے لگے، بقول شاعر ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

وضع قطع، لباس، خورد و نوش اور ماند و بود غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تراش خراش نے نئے نئے انداز پیدا کر دیئے، گنبد نما دستار کی جگہ ہلکی اور نکیلی ٹوپی، جامہ و نیمہ کی جگہ چست شلوکہ اور انگرکھا، شلوار کی جگہ کلی دار غرارہ یا چوڑیدار پائجامہ، سلیم شاہی کی جگہ انی والا کفش یا بے نوک کا لکھنؤ جوتا، اسی طرح ہر چیز کو قیاس کرو، ہر چیز نئی زمین نئی، آسمان نیا ہو گیا،

کہن سال اور کہنہ مشق شاعر جن کی عمریں دلی کی آب و ہوا میں بسر ہوئی تھیں، ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے، نوجوانوں نے میدان خالی پایا تو ان کی جوانی کی امنگیں ابھر آئیں، زبان کی تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ جو اگلے زمانہ میں عموماً مروج تھے ترک کر دیئے مثلاً آئے ہے، جائے ہے، کھوتے ہے، ٹک، نت یا جمع مونث کے فعلوں کو الف نون کے ساتھ آئیاں، جائیاں، اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بولنا، جیسے بھاریاں، ان سب کو خلافِ فصاحت قرار دیا جس کو بالآخر

دلی والوں کو بھی ماننا پڑا، اور اہلِ لکھنؤ دلی والوں کی تقلید سے اسی طرح آزاد ہو گئے جیسے نواب وزیر نے دلی کی بادشاہی کے خطاب و خلعتِ وزارت سے آزادی حاصل کر لی تھی،

مگر افسوس ہے کہ ان بزرگوں نے زبان کی تراش و خراش پر قناعت نہیں کی، اپنی بلند پروازی کے زور میں قوتِ تخئیل و حسنِ تعلیل میں اعتدال نہ رکھنے سے ایسے اوج پر پہنچے جہاں آفتاب تارا بن گیا، اور دل پر اثر کرنے کی جگہ زبانوں پر صرف واہ واہ رہ گئی،

چونکہ اسی مضمون کو مقدمہ میں بیان کر چکا ہوں لہذا اس جگہ اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں،

شیخ امام بخش ناسخ[1]

والا مایہ، عالی پایہ، بلند اندیشہ، نازک خیال است و در تلاش مضمون تازہ و معنی منزا بے مثل و مثال، از اقسام سخنوری بغزل سرائی مائل و غیر از رباعیات صنفے آخر از و دیدہ نہ شد، (گلشن بیخار)

شیخ امام بخش نام، ناسخ تخلص، شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے، اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس نے متبنی کیا تھا، بچپن فیض آباد میں بسر کیا، اُس زمانہ کے رواج کے مطابق ورزش پر طبیعت مائل ہوئی، ہزاروں ڈنڈ کرتے اور سیکڑوں ہاتھ جوڑیوں کے ہلاتے، ورزش سے بدن کسرتی اور بھر تیلا ہو گیا تھا،

نواب محمد تقی فیض آباد کے ایک امیر کو ایسے بانکوں ترچھوں کے رکھنے کا شوق تھا

---

[1] ناسخ و آتش گو باعتبار زمانہ کے ذوق و غالب کے معاصر ہیں، اسلئے انکو طبقۂ متوسطین یعنی دور سوم میں جگہ ملنی چاہیئے، مگر مصنف مرحوم نے انکی شاعری کی عمر اور نشو و نما کے لحاظ سے انکو متاخرین کے طبقۂ اول میں شمار کیا ہے، (سید سلیمان ندوی)

ان کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ لائے، سیاہ فام، مضبوط اور گٹھا ہوا بدن، سر منڈا ہوا، داڑھی خشخشی، بانکپن کے ساتھ جاڑوں میں شب کو نواب صاحب کے مکان کے پنبئی پردے اوڑھتے اور دن کو باریک ململ کے کپڑے پہن کر ادھر ادھر اکڑتے پھرتے،

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے، انھوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا، وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیت نامہ کے رو سے ان کو مل گئی، اب آسودہ حال ہو گئے اور ٹکسال میں ایک مکان لیکر بود و باش اختیار کی،

حسنِ اتفاق سے مکان کے سامنے گلی بیچ مولوی وارث علی کا کمرہ تھا، وہ گھر بیٹھے طلبہ کو مفت درس دیا کرتے تھے، ان کو بھی شوق ہوا، جو کتاب وہ پڑھاتے اور ان کے مناسبِ حال ہوتی، لیکر بیٹھ جاتے اور روز کے روز سبق یاد کر لیتے، اسی طرح رفتہ رفتہ اچھی خاصی استعداد ہو گئی، جو فن شاعری کی ضروریات پورا کرنے کو کافی تھی،

شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے، مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا، جو غالباً نواب محمد تقی کی ملازمت میں پیدا ہوا ہوگا، جو خود شاعر تھے، اور ان کا گھر شاعروں کا ملجا و ماوی تھا، پھر لکھنؤ آئے، تو یہاں جرأت کی گرم بازاری اور مصحفی و انشا کے ہنگامے آنکھوں سے دیکھے وہ شوق یہاں آکر چمک گیا، چپکے چپکے شعر کہتے اور کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے بعضوں کا خیال ہے کہ ابتدا میں مصحفی سے اصلاح بھی لی تھی، کوئی کہتا ہے کہ مصحفی کے شاگردوں میں محمد عیسیٰ تنہا ایک شخص ہیں، ان سے تنہائی میں مشورہ کرتے تھے[1] جب اطمینان ہوا تو مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے،

---

[1] حسرت موہانی نے اردوے معلی میں مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچہ سے ایک فقرہ نقل کیا ہے جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، مصحفی نے لکھا ہے کہ حصہ نعمت الوان ایں خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہا است بفقیر ہم نیز چیزی زندہ دل دارد مقسوم گشت

اُس زمانہ میں مرزا حاجی[1] ایک امیرزادے تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور اُن کی سرکار میں مرزا قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر[2] اور بہت سے اہلِ کمال جمع رہتے تھے،

---

[1] مرزا حاجی لکھنؤ کے بڑے عالیخاندان امیرزادے تھے، نام قمرالدین احمد تھا، والد کا نام مرزا فخرالدین احمد مگر مرزا جعفر کے نام سے مشہور تھے، نواب حسن رضا خاں ان کے ماموں تھے، مرزا جعفر نے درسی کتابیں ملا مبین فرنگی محلی سے، دینیات مولوی سید دلدار علی مجتہد عصر سے اور فنونِ ریاضیہ خاں علامہ تفضل حسین خاں سے پڑھی تھیں اور خان علامہ کے عہد نیابت میں بخشی گری کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہوئے،

مرزا حاجی اسی نامور باپ کے بیٹے اور خاندانی حیثیت سے مرزا زین الدین عالمگیری کی اولاد میں تھے، علوم و فنون میں صاحبِ استعداد، مذاقِ سخن سے آشنا اور مسٹر جان بیلی رزیڈنٹ لکھنؤ کے نفس ناطقہ تھے نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ نوابی میں انکا رسوخ بہت بڑھ گیا تھا، پانچہزار روپیہ ماہوار تنخواہ بھی تھی اور نواب وزیر کو بجز اوقاتِ استراحت کے انکی مفارقت ایک گھڑی کو گوارا نہ تھی، عام دستور کے موافق انکا گھر اُس زمانہ میں قبلۂ حاجات بنا ہوا تھا، مرزا قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر اور دیگر اہلِ فضل و کمال انکی مصاحبت میں رہتے تھے، شعر و سخن کا مشغلہ، زبان کی تراش خراش اور تحقیقات علمی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا، اسی صحبت میں شیخ امام بخش ناسخ کا نشو و نما ہوا۔

چند روز کے بعد نواب معتمد الدولہ کا زمانہ موافق ہوا، اُنھوں نے مرزا حاجی کو گھر میں بٹھا دیا، ایک مدت تک نظربند رہے، ان کے تمام اعزہ جو سلطانپور، رائے بریلی اور سلون کی نظامتوں پر مامور تھے، محاسبہ کے شکنجے میں کسے گئے، مرزا حاجی کا لاکھوں روپیہ برباد ہوا، آخرکار ۱۲۳۸ھ میں جلاوطن کیے گئے اور انکی املاک نواب نے محسن الدولہ بہادر کو دلا دی، تاکہ پھر واپس آئیں تو ان سے نہ لے سکیں، یہ کچھ دنوں کانپور میں رہے، اس کے بعد نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علیخاں نے فرخ آباد بلا لیا، علاوہ مصارف معمولی کے دوسو روپیہ ماہوار ان کی جیب خرچ کو مقرر کر دیئے، (بقیہ حواشی صفحہ ۳۴۶ پر)

شیخ امام بخش ناسخ کو خوش قسمتی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی، انکی صحبت میں انکو بھی زبان کی تراش خراش اور تحقیق و تدقیق کا چسکا بڑا، اور ان کے دل بڑھانے سے کلام

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۵) جب حکیم مہدی وزیر ہو کر لکھنؤ آئے تو ان کو اپنے ساتھ لائے، املاک پدری تو مل گئی مگر جس قدر املاک نواب محسن الدولہ کے پاس تھی وہ نہ مل سکی،

حکیم مہدی کی معزولی کے بعد بھی یہ لکھنؤ میں رہے، مگر نواب روشن الدولہ کی وزارت میں باوجودیکہ وہ ان کے عزیز تھے، مگر کمبوہوں کی سازش سے پھر انکو لکھنؤ چھوڑنا پڑا، صرف دو ہزار روپیہ سالانہ ان کو دربار شاہی سے ملتا رہا، یہ کانپور میں کسی نہ کسی طرح گذر کرتے رہے، واجد علی شاہ کے میں نواب علی نقی خاں کی مہربانی سے جو ان کے رشتہ دار تھے، دوبارہ لکھنؤ دیکھنا نصیب ہوا مگر چند روز کے بعد سنہ ۱۲۷۵ھ میں دنیا سے گذر گئے،

ؔ۲ قاضی محمد صادق خاں ہوگلی کے رہنے والے مرزا قتیل کے شاگرد اور بڑے بامذاق شاعر تھے، کچھ دنوں غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے زمانے میں خوشحالی سے زندگی بسر کی، اور محامد حیدریہ ایک کتاب غازی الدین حیدر کی تعریف میں لکھی آخیر زمانہ میں واجد علی شاہ کے یہاں رسائی ہو گئی تھی اسی لئے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا تھا، اور غدر ۵۷ء کے بعد یہیں پیوند خاک ہوئے تصنیفات میں لوامع النورانی وجوہ المنثورہ انشا پردازی میں، دو دیوان فارسی اور اردو کے، ایک تذکرہ آفتاب عالمتاب بہت ضخیم جسمیں چار ہزار دو سو چونسٹھ ۲۲۶۴ فارسی شعرا کا ذکر کیا ہے، علاوہ ان کے نور الانشا، گنج بے رنج وغیرہ چند کتابیں اور بھی ہیں، اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

کل شیخ بن کے مجتہد عصر ساقیا دکھلا کے باغ سبز ثواب عذاب کا
کہنے لگا ز راہ تبختر مجھے یہ طنز معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ میں بھی ہوں خوب جانتا پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا
مے ہو اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ وش اور کوئی بھی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا، رفتہ رفتہ دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش بڑھ گیا،

اُس پر خدا ساز بات یہ ہوئی کہ مرزا حاجی کی ہم نشینی نے اُن کی شخصیت بڑھا دی، اہلِ فہم اور اہلِ کمال ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آنے اور اپنی مطلب براری کا ذریعہ سمجھنے لگے، غرض کہ مرزا حاجی کی مہربانی سے ان کی شاعری خوب چمکی، اور ان کو لکھنؤ میں رشد و فروغ قبل از وقت حاصل ہو گیا،

چند روز کے بعد نواب معتمد الدولہ[۵] کا دوبارہ عروج ہوا، اور مرزا حاجی نظر بند ہوئے

[illegible]

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بےحجاب — یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا
کھینچ اُس کو اور اپنے ملا کر وہ منہ سے منہ — دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو پیجئے — گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اُس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو — گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام — قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

---

[۵] آغا میر کا نام سید محمد خطاب "معتمد الدولہ مختار الملک ضیغم جنگ" تھا کشمیر کے رہنے والے غازی الدین حیدر کی نواب زادگی میں ان کے معتمد خاص تھے، جب وہ نواب وزیر ہوئے تو یہ نائب، وہ بادشاہ ہوئے، تو یہ وزیر قرار پائے، غازی الدین حیدر نے قسم کھائی تھی کہ وہ مسکرات کے قریب نہ جائیں گے، چند روز ہوش گوش سے کام کرتے رہے، یہ آغا میر کو کیونکر گوارا ہو سکتا تھا، اُنھوں نے عرض کیا کہ پیر و مرشد نے حضرت عباسؑ کی قسم کھائی ہے اور غلام بنی فاطمہ ہے، اس کا مظلمہ غلام کے ذمہ ہے، ع

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

پھر تو وہ ایسے بدمست ہوئے کہ جس بدنصیب کو نواب نے داخل اموات کر دیا، اسکو اگر بادشاہ نے کہیں راہ میں دیکھ کر پہچانا اور نواب سے کہا کہ یہ تو جیتا ہی، عرض کرتے اس کو غلام چشمِ بشری سے نہیں دیکھ سکتا، پیر و مرشد کی چشمِ مبارک البتہ عالمِ ارواح کو دیکھ سکتی ہی، حاضرین بھی نواب کے خوف سے یہی عرض کرتے، اس طرح رفتہ رفتہ بادشاہ اکثر مصاحبین کے سامنے فرماتے کہ خداوندا میں کسی طرح ظلم کا روادار نہیں، یہ شخص بنی فاطمہ ہے اگر کوئی بات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۸ پر)

یہ شیخ صاحب چونکہ مرزا کے محرم راز اور مقرب خاص تھے، چھپ چھپ کر ان سے ملتے رہتے نواب کو خبر ہوئی، تو ان کو بھی گھر میں بٹھا دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۷) عدل و انصاف کے خلاف سرزد ہو تو اسکا بھی فدیہ ادا ہو، مگر حالت یہ تھی کہ ہر شخص کی عافیت تنگ تھی، جعل و فریب کا بازار گرم تھا، ملازمین و متوسلین کی تنخواہیں کئی سال کی چڑھی ہوئی، جس طرح سے بن پڑتا وہ لوٹ مار کرکے پیٹ پالتے تھے، سوداگروں سے مال و اسباب خرید کیا جاتا تھا اور برسوں قیمت نہیں ملتی تھی، ریذیڈنٹ تک کوئی پہونچ گیا تو قیمت ملی ورنہ جان کی بھی خیر نہیں، اپنے لئے محل سرائیں بنوائیں تو سیکڑوں کی خانہ ویرانی ہوگئی، اور ایک کرور سے کم عمارتوں پر خرچ نہیں کیا، مگر زندگی بھر اسمیں رہنا نصیب نہیں ہوا، چند روز کے بعد نکالے گئے، اور ہمارے بچپن میں وہ عالیشان عمارتیں کھد کر اسکی اینٹیں لکھنؤ سے سیتاپور تک ریلوے لائن میں بچھا دی گئیں، عالیشان سرائے، جن کی تعمیر کردہ رہ گئی تھی، وہ اب جاکر کھدی، اور وہاں پارک بن گیا ہی، نواب کی سخاوت و فیاضی کے ایسے ایسے قصے مشہور ہیں کہ آج انکو مشکل سے لوگ باور کریں گے، ہمارے بچپن تک ایسے صدہا لوگ موجود تھے جنھوں نے ان سے فائدہ اٹھایا ہی، اور جو معمولی حیثیت میں لکھنؤ آئے، دوسرے دن انکے دروازے ہاتھی جھومنے لگے، خدا جانے کہاں تک سچ ہی، سید محمد میرزا اثر نے قیصر التواریخ میں لکھا ہے کہ میر بندہ علی ایک عالیخاندان مفلس ہوکر لکھنؤ آئے، مسخرگی پیشہ کی بدولت نواب کے مصاحب ہوگئے، وہ کہتے تھے کہ نواب کے ہاتھوں گیارہ سال میں چودہ لاکھ روپیہ میں نے پایا، محمد خاں انکا خدمتگار تھا، اس کے پاس چالیس ہزار روپیہ جیب خاص کا تھا، اس نے ایک دن عرض کیا کہ ایک چکلہ دار قید ہے، کہتا ہی کہ قید سے نجات پاؤں تو دس ہزار روپیہ دونگا، فرمایا جو تمھارے پاس ہی پہلے اسے دے دو پھر اس سے لینا، کشمیر سے اسی زمانہ میں نادر اور تحفہ مال آیا کرتا تھا، ایک ایک سرگزہ رومال پانچ پانچ ہزار تک کو نواب نے لیا تھا، ایک دن دوشالہ اوڑھے ہوئے اصلاح بنوا رہے تھے، خاص تراش دوشالہ کو دیکھ رہا تھا، پوچھا کیا دیکھتا ہی، عرض کیا غلام کو حضور کی بدولت دوشالے بہت نصیب ہوئے مگر ایسا ہی کہ آدمی اسے دیکھا کرے، اتار کر اسکو دیدیا

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹ پر)

ایک دن اُن کے بلانے کو چوبدار آیا، سمجھے کہ رنگ بے رنگ ہے، مبادا بے آبروئی ہو، چوبدار سے کہا تم ٹھہرو میں سواری کی فکر کر لوں، اُس نے کہا کہ میں کوتوال سے کہہ کر سواری لاتا ہوں، وہ اُدھر گیا اور یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، جہاں جاتے ہیں نواب کے ڈر سے کوئی پناہ نہیں دیتا، اتفاق سے میر اسد علیخاں مل گئے، اُنھوں نے اِنکو اپنے گھر میں پناہ دی، وہ نواب کے رشتہ دار تھے، کہہ سنکر صفائی کرادی،

نواب مرزا کے استیصال کے درپے تھے، مطلب کا آدمی سمجھ کر اُن پر ڈورے ڈالے، یہ بھی ایسے لطیفۂ غیبی کے منتظر رہتے تھے، دنیا کے شرم و لحاظ سے کھل کر آنا جانا پسند نہیں کیا، نواب سے کہا کہ میں فقیر آدمی ہوں مجھے گھر پر پڑا رہنے دیجیے، انھوں نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر سو روپیے گھر بیٹھے کر دیے، جب کوئی نیا مضمون پیش آتا اُن کو لکھا بھیجتے، یہ اپنی شاعری کے زور سے اسکو موزوں کر دیتے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۸) ایکمرتبہ سوار ہوئے گھوڑا تیزی کرنے لگا، دوشالہ سنبھل نہ سکا، چھوٹے خاں چابک سوار کھڑا تھا، اتار کر اس کی طرف پھینکا، اُس نے توشہ خانہ میں داخل کر دیا، دوسرے دن وہی دوشالہ سامنے آیا تو فرمایا کہ میں نے اسے دیا تھا یا رکھنے کو کہا تھا،

نواب سعادت علیخاں نے خونِ جگر کھا کر سترہ کرور روپیہ جمع کیا تھا، اس میں سے ایک کرور روپیہ سرکار انگریزی کو بطور قرض موبد کے دلوا دیا، اور اس کے پانچ فیصدی منافع سے صاحبات محل کی تنخواہوں کا وثیقہ کرایا گیا، بیگمات کے سلسلہ میں بیس ہزار ماہوار نواب کے، دو ہزار انکی بیوی کے، دو ہزار بڑے بیٹے کے، ایکہزار بیٹی کے مقرر ہو گئے اور گورنمنٹ انگریزی اس بات کی کفیل ہوئی کہ ان کی ہمیشہ حمایت کریگی اور ان کی جائداد ضرورت کے وقت اپنی حفاظت میں لیلیگی، بہرحال بادشاہ مذکور کے عہد دولت میں انھوں نے عیش و عشرت سے بسر کی اور بیدریغ روپیہ صرف کیا،

بادشاہ کے مرنے پر نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے انھوں نے انکو معزول و نظر بند کیا، چند روز کے بعد بحمایت سرکار انگریزی دو کرور روپیہ کا نقد و جنس لیکر کانپور چلے گئے، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۰ پر)

بادشاہ بادۂ غفلت سے سرشار تھے، نواب نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے، مرزا کو جلاوطن کیا، بادشاہ بیگم کی جائداد ضبط کرا دی، مرزا نصیر الدین حیدر کا دربار بند کیا، اور یہ فکر ہوئی کہ محسن الدولہ کو اپنے قابو میں کر لیں،

نواب محسن الدولہ بادشاہ کے نواسے اور بادشاہ بیگم کے چہیتے تھے، ماں کے مرنے کے بعد بادشاہ بیگم نے پرورش کیا تھا، اور ایک دم کو بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں، مرزا انور علی شہزادے کے آخون شیخ صاحب کے دوست تھے، انکو ہموار کر لیا اتفاق سے میر فضل علی (جو آگے چل کر اعتماد الدولہ ہو گئے) بادشاہ بیگم کی سرکار میں داروغہ تھے، انکی جز رسی اور کفایت شعاری کے نواب محسن الدولہ اکثر شاکی رہا کرتے تھے، آخون صاحب کے اس سے بہتر اور کیا موقع مل سکتا تھا، اب جب وہ شکایت کرتے یہ کہتے کہ نانا جان سے عرض کر دو، ادھر معتمد الدولہ بادشاہ بیگم کی بے التفاتی کا ذکر کرتے رہتے تھے، مگر بادشاہ کو یقین نہ آتا تھا، جب محسن الدولہ کو سکھا پڑھا کر تیار کر لیا تو ایک دن ان سے کہلایا کہ مجھکو محل میں تکلیف ہوتی ہے میں حضور کے قدموں تلے رہنا چاہتا ہوں، اب بادشاہ کو یقین آگیا، نواب کو حکم دیا کہ انتظام کرو، یہاں کیا دیر تھی، بیلی گارد کے قریب بیگم والی کوٹھی آراستہ کر دی، سواری اور تمام لوازم امارت خاطر خواہ درست کر دیے، آخون صاحب داروغہ مقرر ہوئے، شیخ صاحب کے وہ دوست تھے، پھر کیا پوچھنا، مشہور تو یہ ہے کہ محسن الدولہ کی بدولت وہ ہمیشہ کیلئے فارغ البال ہو گئے اور معتمد الدولہ کے دل میں انکی گنجائش بڑھ گئی،

پھر تو ان کی شاعری نے خوب زور پکڑا، اور ان کے گھر میں لوگوں کا مجمع بڑھنے لگا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۹) وہاں کوٹھیاں خرید کر کے ایک نیا شہر آباد کیا، جب تک جیتے رہے پچاس ہزار روپیہ ماہوار کا صرف رہا، ان کے مرنے پر اولاد و ذریت کی بدولت امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہی ہے،

خواہ یہ سمجھو کہ شعر و سخن کے قدردان کھنچ کھنچ کر آنے لگے، یا اسی پردے میں نواب معتمد الدولہ کی نظرِ عنایت کے خواہشمندوں کا جمگھٹا ہونے لگا، بہرحال پہلے مرزا حاجی پھر نواب معتمد الدولہ کی بدولت ان کی شاعری کا ہنگامہ خوب گرم ہوا، اور لکھنؤ میں ان کی استادی کے ڈنکے بجنے لگے،

مگر افسوس ہے کہ اتنے جوڑ توڑ کی بدولت اُن کو چین سے گھر میں رہنا نصیب نہیں ہوا حکیم مہدی[1] ایک فرزانہ و مدبر اہل کار اُس زمانہ میں تھے، معتمدولہ نے ان کو اپنا حریف سمجھ کر

---

[1] حکیم مہدی منتظم الدولہ نواب مہدی علیخاں کشمیر کے رہنے والے بڑے مدبر اور زبردست شخصیت کے آدمی تھے فضل و کمال کے ساتھ خدا نے عقل دوراندیش ان کو عطا کی تھی، ابوالفضل اور سعد اللہ خاں کی ٹکر کے آدمی تھے خان علامہ تو نرے ملا تھے، باوجودیکہ خوش قسمتی سے وزارت تک پہنچے، مگر کوئی کام بن نہیں پڑا، انھوں نے ایسے ایسے کارنمایاں کئے، جن کی یادگار اب تک محو نہیں ہوئی،

ابتدا میں طبابت کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، رفتہ رفتہ نواب سعادت علیخاں کے دربار میں ان کا رسوخ بڑھا، اور کارگذاری کے جوہر کھلنے لگے اور اول درجہ کے اہلکار بن کر انھوں نے بڑے بڑے کام کئے جب نواب کے بعد غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے، اور اپنے معتمد خاص آغا میر کو نائب مقرر کیا، انھوں نے دیکھا کہ یہ جلتے ہوئے آدمی ہیں، کسی نہ کسی طرح مجھے اکھیڑ پھینکیں گے، یہ سوچ کر، ان کو محمدی اور خیرآباد کی نظامت پر ہٹا دیا، مطلب تھا کہ نواب وزیر سے دور بھی رہیں گے اور سرکاری مطالبہ کی علت میں انکو زیر بھی کیا جاسکے گا،

انھوں نے علاقہ کا اتنا عمدہ انتظام کیا کہ سرکاری مطالبہ سے بہت زیادہ وصول ہونے لگا، اور لطف یہ کہ رعایا بھی سب راضی و خوش، اتفاق سے نواب گورنر جنرل نیپال جاتے ہوئے اُدھر سے گذرے، انھوں نے رسد رسانی کا اتنا عمدہ انتظام کیا کہ نواب گورنر جنرل نے انکی حسن گذاری کی نسبت نواب وزیر کے طرف اپنی خوشنودی لکھ بھیجی، نواب معتمد الدولہ کو اب اور بھی ان کی فکر ہو گئی، وہ ہمہ تن انکے استیصال (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

نکلوا دیا، شیخ صاحب نے معتمد الدولہ کی رضا جوئی کے لئے غزل لکھی جس کا ایک مصرع ہے، ع

کاشو برائے پختن شلجم گریختہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٥١) کے درپے ہو گئے، یہ بھی بے خبر نہ تھے قبل اس کے کہ انکو گرفتار کیا جائے اپنا مال و اسباب شاہجہانپور بھیجکر خود بھی نکل گئے، چند روز شاہجہانپور میں رہے، اس کے بعد فرخ آباد چلے گئے، اور وہاں کوٹھیاں بنگلے خرید کر کے عیش و آرام کرنے لگے،

شاہجہانپور میں گرہ ندی کا پل، شہر اور قلعہ کے درمیان میں انھی کا بنوایا ہوا ہے، فرخ آباد میں ایک عالیشان کارواں سرا بنوائی اور لکھنؤ سے فرخ آباد تک راستہ میں جہاں جہاں ضرورت تھی سرائیں مسجدیں اور پل بنوا دیئے، جس سے بہت عرصہ تک نیک نامی کے ساتھ لوگ ان کو یاد کرتے رہے،

نصیر الدین حیدر جب بادشاہ ہوئے تو انھوں نے معتمد الدولہ کو معزول کر کے اعتماد الدولہ کو قلمدان وزارت تفویض کیا، کچھ دنوں کے بعد ان سے بگڑے تو منتظم الدولہ یاد آئے، ان کو بلا کر وزیر مقرر کیا، کم و بیش ڈھائی سال انھوں نے وزارت کی، اس تھوڑے سے زمانہ میں ملکی و مالی انتظام اتنا چست کر دیا کہ جو بدنظمیاں معتمد الدولہ کے زمانہ وزارت میں چلی آ رہی تھیں وہ سب دور ہو گئیں، گومتی پر لوہے کا پل بنوایا جو ابتک موجود ہے، ایک انگریزی شفاخانہ بنوایا، ایک یونانی دار الشفاء تیار کیا، ایک بیلغور خانہ جس میں اندھے لولے لنگڑے اور محتاج زن و مرد رہا کریں، ان تینوں کیلئے جدا جدا عمارتیں تعمیر کرائیں، بیش قرار تنخواہوں پر ڈاکٹر اور حکیم نوکر رکھے، اور رزیڈنٹ لکھنؤ کی وساطت سے ان کے مصارف کیلئے نوٹ خرید لئے، جس کی بدولت یہ تینوں چیزیں لکھنؤ میں ابتک موجود ہیں، یونانی دار الشفا چوک میں، انگریزی شفاخانہ وکٹوریہ گنج میں عام لوگوں کی حاجت روائی کر رہے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٥٣ پر)

محمد خاں قوال نے اس غزل کو نواب کے سامنے گایا تو اسکو ایکہزار روپیہ انعام ملا، شیخ صاحب کو جو کچھ دیا ہو اس کا حال خدا کو معلوم ہے، اس ایک دینے پر کیا ہے، نواب ان کے شاگرد ہو گئے تھے، عمر بھر سلوک کرتے رہے، اور ان کی بدولت انھوں نے امیرانہ زندگی بسر کی،

مگر خدا کی قدرت دیکھو نصیر الدین حیدر نے تخت نشین ہوتے ہی معتمد الدولہ کو معزول کردیا، پہلے میر فضل علی کو اعتماد الدولہ کا خطاب دیکر وزیر بنا لیا، جب اُن سے کام نہ چلا تو حکیم مہدی بلائے گئے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۲) ایک مدرسہ سلطانیہ قائم کیا، جسمیں ہزار ہا لڑکے داخل کئے گئے، ہر بیس لڑکے پر ایک مدرس مقرر ہوا، اور طلبہ کے لئے فی کس پانچ روپیہ ماہوار کے حساب سے وظائف جاری ہوئے، یہ مدرسہ نواب سعادت علیخاں کے مقبرے کے چاروں سمت والے ایوانوں میں قائم کیا گیا تھا، جس کا اب نشان بھی نہیں ہے،

ایک مدرسہ اپنے روپیہ سے خاص کتامرد کے لئے قائم کیا جس سے منتظم الدولہ کو خاص طور پر دلچسپی تھی، ہر ہفتہ بچوں کا خود امتحان لیتے اور اپنے ہاں مدعو کرکے طرح طرح کے کھانے اور لذیذ میوے کھلاتے تھے، ایک چھاپہ خانہ لیتھوگرافی کا قائم کیا زیر اہتمام مسٹر آرچر کے جن کی تنخواہ پانسو ماہوار تھی، ایک اسکول انگریزی تعلیم کے لئے قائم کیا، اور سب سے زیادہ حوصلہ مندی کا کام رصد خانہ سلطانی کا اجرا تھا جو کپتان ہربٹ کے اہتمام سے قائم کیا گیا، اور عالیشان عمارتیں اُس کے واسطے تعمیر کرائی گئیں، مولوی اسمٰعیل شہید وغیرہ علما اُس میں بطور طالب علم داخل ہوئے،

افسوس ہے کہ منتظم الدولہ کو کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، بادشاہ عیش پرستی کے ساتھ آتش مزاج بھی تھا، اِن میں متانت و سنجیدگی، نواب سعادت علی خاں کی آنکھیں دیکھے ہوئے، زیادہ دنوں تک نبھ نہ سکی، سنہ ۱۲۴۸ھ میں معزول ہو کر پھر فرخ آباد چلے گئے،

عرصہ کے بعد محمد علی شاہ کے زمانے میں پھر بلائے گئے، وہ ان کی کارگذاری سے ذاتی واقفیت رکھتے

حکیم مہدی کو شیخ صاحب یاد آئے، چوبدار بلانے آیا، انھوں نے اس کو کچھ دے دلا کر راضی کیا کہ انکو درباری لباس پہننے کی مہلت دے، ادھر یہ پگڑی کے پیچ درست کرنے کے بہانے موقع ڈھونڈھنے لگے، ادھر چوبدار شربت پانی کی فکر میں لگا، شیخ صاحب موقع پاکر نکل کھڑے ہوئے اور فقیر محمد خاں گویا کے ہاں چھپ کر پہونچے، خاں صاحب نے منشی گنج بہاری کے میانے میں پردہ ڈال کر زنانی سواری کی طرح کول ہاران کو بھیجدیا، وہاں سے کانپور ہوتے ہوئے الہ آباد پہونچے، اور شاہ ابو المعالی کے ہاں دائرہ شاہ اجمل میں مہمان ہوئے، وہاں رہتے رہتے گھبرائے تو کانپور چلے آئے، اسی سلسلہ میں بنارس اور عظیم آباد کی بھی سیر کی،

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو خیریت سے گھر آئے، مگر پھر تاریخ بھی کہی اور انصاف یہ ہے کہ خوب کہی،

افتاد حکیم از وزارت   تاریخ بطرز نو رقم کن
از جاے حکیم ہشت برگیر   سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

چند دنوں کے بعد حکیم مہدی کا ستارۂ اقبال پھر چمکا، محمد علی شاہ نے قلمدانِ وزارت سپرد کیا، شیخ صاحب پھر بھاگے، اور الہ آباد پہنچے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ بار بار الہ آباد جانے سے گھبرا گئے تھے، اس گھبراہٹ کو بہت لطیف انداز سے ظاہر کیا ہے،

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں قدم   آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

مگر تھے خوش قسمت کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد حکیم مہدی کی وفات پر سنہ ۱۲۵۳ھ میں ان کی دوادو

تھے، کیونکہ نواب سعادت علیخاں کے وقت میں دونوں اہلکار تھے، اس زمانہ میں ان کو کام کرنے کا بہترین موقع حاصل تھا، مگر افسوس ہے کہ موت نے مہلت نہ دی، نو مہینے کے بعد آخر ماہ رمضان سنہ ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی، امین آباد سے شاہ مینا کو جاتے ہوئے ان کا مقبرہ داہنے ہاتھ کو پڑتا ہے،

کا خاتمہ ہو گیا، اور اب کی دفعہ جو آئے تو مر کر بھی گھر سے نہ نکلے،

محمد علی شاہ نے سو روپیہ ماہوار گھر پر مقرر کر دیئے اور ہر سال قطعہ سالِ جلوس پر خلعت بھی عنایت ہوتا تھا، امجد علی شاہ مذہبی آدمی تھے، آنہ پائی کا حساب کر کے سال بسال اپنے مال و دولت کی زکوٰۃ نکالتے تھے، اور جہاں تک ان سے ہو سکتا علما و مجتہدین کی خدمت کرتے تھے شاعروں کو دینا شاید گناہ سمجھتے ہوں، انھوں نے ان کی تنخواہ بند کر دی، مگر شیخ صاحب ایسے صاحبِ سلیقہ تھے کہ جس قدر نواب محسن الدولہ کی سرکار سے یا معتمد الدولہ آغا میر کی مہربانی سے کمایا تھا، اُسے بیجا صرف نہیں کیا، تمام عمر فراغت سے زندگی بسر کی،

آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا، مگر قیصر التواریخ میں سید محمد میرزا زائر نے لکھا ہے کہ بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی، حکیم زین العابدین ان کا بیٹا مرزا محمد علی کا شاگرد طبابت کرتا، اور خوش چلنی سے زندگی بسر کرتا ہے، بہر حال ناسخ نے سنہ ١٢٥٤ھ میں وفات پائی، اور ٹکسال والے مکان میں مدفون ہوئے، میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی،

دلا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے

دو دیوان ان کے چھپ گئے ہیں، پہلے دیوان میں ان کا خاص انداز نہایت نمایاں ہے دوسرا دیوان الہ آباد کی کمائی ہے جس میں بے وطنی اور پریشانی کی جھلک ہر جگہ نظر آتی ہے. اسی وجہ سے اس کا نام بھی دفتر پریشان تجویز کیا تھا،

ان دیوانوں میں غزلوں، رباعیوں، قطعوں اور تاریخ کے سوا اور کسی قسم کی نظم نہیں طبیعت قصیدوں سے بہت مناسب تھی، مگر خدا جانے اس کا شوق کیوں نہیں تھا' شاہانِ اودھ کی تاریخ و تہنیت میں کبھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی ہے تو غزلوں اور قطعوں میں اس فرض کو ادا کر دیا ہے،

ایک مثنوی حدیث مفضل کے ترجمہ میں ہے، اور ایک مولود شریف ہے، یہ دونوں نظمیں ان کے منہ پر نہیں کھلتیں، غزلوں میں بقول آزاد شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے، اور تاثیر کم، صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دیکر ایسی دستکاری اور میناکاری کی ہے کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے ہیں،

بات یہ ہے کہ ناسخ کی قوتِ تخیل نہایت زبردست ہے، ایک چیز کو وہ سو سو دفعہ دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ کے دیکھنے میں انکو ایک نیا عالم نظر آتا ہے، پھر وہ کلام کی بنیاد اس پر قائم کرکے تمثیل اور مبالغہ سے اس میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس قوت کے استعمال کرنے میں اکثر اعتدال سے گذر جاتے ہیں،

کہیں پر مبالغہ اصلیت اور واقعیت سے اتنا دور جا پڑتا ہے کہ ان کی بلند پروازی کے سامنے آفتاب تارہ بن کر رہ جاتا ہے، کہیں پر تمام عمارت کی بنیاد صرف کسی لفظی تناسب یا ایہام پر ہوتی ہے، کہیں فرضی تشبیہوں اور استعاروں پر شعر کی بنیاد قائم کرتے ہیں جو لطیف اور قریب الماخذ نہیں ہوتے، کہیں پر کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دیکر اس کے تمام لوازم اور اوصاف اس میں ثابت کرتے ہیں حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت نہیں ہوتی،

یہ ان کا انداز بیان ہے جس کا نام نازک خیالی یا خیال بندی رکھا گیا ہے، اور اسی نے متاخرین کی شاعری کو تباہ کرکے چھوڑا، یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کرکے اس کو جنتِ ابنِ خیال بنا دیتے ہیں، اور افسوس ہے کہ یہی ان کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے،

پہلے ناسخ کی ایک پوری غزل میں نقل کرتا ہوں تاکہ ان کا مخصوص انداز اس سے معلوم ہو، اس کے بعد غزلوں کے منتخب اشعار پیش کیے جائیں گے،

روے جاناں کا تصور میں جو نظارہ ہوا   دل میں تھا جو داغ حسرت عرش کا تارہ ہوا

وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا
اے منجّم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا
سر پہ ہر محبوب کے خط، مانگ کا آرا ہوا

محفلِ مے میں جو آیا تو برائے مے کشی
تھا جو شیشہ، جوشِ مے سے ایک فوارا ہوا

گرم ہے کیا عکس تیرے شیشۂ آتشناک کا
آئینہ کی پشت کا معدوم سب پارا ہوا

رات غائب ہو گئی، حاضر ہوئے آثارِ صبح
وصل میں خورشید گویا شام کا تارا ہوا

چشمِ بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف
سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا

ابر کو نسبت بھلا کیا چشمِ دریا بار سے
ایک دم روئے کنارہ پر جو ہم، دھارا ہوا

شب ہوا سے ہل گئی جو اُسکی زلفِ عنبریں
دم میں موم شمع سارا عنبرِ سارا ہوا

کس قدر ہے تیز ظالم آتشِ رنگِ حنا
سنگِ پا لگتے ہی بس تلوؤں سے انگارا ہوا

قد ترا سرو، آنکھیں نرگس، زلف سنبل، رخ ہے گل
کون ہے یکشتِ گل میں جو چمن آرا ہوا

جوشِ وحشت تیری آنکھوں پر یہ خوش چشموں کو ہے
مثلِ آہو دشت میں ہر ایک آوارا ہوا

ہو گئی ہے شمع تیرے سامنے خجلت سے آب
شمعداں گویا تری محفل میں فوارا ہوا

چین سے سویا نہ دنیا میں کبھی جز خوابِ مرگ
بعد مرنے کے جنازہ مجکو گہوارا ہوا

زاہدا ہم جانتے ہیں عشقبازی ہی گناہ
گھر لٹایا ہے جو وحشت میں وہ کفّارا ہوا

ہو رہا ہے بت پرستی کا یہ دنیا میں عذاب
مجکو ہر داغِ جنوں دوزخ کا انگارا ہوا

بیٹھے پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا
پیٹھ پر بارِ گنہ کا جمع پشتارا ہوا

دور پھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں
ہاتھ میں جامِ مے گلرنگ انگارا ہوا

ہجرِ ساقی میں نہیں اے میکشو آوازِ رعد
فوجِ غم میں بہرِ خونریزی یہ نقارا ہوا

جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا
حوض میں روشن برنگِ شمع فوارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

غزل کے منتخب اشعار

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کیا آواز کا
تیر جو آواز دے ہے نقص تیر انداز کا

پاؤں بھی اب اے جنوں کر دیجیے کانٹوں کے نذر
سر تو مدت سے نیاز سنگ طفلاں ہو گیا

محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھکر
قاصد خیال آئیگا خط کے جواب کا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خار کا

نہ وحشت محتسب کی ہے نہ منت مے فروشوں کی
نہاں ہے نشہ آنکھوں میں شراب شیشۂ دل کا

ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں
ملی ہے عقل لیکن بخت ہے برگشتہ عاقل کا

بس میں ہوتا نہ پرائے کے کبھی اے ناسخ
آہ میرا مرے قابو میں اگر دل ہوتا

خواب میں میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں
سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں رہ گیا

رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں
گل کو گلچیں کا خطر، بلبل کو غم صیاد کا

تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا

میکدہ تک محتسب کو میکشو آنے تو دو
دیکھ کر پیمانہ کو پیماں شکن ہو جائیگا

او محتسب سمجھ کے تو شیشہ کو توڑیو
دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا

تھی شہادت سے غرض سو اس ادا میں ہو گئی
گو نہ قاتل سے نزاکت کے سبب، خنجر اٹھا،

تجھ سے انصاف تو کر چھٹ نہ سکا ایک رقیب
میں نے کیونکر تری الفت میں زمانا چھوڑا

جام مے لبریز ہیں ساقی فقط مطرب نہیں
گل کھلے ہیں باغ میں خالی ہے جائے عندلیب

ہے یہاں کس کو شبِ فرقت میں ہوش
ہو چکی ہو گی ہزاروں بار صبح

کیا روزِ بد میں ساتھ ہے کوئی ہمنشیں
پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

اے میکشو نزاکتِ ساقی کو دیکھنا   لاتا ہے رکھ کے مثلِ سبو جام دوش پر

مر گیا کیا ناسخ میکش جو سارے مے فروش   مسجدوں میں بیٹھے اپنی اپنی دوکان چھوڑ کر

ناز حوروں کے اُٹھائیں یہ کہاں اپنا دماغ   ہو ہمارا اور فردوس سے بستر باہر
اے اجل تونے غضب تفرقہ پردازی کی   قبر میں تو سرِ شوریدہ پتھر باہر

کافی ہے سر پہ داغِ جنوں دل میں نام یار   بیزار ہوں فلک ترے تاج و نگیں سے میں

دم اخیر تو کر لوں نظارہ جی بھر کر   الٰہی خنجرِ سفاک آبدار نہ ہو

میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار   اے ناصحو بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھکو

معشوقوں سے امید وفا رکھتے ہو ناسخ   نادان کوئی دنیا میں نہیں تم سے زیادہ

ہر کسی کا کام رکھتا ہے ادھورا آسماں   گر بہم پہونچا سرِ شوریدہ تو پتھر نہیں

تاب سننے کی نہیں بہرِ خدا خاموش ہو   ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

داغ فرقت زیست بھر، سوزِ جہنم بعد مرگ ان بتوں کو کس توقع پر خدایا چاہیے،

فرقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

شوقِ مے نے کر دیا اس درجہ مجکو بدحواس محتسب سے راہ پوچھی خانۂ خمار کی

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

کیا برستی ہے بجائے ابرِ رحمت بےکسی ہے یہی تربت مقرر ناسخ مغفور کی

خواجہ حیدر علی آتشؔ

آتش تخلص، خواجہ حیدر علی نام تھا، آبا و اجداد دلی کے رہنے والے تھے، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش دلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی،

آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے، باپ کی طرح گورے چٹے، اور خوبصورت تھے، ابھی اچھی طرح جوان نہ ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی خوب نہ ہوئی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، کسی مربی کے موجود نہ ہونے سے فوج کے لڑکوں کی صحبت میں بانکے اور شورہ پشت ہو گئے،

اُس زمانہ میں بانکپن اور بہادری کی قدر تھی، نواب محمد تقی[1] ان کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے، یہاں آکر دیکھا تو ان کو دوسری دنیا نظر آئی، جرأت کی شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، انشا اور مصحفی کا اکھاڑہ جما ہوا تھا واہ واہ کے نعرے زمین سے آسمان تک جاتے تھے، ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا مصحفی کے شاگرد ہوئے، اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہونچائی کہ یہ خود صاحبِ طرز ہو گئے،

استعداد علمی خام تھی، مگر رواج زمانہ، بزرگوں کی صحبت اور مصحفی جیسے استاد کی شاگردی نے شاعری کی ضرورتوں سے ان کو اچھی طرح واقف کر دیا تھا، کلام کو مشق کے زور سے قوت دیتے رہے، اصناف سخن میں غزل کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، زبان کی تراش خراش

---

[1] اسد الدولہ نواب محمد تقی خاں بہادر ترقی تخلص، آغا سید محمد امین نیشاپوری کے خلف الرشید، فیض آباد میں بود و باش تھی اور نواب بہو بیگم کی سرکار سے توسل رکھتے تھے، بڑے وضعدار، علم دوست اور پرہیزگار تھے لکھنؤ دار الامان ہوا تو لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے، بہو بیگم کے انتقال کے بعد غازی الدین حیدر کے عہد میں مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی، میر سوز کے شاگرد تھے اور شعر اچھا کہتے تھے، ان کا خاندان شرافت اور وضعداری میں ہمیشہ نیک نام رہا ہے، لکھنؤ کی زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا مگر ان لوگوں کی وضعداری نہیں بدلی، مرزا حیدر اور ان کے دو بیٹے مرزا عالیجاہ اور مرزا والا جاہ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ فضل و کمال، شرافت و پرہیزگاری میں یہ دونوں بھائی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، یہ سب شاعر تھے، مگر یہاں صرف نواب محمد تقی کے دو شعر نقل کرتا ہوں،

ساکنانِ کعبہ نے کی بت پرستی اختیار
وہ صنم نام خدا کیا ان دنوں جوبن پہ ہے

در و دیوار سے آتا ہے نظر جلوۂ دوست
آئینہ خانہ مرا گوشۂ تنہائی ہے

صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ اپنے زمانہ کے استاد مسلّم الثبوت ہو گئے،

پچاس یا اسّی روپیہ مہینہ بادشاہ کے ہاں سے ملتا تھا، شاگردوں یا امیروں میں سے کوئی سلوک کرتا، تو اس سے بھی انکار نہیں تھا، باپ دادا سے توکل ترکہ میں پایا تھا، اور ہوش سنبھالتے ہی بانکپن اور شورہ پشتی کی تعلیم ملی تھی، یہ دونوں انداز بڑھاپے تک قائم رہے،

گیروا تہ بند باندھتے تھے، ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا، سچے کام کا سلیم شاہی جوتا پاؤں میں، ڈنڈے میں ایک چھلّہ سونے کا لگا رہتا دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھلّہ رہن رکھکر فاقہ شکنی کرتے، بھنگ پینے کا چسکا زندگی بھر رہا،

لکھنؤ میں نوازگنج کے قریب چوبیتوں سے آگے مادھو لال کی چڑھائی مشہور ہے، وہاں اتار کو ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچا سا مکان تھا، اُس کو آتش نے خرید لیا تھا، اسی میں رہتے تھے، شادی بھی کرلی تھی، ایک بیٹا تھا محمد علی نام، جوش تخلص، بڑھاپے میں وہی عصائے پیری تھا، بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی،

اخیر زمانے میں معالی خاں کی سرائے میں اُٹھ آئے تھے، داڑھی بھی بڑھالی تھی، اس پر مہندی کا خضاب، مگر وضعداری کی دوسری باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی رندانہ مزاج، وہی فقر و فاقہ، ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے، سامنے بچ بچا حقّہ لگا رہتا، کوئی امیر غریب آتا اُس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش کیا جاتا،

سنہ ۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے، یکایک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے، میر ولد حسین فوق نے تاریخ لکھی، ع

لکھنؤ میں نام آتش کر گئے

تمام عمر کی کمائی ایک دیوان غزلوں کا ہے، جو ان کے سامنے رائج ہو گیا تھا، دوسرا

تتمہ ہے کہ پیچھے مرتب ہوا، وہ بھی حجم میں خاصا ہے، شاگردوں میں میر دوست علی خلیل، صاحب مرزا آشنا ور، میر وزیر علی صبا، نواب محمد علی خاں رشید، نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم زیادہ نام بر آوردہ ہوئے،

زبان کی صحت و صفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ کے دوش بدوش چلتے ہیں، مگر نازک خیالی اور بلند پروازی میں ان کا حریف ان سے بہت زیادہ اونچا جاتا ہے، اور سوز و گداز میں یہ ان سے آگے ہیں، مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبد الغفور کے نام ہے کسی تقریب سے یہ قطعہ نقل کیا ہے، ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ز یک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس چیزے دگر کی مثال میں میر تقی میر، مرزا سودا، قائم اور مومن کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ ناسخ کے ہاں کمتر، آتش کے ہاں بیشتر یہ تیر نشتر ہیں، میں ان کی بھی ایک پوری غزل نقل کرتا ہوں، اس کے بعد منتخب اشعار پیش کرونگا،

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا خدا کی یاد بھولا شیخ، بت سے برہمن بگڑا
قبائے گل کو پھاڑا جب مرا گل پیرہن بگڑا بن آئی کچھ نہ غنچہ سے جو وہ غنچہ دہن بگڑا
نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخمِ شہیداں کا تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا
تکلف کیا جو کھوئے جانِ شیریں پھوڑ کر سر کو جو غیرت تھی تو پھر خسرو سے ہوتا کوہکن بگڑا
کسی چشمِ سیہ کا جب ہوا ثابت میں دیوانہ تو مجھ سے مست ہاتھی کی طرح جنگل کا ہرن بگڑا

اثر اکسیر کا میں نے قدم سے تیرے پایا ہے
جذامی خاکِ رہ مل کر بناتے ہیں بدن بگڑا
تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اسکا چلن بگڑا
زوالِ حسن کھلواتا ہے میوے کی قسم مجھ سے
لگایا داغ خط نے آن کر سیبِ ذقن بگڑا
رخِ سادہ نہیں اس شوخ کا نقشِ عداوت ہے
نظر آتے ہی آپس میں ہر اہلِ انجمن بگڑا
وہ بدخو طفلِ اشک اے چشمِ تر ہیں دیکھنا کدن
گھروندے کی طرح سے گنبدِ چرخِ کہن بگڑا
صفتِ مژگاں کی جنبش کا کیا اقبال نے کشتہ
شہیدوں کے ہوئے سالار ہم جب سے تمن بگڑا
کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اسکا دہن بگڑا
کمالِ دوستی اندیشۂ دشمن نہیں رکھتا
کسی بھونرے سے کس دن کوئی مارِ یاسمن بگڑا
رہی نفرت ہمیشہ داغِ عریانی کو جامے سے
ہوا جب قطع جامہ پر ہمارے پیرہن بگڑا
رگڑوائیں یہ مجھ سے ایڑیاں غربت میں وحشت نے
ہوا مسدود رستہ جادۂ راہِ وطن بگڑا
کہا بلبل نے جب توڑا گلِ سوسن کو گلچیں نے
الٰہی خیر کیجو نیل رخسارِ چمن بگڑا
اللہ رہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کچھ
وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا
جہاں خالی نہیں رہتا کبھی ایذا دہندوں سے
ہوا ناسور نو پیدا اگر زخمِ کہن بگڑا
تونگر تھا بنی تھی جب تک اس محبوبِ عالم سے
میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیم تن بگڑا
لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانے کو وہ پیماں شکن بگڑا

آتش نے مسلسل غزل بھی لکھی ہے، جس میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے، بلکہ ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہی، ایسی غزلوں کے لکھنے میں

بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں، مثلاً ہر اک موسم کی کیفیت صبح و شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، سفر کی روداد، وطن کی دل بستگی، اور اسی قسم کی بہت سی باتیں جو وہ ایک شعر میں نہیں سما سکتیں، اس غزل کو بھی نمونہ کے لئے نقل کرتا ہوں،

غزل مسلسل

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا — بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی — سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی — زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکالے تھے دو چاند اُس نے مقابل — وہ شب صبح جنت کا جس پہ گماں تھا
عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل — فرحناک تھی روح، دل شادماں تھا
حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی — نہاں جسکو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

منتخب اشعار

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا — جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا — ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر — دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

بلند و پست بسکہ روح کو برابر ہے
نسیم بے سر و پا کا کہاں مقام نہیں

برباد ہو رہے ہو کچھ آتش تمھیں نہیں
مٹی خراب اپنی بھی ہے اس دیار میں

یہ سعادت لکھی ہے قسمت میں کس کے دیکھیے
خونِ گرفتہ ایک میں ہوں اور خنجر سیکڑوں

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جس کے مقدر میں
مے الفت نہ خُم میں ہے، نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

مستِ شرابِ عشق کب آتے ہیں ہوش میں
یہ نشہ وہ نہیں ہے کہ جس میں خمار ہو

پر کترتے ہیں مرے صیاد تو کاٹ اس طرح
حسرتِ پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

باغ میں آئے ہو ساتھ ان کے بھی پھر لو دو گام
کبک و طاؤس کا جھگڑا ہے چکاتے نہ چلو

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے
زمیں سے دب گئے دبنے جو آسماں سے نہ تھے

افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی　　سر توڑ کے مر جائے اس کوہکنی سے

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال　　کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے

لگی ہے دیر بہت نامہ بر کے آنے میں　　وہ خود ہی آتے ہیں قاصد جواب کے بدلے

نقشِ پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی　　دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیئے

ان سے کہدو نہیں آہستہ جو رکھتے دوگام　　گر ہی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے　　خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے　　ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ　　قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا　　دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ مڑ کر بھی بیدرد قاتل نے دیکھا　　تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

تمھارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں گل و لالۂ و ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

خواجہ محمد وزیر وزیرؔ

محمد وزیر نام، وزیرؔ تخلص، خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے، لکھنؤ وطن تھا، آبائی سلسلہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، اور ننھیالی قرابت مرزاؤں کے ایک نامی گرامی خاندان سے تھی،

مرزا سیف اللہ بیگ نانا تھے جو نواب امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ خاں کے حقیقی بھائی تھے، غرض دادھیال و نانہال دونوں طرف سے عالیخاندان تھے،

فارسی کی پوری اور عربی کی کچھ کچھ درسی کتابیں علمائے لکھنؤ سے پڑھیں، عروض و قافیہ میں بہت اچھی مہارت تھی، گوشہ نشینی اور توکل باپ دادا سے ترکہ میں ملا تھا، ساری عمر کسی کی نوکری نہیں کی،

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا، شیخ امام بخش ناسخؔ سے مشق سخن کی، اور انہی کی زندگی میں استاد مسلّم الثبوت ہو گئے، شیخ صاحب کو ان پر فخر تھا، اور بجا طور پر فخر تھا، اکثر اپنے شاگردوں کو اصلاح سخن کیلئے ان کے سپرد کر دیتے تھے، اور ہر طریقہ سے انکی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے،

ان کو آخر میں شعر و سخن سے نفرت سی ہو گئی تھی، فتوح و تسخیر اعمال کا شوق رہ گیا تھا، ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے، سو روپیہ ماہوار سے کم خرچ نہیں تھا، مگر آمدنی کہیں سے نہ تھی، واجد علی شاہ بادشاہ نے دو بار یاد فرمایا، مگر علالت کا عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں، اسی وجہ سے لوگ انکی آمدنی کو دست غیب پر محمول کرتے تھے

سنہ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی، مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خاں قبول نے تاریخ کہی ع

وزیر بادشہ شاعرانِ نامی بود۔

منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے کہا ع

مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا

ان کی زندگی میں ابتدائی کلام کا جو مجموعہ مرتب ہوا تھا، وہ تلف ہوگیا، دوبارہ اسکے جمع کرنے کا خیال نہیں کیا، عبد الواحد خاں مالک مطبع مصطفائی کو اس کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے کچھ سادی کتابیں ان کو لا کر دیں اور ان کے دوستوں اور شاگردوں کو متوجہ کیا، اس طریقہ سے پھر دوبارہ ایک دیوان مرتب ہوا، جو ان کے مرنے کے بعد سنہ ۱۲۷۱ھ میں چھاپا گیا،

رنگ ان کا وہی ہے جو ان کے استاد کا ہے مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت، بیان کی متانت اور زبان کی صحت، غرضکہ پختگی کلام کے تمام لوازم اس میں موجود ہیں، لیکن غزل کی جان یعنی تاثیر کے نہ ہونے سے ان کے کلام کی حیثیت ایک حسین مگر جسد بے روح سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی،

ان کے تمام دیوان کو اول سے آخر تک پڑھو اس میں دس شعر بھی ایسے نہ ملیں گے جن سے اہلِ دل کے قلوب کو سرور اور اربابِ نظر کی آنکھوں کو نور حاصل ہو،

مگر اس میں شک نہیں کہ جو ان کا رنگ ہے اُس میں ناسخ و آتش کے بعد انکے معاصرین میں سے کوئی انکا مثل نہیں، نمونہ کیلئے ایک غزل نقل کرتا ہوں اسکے بعد انتخابی اشعار لکھونگا،

عوض مطلع کے کھنچوائیں گے نقشہ روئے جاناں کا بنے تا مطلعِ خورشید مطلع اپنے دیواں کا
نہیں ابرو و خط میں جلوہ حسن روئے جاناں کا عیاں ہے تخت پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں کا
حنائی ہاتھ کی تاثیر طرفہ رنگ لائی ہے شجر تیرے نگیں کا بن گیا ہے نخل مرجاں کا

گلے سے حرف باتوں کے نظر آتے ہیں حیرت ہی　　عیاں جوہر ہیں رشکِ آئینہ ہی جسم جاناں کا
کریگا آتش افروزی چمن سودائے گیسو میں　　دھنواں بنکر رولائیگا نظارہ سنبلستاں کا
بگڑ کر اُس نے چلمن سے جو ہمکو آنکھ دکھلائی　　غزالِ چشم پر دھوکا ہوا شیرِ نیستاں کا
پری وش پڑھتے ہیں کلمہ مرا میں جن وہ دیوانہ　　ہر اک داغِ جنوں میں ہی اثر مہرِ سلیماں کا
ترے ہونٹوں کے آگے رنگ جب اسکا نہیں جمتا　　تو کیا کیا جوش کھاتا ہے لہو لعلِ بدخشاں کا
ہے یہ حسنِ دو ہفتہ چار دن کی چاندنی ساقی　　چھلک جاتا ہی بھرتے ہی پیالہ ماہِ تاباں کا
نہیں ہے سرمہ کا دنبالہ اے ترک آنکھ میں تیری　　پھریرا سرمئی ہی یہ نشانِ فوجِ مژگاں کا
ذقن میں دانہ خالِ سیہ دیکھا تو میں سمجھا　　لطافت سے عیاں ہی تخم یہ سیبِ زنخداں کا
جہاں کو قتل کرتے ہیں یہ مہرو جامہ زیبی سے　　مگر تیغِ ہلالی ہی ہلال ان کے گریباں کا
حلب کی صبحِ صادق کا گماں ہے اسکے عارض پر　　مسی پر لعلِ لب کے شبہہ ہی شامِ بدخشاں کا
بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہ خود فراموشی　　دلِ گم گشتہ آپ ہی خضر ہی اپنے بیاباں کا
ہوئے ہیں جمع آنسو کر رہے ہیں شوخیاں کیا کیا　　گماں ہے دامنِ مژگاں پہ بازی گاہِ طفلاں کا
فلک پر ہے دماغ اے منعمو! اپنا گدائی میں　　بہت ہی بوریا، خواہاں نہیں تختِ سلیماں کا
نہ پایا بوسۂ لب اس پری سے جب تو یہ سمجھا　　نہیں انساں کی قسمت میں چشمہ آبِ حیواں کا
لبِ لعلیں پہ اُس کے یہ نہیں ہی پان کا لاکھا　　نکل آیا ہے کھا کر جوشِ خوں لعلِ بدخشاں کا
مسیں بھیگی نہیں ہیں اے وزیر اُس آئینہ رو کی　　نمایاں پشتِ لعلِ لب پہ ہے یہ عکس مژگاں کا

منتخب اشعار

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر　　زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر
اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے　　اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا قتل اس نے غیروں کو موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیب دشمناں ہو کر

وزیر آغوش یہاں فرقت میں بھی خالی نہیں رہتی
نہیں ہے یار اگر تو درد ہے مدت سے پہلو میں

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہے چشم یار عجب خواب ناز میں
فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

ہوئی گر صلح بھی تو بھی رہی جنگ
ملا جب دل تو آنکھ اس سے لڑا کی

پڑا ہے تفرقہ بے تابیوں سے
وزیر اب میں کہیں ہوں دل کہیں ہے

قطعہ

نہ کر عوض مرے جرم و گناہ بیحد کا
الٰہی تجکو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھکر مجھے محتاج
یہ اُنکے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

میر وزیر علی صبا

در چستی بندش و صحت و صفائی محاورہ و وقت فکر و بلندی اندیشہ سر آمد مستعدان بود (مہر جہاں تاب)

وزیر علی نام، صبا تخلص، میر بندہ علی کے بیٹے تھے، لکھنؤ وطن تھا، یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشو و نما ہوا، اس زمانے کے شریف زادوں کی طرح فارسی کی اچھی اور عربی

کی بقدر ضرورت تعلیم پائی،

اُس زمانہ میں علوم قدیمہ کا زور شور تھا، عربی، صرف و نحو اور منطق کے ساتھ ساتھ فن طب اور علم کلام کے مہمات مسائل کا سمجھ لینا شریف زادوں کے لئے ضروریاتِ زندگی میں داخل تھا، جو لوگ سبقاً سبقاً تحصیل نہ کر سکتے تھے، وہ بھی علماء کی صحبت میں اتنی معلومات بہم پہونچا لیتے تھے کہ مجلس گرم کرنے کو وہ کافی سے زیادہ ہوتی تھیں[1]،

میر وزیر علی صبا نے اسُی زمانے میں تعلیم و تربیت پائی، شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی، خواجہ حیدر علی آتش کے فیضِ صحبت سے اور بھی مشتاق ہو گئے،

ان کے دیوان کا نام غنچۂ آرزو ہے، جو ایک ضخیم جلد میں شائع ہو گیا ہے صحت و صفائی محاورہ اور لطفِ سخن میں ان کا کلام ہمعصروں کی نسبت سے بہت بہتر ہے،

سنہ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی، شاگردوں نے خوب خوب تاریخیں کہیں

---

[1] اس زمانہ میں ایک معمولی سے معمولی آدمی کی زبان پر بھی مصطلحاتِ علمی ایسی بے تکلفی کے ساتھ رواں ہوتے تھے کہ انکو سُن کر کسی طرح یہ باور نہیں آتا تھا کہ اُس نے درسی کتابیں نہیں پڑھیں، اب بھی لکھنؤ میں شاہی زمانہ کے جو سن رسیدہ لوگ موجود ہیں ان سے مل کر اسکی تصدیق کیجا سکتی ہے،

میرے بچپنے میں ایک فقیرنی بھیک مانگنے آیا کرتی تھی، پیر فرتوت مگر آواز میں لوچ اور شیرینی، صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوانی میں بہت شکیل اور کسی شریف گھرانے کی لڑکی ہو گی،

میرے ایک دوست نے اسکی بہت تعریف کی اور کہا کہ باتیں کرنا چاہو تو دو چار آنہ کی بالائی منگوا کر اس کے سامنے رکھدو، میں نے اسکو بلا کر بٹھایا اور بالائی پیش کی، تو بیحد خوش ہوئی اور باتیں کرنے لگی، معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں، فارسی اور اردو کے اساتذہ کا کلام خصوصاً سعدی شیرازی کے منتخب اشعار اور گلستاں کے برجستہ فقرے اس طرح برمحل پڑھتی اور ترجمہ کرتی تھی کہ اسکی حلاوت آج تک باقی ہے،

افسوس ہے کہ بچپن کی وجہ سے اس کا خیال نہیں ہوا کہ اس سے عہد قدیم کے حالات پوچھتا، صرف اتنا معلوم ہوا کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں لڑکیوں کا کوئی مدرسہ تھا، اُس مدرسہ سے اسکو کچھ تعلق رہا ہے،

کسی نے کہا، ع

صبا در گلشنِ فردوس جا کرد

کسی نے کہا، ع

صبا از گلشنِ دنیا کجا رفت

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اللہ رے اُن کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے
کیونکر کوئی جئے گا جب یوں عتاب ہوگا

جائے عبرت ہے جہانِ بے ثبات
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

اللہ ہے جو حال پہ بندہ کے ہو کرم
پہچانتا ہوں خوب میں سرکار کا مزاج

آدم سے باغِ خلد چھٹا ہم سے کوئے یار
وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج
کہتے ہیں میرے دوست مرا حال دیکھکر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے مبتلائے رنج

نہ کہئے نالۂ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر
سنی ہی تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

آفت ہے قیدِ سبحہ و زنار جان کو
تارِ حیات میں نہیں یہ گتھیاں پسند

صیاد و باغباں نہ کریں کج ادائیاں ناز و نیاز بلبل و گل میں ہے چار روز

اِس مرقع میں عجب نقشہ ہے دیکھو جس طرف صورتیں دس ہیں ناخوش ہیں جو ہیں دو چار خوش

ہوش میں آ مجھے کیا جان نہیں اپنی عزیز دوست رکھوں میں تجھے اے دلِ دشمن کب تک

کہتے تھے دل نہ دیں گے کسی کو تمام عمر مجبور ہو گئے مگر اک دلستاں سے ہم

ہمیں کو رنج دیکر اُلٹے شکوے ہم سے کرتے ہو جواب اپنا نہیں رکھتے ہو تم باتیں بنانے میں

کون سنتا ہے تری جوشِ جنوں میں ناصح خضر بھی آئیں تو ہم راہ بتا دیں اُن کو

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

نواب سید محمد خاں رندؔ

سخنش دردانگیز و کلامش مہر خیز در عین بے تکلفی تکلفے دارد۔ (ماہ جہانتاب)

سید محمد خاں رندؔ نواب غیاث الدین نیشاپوری کے بیٹے تھے، جو نواب برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے، ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے، چونکہ "نواب وزیر" کے خاندان سے قریبی تعلق تھا، اس واسطے نواب بہو بیگم کے دامنِ تربیت

میں ناز و نعمت سے پرورش پائی، جب تک وہ زندہ رہیں، فیض آباد میں رہے، ان کے مرنے کے بعد سنہ ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ چلے آئے، اور یہیں سکونت اختیار کرلی،

شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی، جب تک فیض آباد میں رہے امیر مستحسن خلیق سے مشقِ سخن کرتے رہے، لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے، پہلے وفا تخلص تھا، خواجہ صاحب نے رند بنادیا،

ایک دیوان فیض آباد میں میر خلیق کے مشورہ سے تیار ہوچکا تھا، لکھنؤ آنے کے بعد اس کو غرقِ آب کرکے دو دیوان اور مرتب کئے جو گلدستۂ عشق کے نام سے چھپ گئے ہیں، مگر ان دیوانوں میں بھی میر خلیق کے فیضِ صحبت کا رنگ صاف جھلکتا ہے،

بات یہ ہے کہ اہلِ لکھنؤ کی شاعری کا مدار مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت اور زبان کی صحت پر ہوا کرتا ہے، ان کے ہاں تینوں چیزیں کمزور ہیں، بلند پروازی اور خیال آفرینی میں خواجہ وزیر اور زبان کی صحت میں میر صبا کو یہ نہیں پہنچتے، مگر ان کے ہاں سادگی اور صفائی اور تاثیر کا ہلکا سا رنگ نظر آتا ہے، جس سے خواجہ وزیر محروم ہیں اور صبا کے ہاں کچھ کچھ پایا جاتا ہے،

سنہ وفات ان کا میری نظر سے نہیں گذرا، مگر اتنا معلوم ہے کہ آخر عمر میں منہیات سے تائب ہوگئے تھے، اور دربار اودھ کی سازشوں سے دل برداشتہ ہوکر غدر سے چند سال پہلے عتبات عالیات کی زیارت کی نیت سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، چونکہ ان کے مقدر میں یہ بات نہ تھی بمبئی پہونچ کر سفرِ آخرت اختیار کیا،

دیدِ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور   میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

پھینک دوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ضعف اسے کہتے ہیں سینہ سے لبوں تک آتے
سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اُٹھا

چھوڑا قفس سے تب ہمیں صیاد تو نے آہ
جب موسم بہار چمن سے نکل گیا

مژدہ اے گردوں بر آیا تیرے دل کا مدعا
شہر سے آباد آتا ہے نظر ویرانہ آج

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھایا کنج قفس مجھکو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

لطفِ گلگشتِ چمن کنجِ قفس میں بھولے
اب تو نقشہ بھی گلستاں کا مجھے یاد نہیں

کبھی خوفِ خزاں ہے اور کبھی صیاد کا کھٹکا
بناؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں

او دل ہدف تیر نگہ پھر گیا تو نے
اگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آلے

قید ملت میں پھنسے چھوڑ کے رندانہ طریق
کیسے جھگڑے میں تم اے کافرو دیندار پڑے

کیا بتاؤں میں کسے یاد ہے بحران کا دن
مدتیں گذریں مسیحا مجھے بیمار پڑے

وعدہ پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

جنوں اگرچہ ہمیں ہر برس ہوا لیکن
یہ ولولے نہ ہوئے تھے جو اب کی سال ہوئے

چار دن کی دوستی کا ہے زمانے میں رواج
کس توقع پر کسی سے آشنائی کیجئے

اے جاں لب پہ آ کے ٹھہرنے سے فائدہ
رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

ستم کرتا ہے چرخ سفلہ پرور اہل غیرت پر
جو کانوں سے نہ سنتے تھے وہ آنکھوں سے دکھاتا ہے

کچھ ہنس کے کٹی وصل میں کچھ ہجر میں رو کر
ہر طرح غرض عمر دو روزہ بسر آئی

پھنسائیں بلبلیں گن گن کے توڑے پھول چن چن کے
چمن میں تم نے او صیاد و گلچیں کچھ بھی چھوڑا ہے

دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست
ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

وقت بد میں کون دیتا ہے کسی کا ساتھ تند
یار ثابت اک ملی دنیا میں تنہائی مجھے

گذرے جس دم ہم دنیا سے
ہم نے جانا دنیا گذری
بحر جہاں میں زیست ہماری
شکل حباب دریا گذری

خوش رہو تم وطن میں اہل وطن
ہم ہیں اور سیر دشت غربت ہو

کرے فرقت میں کب تک صبر ایوبؑ
یہ عاشق تیرا پیغمبر نہیں ہے

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

کئی دن سے ہے گھات میں صیاد
عندلیب آج کل ہی پھنستی ہے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لیجایئے
جو گذریگی ہم پر گذر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

مرزا محمد رضا برق

محمد رضا نام، برق تخلص، "فتح الدولہ بخشی الملک" خطاب تھا، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ[1] بادشاہ کے مصاحب تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اُس زمانے کے رواج

---

[1] ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطان عالم واجد علی شاہ خاتم شاہان اودھ ۱۲۶۳ھ میں اپنے باپ امجد علی شاہ کی جگہ تخت نشین ہوئے، شروع شروع میں کام میں جی لگایا، بانکا ترچھا دو رسالے، نادری اور حیدری دو پلٹنیں قائم کیں، خود قواعد لیتے تھے، سواری کا جلوس نکلتا تو آگے آگے ایک صندوق ہوتا تھا، جسمیں ہر شخص کو عرضیاں ڈالنے کا اختیار تھا، اس کا نام مشغلۂ سلطانی رکھا تھا،

چند روز کے بعد ان سب باتوں سے جی ہٹ گیا، نواب علی نقی خاں کو وزیر مقرر کیا، جو سسرے بھی تھے اور سمدھی بھی، خود اپنے لئے بجائے سلطان عالم کے جان عالم خطاب پسند کیا، وزیر کو حضور عالم بنایا اور ملک و دولت انھیں سپرد کر کے اپنے شاہزادگی کے مشاغل میں مصروف ہو گئے، قیصر باغ بنایا گیا اور اسکو صدہا حسین و جمیل و خوش گلو اور خوش خرام معشوقوں سے آباد کیا گیا، گویوں اور ڈھاڑیوں کو قطب الدولہ اور دیانت الدولہ اور خدا جانے کیا کیا خطاب دیکر امین و محرم راز بنایا گیا،

شعر و سخن و موسیقی میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ طبلہ بجانے اور ناچنے میں وہ کمال پیدا کیا کہ اس فن کے بڑے بڑے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے، ہر سال قیصر باغ میں ایک میلہ مقرر کیا، جس میں ہر شخص گیروے کپڑے پہن کر شریک ہو سکتا تھا، جان عالم جس دن گم ہوتے اور پریاں جوگنوں کا بھیس بدل کر بین بجاتی ہوئی ان کو ڈھونڈھنے نکلتی تھیں تو اچھے اچھے ثقہ اور پرہیزگار لوگوں کے حواس باختہ ہو جاتے تھے، پھر جب وہ ملتے تھے اور جشن منایا جاتا تھا، تو اس کے شان و شکوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا،

قیصر باغ میں ٹیڑھی کوٹھی چند روز ہوئے کھدی ہے، اُس میں اندر کا اکھاڑہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے موافق تعلیم پاکر شعر و سخن کی طرف توجہ کی، شیخ امام بخش ناسخ کا زمانہ تھا، نواب معتمد الدولہ کے استاد ہونے کی وجہ سے لکھنؤ میں ان کی شاعری کا سکہ رائج تھا، انہی کے شاگرد ہو گئے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۲) جمتا تھا، پریاں آسمان سے اترتی تھیں اور ان کا ناچ ہوتا تھا، خود جان عالم راجہ اندر بن کر بیٹھتے تھے، غرض کہ وہ وہ سامان کئے گئے تھے کہ اندر سبھا، سحرالبیان کے مصنفین نے عالم خیال میں بھی وہ تماشے نہیں دیکھے تھے،

جان عالم جب ان شغلوں میں محو تھے، تو سمجھو کہ سارا لکھنؤ انہی باتوں کا سودائی ہو رہا تھا، ادنی اہلکار سے لیکر وزیر تک سب اسی بادۂ غفلت سے سرشار تھے، مصارف کی زیادتی، چکلہ داروں کی نوچ کھسوٹ اور تعلقہ داروں کی سرکشی سے ملک میں ایک ہنگامہ برپا تھا، رعایا دن دہاڑے لٹ رہی تھی، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی، سلیمن صاحب اس زمانہ میں رزیڈنٹ تھے، وہ نواب علی نقی خاں سے کچھ برہم بھی تھے، موقع پاکر سرکار کمپنی کے اہل کاروں کے خوب کان بھرے، اور لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھے، پنجاب وغیرہ کی ریاست کو ضبط کرکے منہ کو خون لگ چکا تھا، بجائے اس کے کہ بادشاہ کو آنکھیں دکھا کر نالائق اہلکاروں کو نکلوا دیتے، یا خود بادشاہ کو معزول کرکے انکے بھائی بیٹوں میں سے کسی کو بادشاہ کر دیتے، انتزاع سلطنت کا فرمان لکھ کر جنرل اوٹرم کے پاس سنہ ۱۲۷۲ھ میں بھیجدیا، انھوں نے آتے ہی دو کروڑ روپیہ سالانہ آمدنی کا ملک بغیر اس کے کہ بندوق کا ایک فیر بھی ہو، انگریزی گورنمنٹ کے قبضہ میں لے لیا، جناب عالیہ (واجد علی شاہ کی ماں) بہت چیخیں چلائیں کہ واجد علی نالائق ہے تو مصطفی علی ایک بھائی کو یا جنرل سکندر حشمت دوسرے بھائی کو بٹھادو، مگر کون سنتا ہے، جان عالم کے مشاغل کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا،

۵ رجب سنہ ۱۲۷۲ھ کو بادشاہ بنفس نفیس اپیل کرنے کو باصد حسرت و یاس لندن روانہ ہوئے، مگر کلکتہ پہنچکر رائے بدل گئی، جناب عالیہ اپنے فرزند جنرل سکندر حشمت مرزا حامد علیخاں ولیعہد اور مولوی مسیح الدین کاکوروی سفیر شاہی کو لیکر ایک سو دس زن و مرد کے ساتھ لندن روانہ ہوئیں وہ لندن پہنچی ہی تھیں اور (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اور چند روز کی مشق میں ان کے اکثر شاگردوں سے بہتر کہنے لگے،
برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی انگشت نما تھے، بانک بنوٹ اچھی جانتے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۳) کوئن وکٹوریہ ملکہ معظمہ انگلستان سے صرف ایک ملاقات ہونے پائی تھی کہ ہندوستان میں غدر ہوگیا، جن انگریزوں کو اس خانماں آوارہ قافلہ سے ہمدردی بھی تھی وہ بھی ان کو چشم غضب آلود سے دیکھنے لگے، اور انجام یہ ہوا کہ جناب عالیہ اور جنرل سکندر حشمت نے یورپ میں سفر آخرت اختیار کیا، باقی لوگ بادل بریاں و چشم گریاں واپس آئے، ادھر بادشاہ کو انگریزوں نے ایام غدر میں بلحاظ مصلحت ملکی فورٹ ولیم میں نظر بند کر رکھا تھا، چھبیس مہینے کے بعد وہاں سے چھوٹ کر نکلے اور پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ قبول کرکے مٹیابرج میں کوٹھیاں اور بنگلے خرید کرکے اپنے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرلیا، چند روز میں عالیشان عمارتیں بن کر تیار ہوگئیں، اور لکھنؤ کا پرستان اُٹھ کر مٹیابرج آپہنچا، بادشاہ نے دل بہلانے کو زندہ جانوروں کا خصوصاً سانپوں کا ایسا ایک چڑیاخانہ بنایا کہ شاید دنیا میں اُس کا کہیں جواب نہ ہوگا،

اُس زمانے میں جس نے مٹیابرج دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس مٹی ہوئی حالت میں اسے باغ ارم بناکر راجہ اندر کا اکھاڑا کر رکھا تھا، اس پر محلات و ایوانہاے دلکشا کی وہی شان، آرایش و آسایش کے سامان کی وہی افراط، زرپاشی اور داد و دہش کی وہی کیفیت، غرض جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا وہ کر دکھایا، اور اس طرح سے ہنس بول کر زندگی بسر کردی کہ گویا کوئی مصیبت پڑی ہی نہ تھی،

لوگ کہتے ہیں ان میں نری برائیاں ہی نہ تھیں کچھ خوبیاں بھی تھیں، اول یہ کہ باوجود اس عیش و عشرت کے شراب کو کبھی منہ سے نہیں لگایا، دوسرے یہ کہ نامحرم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا، نہ کسی کی بہو بیٹی زبردستی چھینی، جس پری پیکر پر دل آیا اس سے نکاح یا متعہ کرکے حرام کو حلال کر لیتے تھے، تیسرے تعصب مذہبی دیوانگی کی حد تک نہیں تھا، شیعہ، سنی اور ہندو سب اُن کے خوانِ نعمت سے متمتع رہے، بلکہ اکثر اہل کار سنی تھے، اور ان کے مذہب سے کبھی تعرض نہیں کیا، چوتھے یہ کہ مذاق اتنا عمدہ تھا کہ جس چیز کا نام رکھتے یا جس کو خطاب (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۵ پر)

تلوار خوب لگاتے تھے، نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی کے زمانہ وزارت میں امراء و وزرائے سے روشناس ہو چلے تھے، واجد علی شاہ کے زمانہ میں ترقی کی، ہر وقت مصاحبت میں رہتے اور بادشاہ کے کلام میں اصلاح بھی دیتے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٨٣) دیتے اس سے ان کی ذہانت نمایاں ہوتی تھی، شاعری کی حیثیت سے دیکھو تو تصنیفات کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی نصیب نہیں، چھ دیوان غزلوں کے، کئی مثنویاں عاشقانہ قصوں کی جنمیں اکثر آپ بیتی، ایک کتاب مباحثہ بین النفس و العقل، نصائح اختری، عشق نامہ، رسالہ ایمان، مصائب اہل بیت میں، دفتر پریشان مثنوی معتبر، دستور واجدی ریاست میں، دلہن موسیقی میں، جوہر عروض عروض میں، اور خدا جانے کتنی تصنیفات ہیں جنکی تعداد چالیس ۴۰ سے کم نہیں،

کلام کا رنگ وہی ہے جو اُس زمانہ میں عام تھا اور جس کی ذمہ داری خود انہی کے مشاغل پر عائد ہوتی ہے آپ بیتی جو قصے مثنویوں میں لکھے ہیں، انکو کوئی مہذب آدمی دیکھ نہیں سکتا،

اے پریزادو تمھاری آگ نے پھونکا یہ گھر
قاف سے تا قاف شہرہ اور فسانہ ہو گیا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یوں تو شاہانِ جہاں پر بھی پڑا وقت مگر
ختم ہے اختر بیکس پہ جفائے غربت

قید ہونے سے کہیں بوے ریاست جائیگی
لاکھ گردش آسماں کو ہو زمیں ہوتا نہیں

سخاوت کیا کرونگا داغہاے جسم عریاں سے
خزانے میں وہ ہیریں جمع ہیں جو بٹ نہیں سکتیں
توقع صبح ہونے کی کسے ہوتی ہے فرقت میں
وہ راتیں ہجر کی ہیں اے خدا جو کٹ نہیں سکتیں

اس زمانہ کا رنگ ہی اور تھا، لفظی رعایتیں، ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی تھیں، نئی نئی تشبیہوں اور پیچیدہ پیچیدہ استعاروں کا ہر شخص دلدادہ ہو رہا تھا، اور شاعری اپنے بلند مرتبہ سے گر کر انگیا چوٹی میں پھنس گئی تھی، یہ باتیں اُس زمانہ میں عیب نہیں رہی تھیں، بلکہ طرۂ افتخار سمجھی جاتی تھیں، خود برق کی زبان سے اس کی حقیقت سنو ؎

راجہ اندر کا اکھاڑا صحبت اقدس ہے برق
نام رکھا ہے پرستاں بزم عشرت گاہ کا

ناسخ و آتش کے شاگرد سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، کوئی کم کوئی زیادہ، اس کی تفصیل دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مقدمہ پڑھو،

برق بہت پرگو شاعر تھے، ایک ضخیم دیوان عمدہ کاغذ پر نہایت خوشخط انہی کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا، اُس میں غزلیں، مخمس، مسدس، ترجیع بند، رباعیاں، قطعے، سبھی کچھ ہیں، ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت دردانگیز لکھا ہے، معلوم نہیں کہ پہلے دیوان کی اشاعت کے بعد دوسرا دیوان ان کا مرتب ہوا یا نہیں،

انتزاع سلطنت کے بعد اپنے بادشاہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے تھے، اور جب بادشاہ فورٹ ولیم میں نظربند کئے گئے تو انھوں نے بھی حق رفاقت ادا کیا اور وہیں ۱۰ صفر ۱۲۷۳ھ کو فرق مبارک پر تصدق ہو گئے اور جو کچھ کہا تھا کر دکھایا ؎

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پر مر کر اُٹھے

منتخب اشعار

اتنا تو جذب عشق نے بارے اثر کیا
اس کو بھی اب ملال ہے میرے ملال کا

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہوگئی
اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

اذاں دی کعبہ میں، ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

ہر اک نفس عشق میں ہے زندگیٔ خضر
جینے کے لئے مرتے ہیں بیمارِ محبت

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو
غم میں پھنسا ہوں دامِ محبت سے چھوٹ کر

دل مکدر ہو تو سب عیشِ جہاں مٹی ہے
تو نہیں پاس تو پھر لطفِ چمن خاک نہیں

قیس کا نام نہ لو ذکرِ جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسمِ گل آنے دو

ہم تو اپنوں سے بھی بیگانہ ہوئے الفت میں
تم جو غیروں سے ملے تم کو نہ غیرت آئی

خدا غریب کی سنتا ہے عجیب فریاد
اثر عجیب دلِ دردمند رکھتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں
جس سے ہوتی ہے امید اُس سے گلہ ہوتا ہے

اُٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اُسے میں نے
نہ سوجھی عارضِ گلگوں کی جب مثال مجھے

میر علی اوسط رشک

علی اوسط نام، رشک تخلص، میر سلیمان کے بیٹے تھے اور فیض آباد بزرگوں کا وطن تھا، لکھنؤ میں ان کا نشو و نما ہوا، پورا نام و لقب والاجاہ میر علی اوسط رشک ہے، والد ان کے علوم و فنون میں کافی مہارت رکھتے تھے، والد سے اور دیگر علما کی فیضِ صحبت سے استعداد علمی حاصل کر کے شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہوئے،

شاعری میں وہ جوش و خروش نہیں پایا جاتا جو خواجہ وزیر یا ان کے اور خواجہ تاشوں کے حصہ میں آیا تھا، مگر زبان کی تصحیح اور لغات کی تحقیق میں یہ ناسخ کے تمام شاگردوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے،

تاریخ گوئی میں بھی ان کو خاص ملکہ تھا، بات بات پر تاریخ کہتے تھے، اور مرنے جینے کی تاریخوں کا تو اُنھوں نے ٹھیکہ لے رکھا تھا، ادھر کسی کا دم نکلا انھوں نے تاریخ نکالی، کوئی پیدا ہوا نال کٹنے میں دیر ہو تو ہو مگر تاریخ میں دیر نہیں لگتی تھی،

سب سے زیادہ جو چیز ان کی زندگی کا نمایاں کارنامہ ہے، وہ زبان کی اصلاح ہے، ناسخ تو استاد تھے ہی، مگر واضع ان قوانین کے رشک تھے، کچھ الفاظ نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں، دہاں بروزن جاں، ہنوز بروزن جہاں ہو، تہ، تپ کہ کی جگہ ہونا ضروری ہے، رکھا بالتخفیف کی جگہ رکھا بالتشدید، تلک کی جگہ تک، بنھانا، پنھانا کی جگہ نباہنا، پہنانا، اسباب کی جگہ اس بارہ میں، شعلہ وعدہ دریا اور صحرا کا ہم قافیہ نہ ہو، علاوہ ان کے اور بھی قاعدے بنائے ہیں جن کی پابندی ناسخ و آتش نے بھی نہیں کی، مگر اُنھوں نے وجوباً اُن کو اختیار کیا اور مزہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اسی میں چوپٹ ہو گئی،

معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعرا اسی ضرورت سے کہتے تھے کہ جو الفاظ یا جو ترکیبیں بول چال میں لطف دیتی ہیں ان سے شعر میں بھی کام لیا جائے، مثلاً آپ ہی کی جگہ آپی یا اور ہی کی جگہ اوری یا ایک ہی کی جگہ ایکی یا ساتھ ہی کی جگہ ساتھی، یا بال بیکنا کی جگہ بال بیکا ہونا، آخر کرنا مار ڈالنے کے معنوں میں، اپنی طرف دیکھو جانے دو کے معنی میں، ادھر کی باتیں ادھر کرنا، لگائی بجھائی کے معنوں میں، اتنے لئے کے بجائے صرف اسی کام کے واسطے، جب نہ تب، اکثر وقت بے وقت، جان ہار، جان پر کھیلنے والا، خاطر نشان ہونا مطمئن ہونا، صاحبی پانا، عروج پانے کے معنوں میں، غرضکہ اس طرح کے سینکڑوں الفاظ اور ترکیبیں جو بول چال میں تھیں، مگر شعر وانشا میں ان سے بچاؤ کیا جاتا تھا، انھوں نے ان کو نظم کرکے زبان کو وسعت دیدی اور صرف نظم کرنے ہی پر قناعت نہیں کی، بلکہ سنہ ۱۲۵۶ھ میں اردو کا ایک لغت تالیف کرکے ملک پر احسانِ عظیم کیا، جس کا تاریخی نام نفس اللغۃ ہے، اس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شائع بھی کر دیا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ شاعری سے قطع نظر بھی کر دو تو ان خدمتوں کے لحاظ سے رشک کو بجا طور پر اس کا فخر حاصل ہے کہ ان کو اساتذۂ شعرا کے دوش بدوش جگہ دیجائے،

رشک آخر عمر میں کربلاے معلی چلے گئے تھے، اور وہیں، سنہ ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی، ان کے تین دیوان ہیں، ان میں سے نظم مبارک اور نظم گرامی دو دیوان سنہ ۱۲۵۳ھ اور سنہ ۱۲۶۱ھ میں ترتیب دیکر سنہ ۱۲۶۳ھ میں خود چھپوائے تھے؛ تیسرا دیوان ضائع ہو گیا، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان دونوں سے اچھا تھا،

ان دونوں میں چوٹی کے شعر کم ہیں، اصلاح زبان کی دھن میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کی ان کو پروا نہیں تھی، نمونہ ملاحظہ ہو،

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں
وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں
پرزوں میں دستخط کروں کیا حال
ایک دو تین چار تاؤ نہیں
عید بھی وصل سے بچی خالی
کچھ گلے ملنے کا لگاؤ نہیں
گنگ کو بحرِ غم سے کیا نسبت
یہ وہ دریا ہے جس میں ناؤ نہیں
اور کیا ہے ترا لعابِ دہن
یہ اگر قند کا جماؤ نہیں
اب کی جاڑے میں اور نالہ و آہ
اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
چاول الماس گوشت لختِ جگر
فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک کو کباب
پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہیں
ہجر میں کیوں طرح طرح نہ دبا
بارِ غم ہے بڑا دباؤ نہیں
یہ زمینِ غزل وہ ہے اے رشک
جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

یہ بہت بڑی غزل ہے جس کے کچھ اشعار میں نے نقل کئے ہیں، اتفاق سے ایک قافیہ رہ گیا ہے جس کو رشک نے ہاتھ نہیں لگایا، ان کے کسی حریف نے اس کمی کو پورا کرکے خود انہی کی طرف منسوب کر دیا ہے، اور نشتر کاکوروی نے نفس اللغۃ کے مقدمہ میں ناظرین کتاب کی اس سے ضیافتِ طبع کر دی ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے،

دوہے پھکڑے دکھاؤ نہیں
رشک بیٹھا ہے بن پڑاؤ نہیں

یہ تو ایک دل لگی ہوئی، مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانے کے اہلِ مذاق ان کے کلام کی نسبت کیا رائے رکھتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان کی صحت و صفائی کے سامنے مضمون کی تازگی اور بلندی کا خیال نہیں رکھتے تھے، مضمون خاک میں مل جائے، مگر زبان صحیح اور پاکیزہ ہو، باوجود اس کے ان کے دیوانوں سے ایسے اشعار بھی انتخاب کئے جا سکتے ہیں جن سے

ان کی مشاقی اور استعداد کا پتہ چلتا ہے، مثلاً

کہاں یہ لطف چیتے نے کمر پائی اگر پتلی
تمہارے ہونٹ پتلے، انگلیاں پتلی، کمر پتلی
تجھے تشبیہ حیوانوں سے کیوں انسان دیتے ہیں
نہ وحشت چشم آہو ہیں، نہ چیتے کی کمر پتلی
فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہے
بدن شفاف، شانے گول، قد موزوں، کمر پتلی

بیشتر حصہ ان کے کلام کا لفظی رعایت اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں پھنسا ہوا ہے اور کہیں کہیں ایسے مبتذل مضامین باندھے ہیں جو پڑھنے کے قابل نہیں، بد مذاقی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ جستجو اور تلاش سے بھی ایسے اشعار ان کے ہاں نہیں ملتے جن سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہو، دو چار شعر جو ملے ہیں انہی پر قناعت کرتا ہوں“

اس فہم پہ حقیقت صانع کی فکر ہے
واقف نہیں ہم اپنی حقیقت سے آج تک

ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپ ہی
(آپ ہی)
دل ہی میں سراغ در دلدار ملے گا

محفل میں شمع، چاند فلک پر، چمن میں پھول
تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

جو مشکل ہے مرنا تو مرنا کسی پر
یہ مرنا تو اے رشک مشکل نہیں ہے

مرزا اصغر علی خاں نسیم

مولد منشائش شاہجہان آباد دہلی است در آخر عمر لکھنؤ را از قدوم خود رونق بخشیدہ اند و بر مسند افادہ نشست و طالبان فن را از پایۂ تعلیم و تلمذ بمرتبۂ کمال رسانیدہ (مہر جہانتاب)

اصغر علی خاں نام نسیم تخلص، نواب آقا علی خاں قاجار کے بیٹے تھے، دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پایا، حکیم مومن خاں سے مشق سخن کی، زمانہ موافق تھا، اپنے مکان پر مجلس مشاعرہ ترتیب دیتے تھے، اس میں مومن خاں و دیگر مشاہیر دلی شریک ہو کر داد سخن دیتے تھے،

پہلے اصغر تخلص کرتے تھے بعد میں نسیم اختیار کیا، جب تک دلی میں رہے، بہت فراغت اور خوشحالی سے زندگی بسر کرتے رہے، باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے نہیں بنی اور کچھ ایسی مشکل پیش آئی کہ دلی کو چھوڑنا پڑا، غدر کے کچھ دنوں پہلے لکھنؤ آ رہے، واجد علی شاہ کا زمانہ تھا، ان کی تعریف کے قصیدے دیوان میں موجود ہیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ دربار تک رسائی ہوئی یا نہیں، اور ہوئی تو ان سے کیا سلوک ہوا،

اتنا معلوم ہے کہ نواب سالار جنگ کے خاندان کے بعض امرا ان کے شاگرد ہو گئے تھے، اور وہ ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے،

غدر کے بعد منشی نولکشور مالک مطبع نے جن کا چھاپہ خانہ اس وقت تک تمام ہندوستان میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے ان کی طرف قدردانی کا ہاتھ بڑھایا، اور الف لیلہ کو نظم کرنے کی خدمت سپرد کی، ایک جلد اس کی تمام کر پائے تھے کہ خود ان کا قصہ تمام ہو گیا، اور ۱۲ رمضان سنہ ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی،

مزاج میں آزادی اور وارستگی بیحد تھی، جو کچھ لکھتے تھے اس کی نقل اپنے پاس نہیں

رکھتے تھے، مرنے کے بعد ان کے شاگردوں نے بڑی محنت اور کاوش سے ان کا کلام فراہم کر کے دیوان مرتب کیا،

نسیم نے تمام اصناف سخن میں قدرت کامل پائی تھی، خصوصاً مثنوی میں انکو ید بیضا حاصل تھا، ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی اسقدر نمایاں اور واضح ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا کلام لگا نہیں کھاتا،

میری نظر میں وہ اپنے معاصرین اہلِ دہلی میں ایک ہی شخص ہیں جس نے اپنی طرز بیان کو محفوظ رکھتے ہوئے اہلِ لکھنؤ کی متروکات کو قبول کرنے میں پیشقدمی کی اور زبان کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ شعرائے لکھنؤ نے بھی اس کی داد دی اور یہاں رہ کر اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر لیا،

الف لیلہ منظوم کے ساقی نامے اگر ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو میرا خیال ہے، ظہوری کا ساقی نامہ اس کے سامنے بے حقیقت ہو جائے گا، نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے:

سنبھل ساقی کہ وقت اب دور آیا — رہوں بے ہوش پھر وہ دور آیا
مزا رکھتا نہیں بے کیف جینا — تمنا ہے کہ برسے ابر مینا
ہر اک قطرہ لہو بن بن کے ٹپکے — مرے دامن سے چھن چھن کے ٹپکے
طبیعت صورت مے جوش میں ہو — تمنا عزم نوشا نوش میں ہے
نظر آئے کنارِ جام گلگوں — لبِ شاعر سے ٹپکے مطلعِ مضموں
وفورِ شوق وقتِ گفتگو ہو — سخن افسانہ رنگِ آرزو ہو
گلے مل مل کے لفظوں سے معانی — دکھائیں گفتگو کی نوجوانی

طبیعت محو ہو عرضِ سخن میں
فسانہ یوں بیاں ہو انجمن میں

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

حیا بڑھنے نہیں دیتی ارادہ نوجوانی کا
اشارہ ہو کے رہ جاتا ہے ہمپر مہربانی کا

گلے میں بخت کے اٹکا ابھی کچھ قصہ نکل آیا
ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

جب دیکھئے قرار نہیں ایک حال پر
میرا سا اب تو حال ہوا روزگار کا

کبھی آغوش میں رہتا کبھی رخساروں پر
کاش اے آفتِ جاں میں ترا آنسو ہوتا

منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند
دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

افشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک
آنکھوں میں نہاں تھا کوئی دامن میں چھپا تھا

اب دودِ جگر ہو کے نکلتا ہے دہن سے
وہ جوش جو برسوں مرے سینہ میں نہاں تھا

بہت مشکل ہے رہنا پاک دامن لوثِ دنیا سے
الجھ کر رہ گیا جو وادیِ پُرخار میں آیا

اشک شیدہ ہیں ہمیں کیا خانہ ویرانی کی فکر
گر پڑے جس جا وہی اپنا وطن ہو جائیگا

کہے دیتی تھیں یہ نیچی نگاہیں
کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

نام میرا سنتے ہی شرما گئے
تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

آنکھوں میں ہے بلحاظ تبسم فزائے لب
شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز
یہ ارادے ایک مشتِ خاک پر

ہوتی نہیں ہے کم مری ویرانہ دوستی
جاتا نہیں ہے سر سے خیالِ وطن ہنوز

برق نے اک طرزِ بیتابی مرا سیکھا تو کیا
سیکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطرِ ناشاد میں

ہم اسیرانِ قفس کیا جانیں لطفِ بوستاں
مدتوں سے مبتلائے زحمتِ صیاد ہیں

شوقِ شراب ہے خواہشِ جام و سبو نہیں
ہے سب حرام جب سے کہ پہلو میں تو نہیں

میرا ہی دوست خود سببِ دشمنی ہوا
آئیں خرابیاں دلِ خانہ خراب سے

میر مظفر علی خاں اسیر

شاعرے بلند فکر، عالی پایہ و دبیرے نیکو تحریر، گراں مایہ، صاحب التصانیف و کثیر التلامذہ معاصر فقیر راقم ہست، (از مہر جہاں تاب)

مظفر علی اسیر، امیر مدد علی کے بیٹے تھے، امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، فارسی کی کتابیں اپنے والد سے، عربی صرف و نحو اپنے چچا سید علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں، اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے مشقِ سخن کی، مگر یہ ان کے ایسے زمانہ کے شاگرد ہیں، کہ استاد کے رنگ سے انکو کچھ حصہ نہیں ملا،

نصیر الدین حیدر شاہِ اودھ کے زمانہ میں ملازم ہوئے، آٹھ برس تک محکمۂ صدر امانت میں رہے، امجد علی شاہ کے زمانے میں نواب امین الدولہ کا ستارۂ اقبال چمکا تو ان کی عنایت سے یہ میر منشی ہو گئے، جب زمانے نے ورق الٹا تو امین الدولہ سے دوستی کی پاداش میں چند دنوں اسیر رہے،

چند دنوں کے بعد پھر تقدیر جگی، واجد علی شاہ نے قید و بند سے آزاد کر کے تنخواہ مقرر کر دی اور تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب عنایت کیا،

انتزاع سلطنت کے بعد رامپور یاد آیا، جس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں لکھنؤ میں رہتے تھے، اپنے صاحبزادوں کی تعلیم ان کے سپرد کر دی تھی اسی سلسلہ سے رامپور پہنچے اس وقت ان کے شاگرد نواب یوسف علی خاں برسر حکومت تھے، انھوں نے سرپرستی فرمائی، اور اپنا کلام ان کو دکھلانے لگے،

یوسف علی خاں کے مرنے کے بعد ان کے لائق جانشین، نواب کلب علی خاں مرحوم کی

قدر دانی سے تھوڑے دنوں فراغت سے زندگی بسر کرکے سنہ ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی،

اسیر بہت پرگو اور کہنہ مشق شاعر تھے، اور تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے، مگر اپنے ہمعصروں کی طرح لفظی رعایتوں کے اسیر تھے، شاگردوں میں منشی امیر احمد امیر مولوی الٰہی بخش نازش، منشی احمد علی شوق، اور ریاض احمد ریاض ایسے اچھے شاعر ہوئے، جو درحقیقت استاد کی ناموری کے زیادہ تر باعث ہوئے، تصنیفات میں ایک دیوان فارسی کا ہے، چھ دیوان اردو کے اور کئی مثنویاں ہیں، ایک کتاب عروض میں زر کامل عیار شرح معیار الاشعار ہے، اور کئی رسالے عروض و قافیہ اور صرف و نحو میں ہیں،

دشمن جو سمجھتے ہو تو کیوں مجھ سے ہو غافل
دشمن سے جہاں میں کوئی غافل نہیں رہتا

آنکھ اسکی پھری مجھ سے یہ باور نہیں آتا
کیا ضعف سے بیمار کو چکر نہیں آتا

ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پر دمِ حشر
ناز نے غمزہ پہ غمزہ نے ادا پر رکھا

مسجد سے نکل کر میں رہِ بتکدہ بھولا
تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا

نفع پہونچا نہ کسی کو چمنِ گردوں سے،
گلِ خورشید کبھی زیبِ گریباں نہ ہوا
اسکے دامن سے مرے خون کا دھبہ دھوا،
تجھ سے اتنا بھی تو اے دیدۂ گریاں نہ ہوا

ضعفِ پیری بڑھ گیا زورِ جوانی گھٹ گیا
اب عصا بنوائیے نخلِ تمنا کاٹ کر

اٹھنا انھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے
حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپش دل

یاد ایام کہ رہتے تھے کھنچے یار سے ہم
اب یہ عالم ہے کہ جھکنے لگے اغیار سے ہم

احباب کی نظر میں سبک ہوں تو ہوں اسیر
کرتا ہوں شکر، دل پہ کسی کے گراں نہیں

میں اور زیست ہجر میں، قدرت خدا کی ہے
انساں کے اختیار میں اپنی اجل نہیں

دھوم محشر میں ہوئی جب تری آمرزش کی
بیگنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

باقی ابھی ہے ترک تمنا کی آرزو
کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آتی شب ہجر
اے فلک کوئی تو امید بر آئی ہوتی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا
بہت آئے گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

شیخ امداد علی بحر

امداد علی نام، بحر تخلص، امام بخش کے بیٹے اور اپنے باپ کے ہمنام، شیخ امام بخش ناسخ

کے شاگرد ہوئے، لکھنؤ وطن تھا، گندم گوں، دبلے پتلے، میانہ قد، صحت الفاظ، تحقیق لغت اور فن عروض میں مشہور، رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے،

چھوٹی شہزادی کی سرکار سے کچھ وظیفہ ملتا تھا، انہی کی ڈیوڑھی پر پھاٹک کی بغل میں ایک کمرہ تھا، وہیں افیون گھلا کرتی تھی، اور ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے رہتے، لوگ دور دور سے تحقیق الفاظ کو آتے اور اسی بوسیدہ بوریئے پر بیٹھنا فخر سمجھتے تھے،

دن بھر ڈیوڑھی میں بیٹھکر شام کو گھر آتے، توپ دروازہ میں ایک کچا سا مکان تھا، بیوی تھیں اور آپ تھے، لوگ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا بھی تھا، پینسٹھ برس اسی عسرت اور تنگ حالی میں بسر کئے، نواب کلب علی خاں مرحوم کو خبر ہوئی کہ لکھنؤ میں ایک زباندان موجود ہے، بلوا بھیجا اور عزت افزائی فرما کر تنخواہ مقرر کر دی، عرصہ تک رامپور میں رہے آخر وقت میں وطن یاد آیا، نواب کے یہاں مشاعرہ تھا، یہ بھی غزل لیکر پہونچے، مقطع میں لکھنؤ کی جدائی کا اظہار دردناک انداز سے کیا تھا، نواب کو رحم آیا کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا، یہ پھر اسی مسند جم پر آ بیٹھے، جس کے بارے میں خود فرماتے ہیں،

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

مزاج کی وارفتگی نے دیوان کی ترتیب کا موقع نہیں دیا، ان کے دوستوں کو جو کچھ غزلیں ہاتھ لگیں ردیف وار جمع کیں، اور جو ردیف خالی تھی اس میں غزلیں لکھوا کر شامل کیں، یہ دیوان چھپ گیا ہے،

لوگ کہتے ہیں کہ اردو کا ایک لغت لکھنا شروع کیا تھا، ان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس کی کیا توقع ہے کہ اس کو پورا کیا ہو، تخمیناً پچھتر برس کی عمر میں سنہ ۱۳۰۱ھ میں وفات پائی،

نہ تو وہ پھول نہ کلیاں نہ وہ سبزی نہ بہار
رت کے پھرتے ہی چمن زار کا تختہ الٹا

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی
پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

وصلِ جاناں نہ ہوا وقتِ وصال آپہنچا
وائے حسرت کہ رہی دل کی تمنا دل میں

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

مدت سے التفات مرے حال پہ نہیں
کچھ تو کجی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں
دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی
بہار دیکھ چکے باغِ زندگانی کی

آسائشِ بیجا سے مسرت نہیں ہوتی
سو جائیں اگر پاؤں تو راحت نہیں ہوتی

بسملِ ہجر سے پوچھے کوئی مرنے کی خوشی
جان آتی ہے بدن میں کہ قضا آتی ہے

داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں   مجکو اس پھول سے خوشبوئے وفا آتی ہے

کٹی برسات پھر اس سال بھی فریاد و شیون میں
خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آئے کدھر برسے

دورِ دوم

منشی امیر احمد امیر

منشی امیر احمد امیر مولوی کرم احمد مینائی کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے، نسب کا سلسلہ مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے ملتا ہے، ۱۶ر شعبان ۱۲۴۴ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہمعصر علما سے پڑھ کر شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہو گئے، اور کچھ دنوں کی محنت و جانکاہی میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ اُستاد سے بھی آگے بڑھ گئے،

۱۲۶۹ھ میں خوش قسمتی سے دربار شاہی تک رسائی ہو گئی، ارشاد السلطان و ہدایۃ السلطان دو کتابیں لکھ کر پیش کیں، اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہوئے،

غدر کے بعد ۱۲۷۵ھ میں رام پور گئے، نواب یوسف علی خاں نے قدر دانی فرمائی، ۱۲۸۱ھ میں ... نواب کلب علی خاں[1] مسند نشین ہوئے، اور خوش قسمتی سے امیر کو نواب کی اُستادی

---

[1] نواب کلب علی خاں والی رام پور علم دوست، ہنر پرور اور قدر دان رئیس تھے، ۱۲۸۱ھ میں اپنے والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مسند نشین ہوئے، اور اپنی دانشمندی سے رام پور جیسی چھوٹی سی ریاست میں ایسے ایسے باکمال لوگوں کو جمع کر لیا، جس کی نظیر نہیں، علماء کے گروہ میں علامہ عبد الحق خیرآبادی، علامہ عبد العلی ہندسی، مولانا ارشاد حسین، سید حسن شاہ محدث، مفتی سعد اللہ اور ایسے ایسے نامور فاضل جن سے کسبِ کمال کرنے کو عرب و عجم سے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کا شرف حاصل ہوا،

یہ زمانہ منشی امیر احمد کے عروج و اقبال کا زمانہ تھا، یہ جوہر قابل اور نواب جیسا قدر شناس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۲) شائقین علوم آیا کرتے تھے، اطبا میں حکیم محمد ابراہیم، حکیم علی حسین، حکیم عبد العلی، اور حکیم حسین رضا، جو اپنے زمانہ کے چیدہ اور برگزیدہ لوگ تھے، شعرا میں میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر، میر اسمٰعیل حسین منیر، آفتاب الدولہ قلق، احمد حسن عروج، مرزا رحیم الدین حیا، منشی امیر احمد امیر، نواب مرزا خاں داغ، شیخ امیر اللہ تسلیم، حکیم ضامن علی جلال، جان صاحب ریختی گو، آغا حجو، اور خدا جانے کتنے شاعر، جو اپنے زمانہ میں مشہور و مستند مانے جاتے تھے، یہ سب رام پور کے وظیفہ خوار تھے،

غدر کے بعد دلّی اور لکھنؤ میں جو جس فن کا باکمال تھا، اُسکو رام پور کے سوا کہیں ٹھکانا نہ تھا، سرکاری باورچیخانہ میں ایسے ایسے رکابدار جمع کئے تھے، جن کا مثل ہندوستان میں نہ تھا، داستان گو ایسے ایسے قابل کہ جس وقت داستان گوئی پر آتے تو بات بات میں انعام و خلعت سے سرفراز ہوتے، چوبدار اور مردھے ایسے ادب و آداب اور سلیقے کے کہ دوسری جگہ کے فہمیدہ اور سنجیدہ لوگ اُن کے سامنے بات نہ کر سکتے تھے،

لطیفہ مولوی بشارت اللہ فرزند مفتی سعد اللہ مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بار نواب سر شام سوار ہوئے، جامع مسجد کے قریب سواری پہنچتے پہنچتے نماز کا وقت آگیا، ہوادار سے اُتر کر مسجد میں نماز پڑھی اور آکر پھر سوار ہوئے، چوبدار نے دیکھا کہ پیشانی پر ایک تنکا رہ گیا ہے، جب سوار ہولئے، تو اُس نے بڑھکر یہ آیت پڑھی، "وسیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" نواب نے رومال سے پیشانی صاف کرلی، اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ نواب نے گرد و پیش کیسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا،

مگر یہ بھی سنو! کہ اس چھوٹی سی ریاست میں اتنے لوگوں کی گنجایش کیسے نکالی تھی، یہ جتنے لوگ تھے انکی تنخواہیں بڑی بڑی نہیں تھیں، مولانا ارشاد حسین، مولوی عبد الحق اور منشی امیر احمد کے علاوہ کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی، علاوہ اسکے جو جس کام کا اہل تھا، ویسے وہ کام بھی لیا جاتا تھا، (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

جوہری، ع

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۳) مگر نواب کا رکھ رکھاؤ اس غضب کا تھا کہ جو ایک دفعہ انکے دربار تک پہنچ گیا، وہ پھر دربار مسعود سے نکلنے کا نام نہ لیتا تھا، بات یہ تھی کہ عید بقرعید، سال گرہ اور عام طور پر خوشی کے موقعوں پر لوگوں کو خلعت و انعام ملتے تھے، اور جن سے زیادہ خصوصیت تھی انکی خبرگیری خود نواب رکھتے تھے، انکو معلوم ہوتا کہ مولوی عبد الحق قرضدار ہو گئے ہیں بلا کر حال پوچھتے اور جتنا قرض ہوتا اس سے کچھ زیادہ ہی عنایت فرماتے، تو لوگ بھی داد و دہش کے خوگر ہو گئے تھے، بے ضرورت بھی قرضدار بن جاتے تھے،

حیدرآباد میں نواب مرزا خاں کی دو ہزار روپیہ ماہوار تک تنخواہ ہوئی، اور نواب فصیح الملک خطاب پایا، مگر رامپور کو مرتے دم تک نہیں بھولے، حکیم عبد العلی مرحوم میرے اُستاد تھے، رامپور سے آنے کے بعد واجد علی شاہ نے انھیں یاد فرمایا، ان کے مرتے وقت تک کلکتہ رہے، اسکے بعد بھوپال بلائے گئے، نواب شاہجہاں بیگم جیسی فیاض اور سیر چشم فرمانروا کا زمانہ، دونوں جگہ تنخواہ المضاعف، مگر میں نے انکو دیکھا ہے کہ جس وقت نواب کلب علیخاں کا نام آجاتا، آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے، اور پہروں انہی کا ذکر کرتے،

نواب کی خاص صحبتوں میں مولانا عبد الحق، مولانا عبد العلی، مفتی سعد اللہ، منشی امیر احمد، اور دیگر علما و شعرا حاضر رہتے، مناظرہ کا شوق تھا، علما میں کوئی مسئلہ چھیڑ دیتے اور مزے لیتے، شعر و سخن، الفاظ کی تحقیق اور محاوروں کی صفائی و صحت پر شعرا کی گفتگو سنتے اور خود قول فیصل بیان کرتے،

دینداری کی حیثیت سے دیکھو تو اُس میں شان بے مثالی تھی، نماز روزہ کے پابند، ذکر و شغل کے عادی، زکوٰۃ باقاعدہ ادا کرتے، حج کا سفر جس دھوم دھام سے کیا ہے اسکو زمانہ جانتا ہے، دلی سے حضرت شاہ احمد سعید رح کو تشریف لانے کی تکلیف دی، وہ خود تشریف نہیں لائے، مگر اپنے فرزند ارجمند مظہر شریعت و طریقت حضرت شاہ عبد الرشید علیہ الرحمہ کو بھیجدیا، انکے دست حق پرست پر بیعت کی اور ان کی تشریف بری کے بعد (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

نواب کی زندگی بھر رامپور میں رہے، اور مریں رہے، نواب کی قدر دانی، امیر، منیر، داغ، تسلیم، جلال، اوج، عروج اور بحر کی صحبت، شعر و سخن کے چرچے ایسی باتیں تھیں جو دار السرور

(بقیہ حاشیہ صـ۴۰۴) مرتے دم تک مولانا ارشاد حسین خلف حضرت ممدوح سے اذکار و اشغال کی ورزش کرتے رہے،

حکیم عبد العلی مرحوم فرماتے تھے کہ مرض الموت میں ایک دن مجھ سے فرمایا کہ تم پر میرے جس قدر حقوق ہیں وہ تم جانتے ہو اور میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ تم کس قدر محبت و محنت سے میرا علاج کر رہے ہو مگر جب وقت آجاتا ہے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، اس لئے تم سے صرف ایک کام متعلق کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جس وقت تمکو یہ معلوم ہو جائے کہ میں اب جانبر نہ ہو سکونگا، مجھے فوراً مطلع کر دو، وہ فرماتے تھے کہ میں اس بات کو سنکر سناٹے میں آگیا اور سوچنے لگا کہ میں اس فرض کو کیونکر ادا کر سکتا ہوں، نواب مجھکو فکرمند دیکھ کر سمجھ گئے اور مجھ سے دوبارہ تاکید کی، جب وقت آیا تو میں نے بار بار قصد کیا، مگر زبان نہ اٹھتی تھی، خدا جانے کیونکر ان سے کہا یا وہ خود سمجھ گئے، حکم ہوا کہ مولانا ارشاد حسین کو بلاؤ وہ تشریف لائے تو لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور ان سے فرمایا کہ وقت آپکی ہمت اور توجہ کا ہے، یہ کہکر دونوں مراقب ہو گئے اور اسی حالت میں روح نے جسد عنصری سے مفارقت کی، سچ ہے فقیر آن دنیا خود و عقبیٰ بمرد کے یہی معنی ہیں، سنہ ۱۳۰۴ھ کا یہ واقعہ ہے، چار دیوان ریختہ کے ان سے یادگار ہیں، کلام کا رنگ ملاحظہ ہو

مرے ہی سامنے اغیار کی ہنس ہنس کے باتیں ہوں
مجھی سے ہو پھر الٹا شکوہ میری بدگمانی کا

بجا ہوا تھا جو کچھ چال سے ترا فتنہ
بدل کے رنگ وہی گردش زمانہ ہوا

گالیاں روز تھیں پر ہم نے سنا ہی نواب
اور کچھ شب کو ہوا آپ کا اعزاز نیا

رام پور سے ہٹنے نہیں دیتی تھیں،

نواب کے انتقال کے بعد زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، وہ قدردانی، وہ صحبتیں، وہ اطمینان و فراغت، سب باتیں خواب پریشاں ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں چنانچہ فرماتے ہیں

امیر اب ہم کہاں اور اب کہاں داغ
یہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

سب سے پہلے نواب مرزا داغ حیدر آباد کو سدھارے، ایک مدت تک امیدواری کی جب دربار شاہی تک رسائی ہو گئی تو روز ورود سے اُسوقت تک کی تنخواہ مل گئی،

منشی امیر احمد کو بھی قسمت آزمائی کا شوق ہوا، یہ بھی گئے، مگر وہاں کی خاک دامنگیر تھی چند ہی روز کے بعد ۱۹ جمادی الاولی ۱۳۱۸ھ کو سفر آخرت گوارا کیا،

سچ یہ ہے کہ امیر و داغ اس دور آخر میں فلک شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے، ایک مضمون آفرینی کا دلدادہ تھا تو دوسرا بیان کی شوخی اور معاملہ نگاری پر فریفتہ، امیر کے ہاں نازک خیالی کے ساتھ شکوہ الفاظ کی بھی چاشنی ملی ہوئی تھی، اور مزہ یہ ہے کہ اس میں

(بقیہ اشعار حاشیہ صفحہ ۴۰۵)

دیا ہے بوسہ اسے پھیر لو تو ہم جانیں
یہ دل نہیں ہے کہ لیجاؤ مسکرا کر تم

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دم آخر
رہے گی یاد اُسکو بھی نگاہ واپسیں برسوں

کہتی ہے جس کو فتنۂ محشر تمام خلق
ڈرتا ہوں وہ بھی کوئی تمھاری ادا نہ ہو

اداے ناز سے غمزے سے مسکرانے سے
وہ دل کو لیتے ہیں مل جائے جس بہانے سے

دقت پسندی کو وہ جائز نہیں سمجھتے تھے،

اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ امیر اس فن میں استادِ مسلّم الثبوت تھے، وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے، جو شعر و انشا کے لئے موزوں تھی، انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، اس پر کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ہر جگہ دست و گریباں ہے، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستگی سے لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جوڑتے ہیں، خیالات نازک اور مضامین بلند اس طور پر باندھتے ہیں کہ اس باریک نقاشی پر فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے،

ان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے جو داغ میں نہیں ہے کہ جیسے جیسے یہ بوڑھے ہوتے گئے، کلام میں جوانی کی اُمنگیں بڑھتی گئیں، پہلا دیوان ان کا مراۃ الغیب ہے، بہت ضخیم اس میں سب کچھ ہے، قصائد، دیوانِ ریختہ جس میں لاجواب غزلیں، رباعیاں، قطعات، تاریخیں، مخمس وغیرہ ہیں،

دوسرا دیوان صنم خانۂ عشق ہے، جو ضخامت میں مراۃ الغیب سے کم نہیں، صحتِ زبان صفائی محاورہ اور پختگی کلام میں اس سے بہتر ہے،

تیسرا دیوان محامد خاتم النبیین نعت میں ہے، جو اس لحاظ سے اچھا ہے کہ نعت کا وہ مذموم طریقہ جس میں شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ دیگر انبیائے کرام کے جناب میں گستاخی کا جو پہلو نکلتا ہے، اسکو چھوڑ کر نئی راہ نکالی ہے، مگر افسوس ہے کہ باوجود صحتِ زبان و پختگی کلام کے تاثیر یا سوز و گداز کا کہیں پتہ نہیں، اصل یہ ہے کہ انداز بیان کا جو سانچہ ناسخ و آتش کے زمانے میں تیار ہوا تھا، اُس میں ڈھل کر شعر بامزہ ہو ہی نہیں سکتا، اس سانچہ کو توڑ کر دوسرا سانچہ تیار کر لو تو اُس کی دوسری بات ہے،

اردو نثر میں خیابانِ آفرینش ایک رسالہ جس کی صاف و سادہ عبارت میں جناب رسالتمآب

صلی اللہ علیہ وسلم کے مولود مسعود کا ذکر صحت اور صفائی کے ساتھ کیا ہے، یہ رسالہ اس قابل ہے کہ عورتوں اور بچوں کے نصاب درس میں داخل کیا جائے،

ایک تذکرہ شعرائے رام پور کا انتخاب یادگار کے نام سے بفرمائش نواب کلب علی خاں مرحوم لکھا تھا، اس کی نسبت امیر نے ایک دوست کو خط میں لکھا ہے کہ "اس میں مجھکو حالات تاریخی اور انتخاب اشعار میں ایسی مداخلت ہے، جیسی قلم کو دست کاتب میں"،

ان تصنیفات کے سوا جوہر انتخاب، گوہر انتخاب، مضامین دل آشوب، واسوختوں اور قصیدوں کا مجموعہ، مثنویوں میں نور تجلی، ابر کرم، ایک مسدس نعتیہ جس کا نام ذکر شاہ انبیا ہے، چھپ چکے ہیں،

سب سے بڑی اور مفید تصنیف امیر مینائی کی امیر اللغات ہے، جو افسوس ہے کہ پوری نہ ہوئی، صرف دو جلدیں اس کی الف ممدودہ و الف مقصورہ کی شائع ہوئی ہیں، یہ کتاب پوری ہو گئی ہوتی تو اردو زبان کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا،

نمونہ قصائد

شب دوشینہ جو لی خواب میں میں نے کروٹ
آئی اک حور لقا پاس الٹ کر گھونگھٹ
شعلہ رخسار، جفاکار، قیامت آفت
شوخ عیار، غضب قہر، چھلاوا، نٹ کھٹ
وہ نگاہیں غضب آلود وہ مژگاں کی صفیں
لشکر صبر جنھیں دیکھ کے کھائے گھونگھٹ
پختہ کار اسکو جو دیکھیں طمع خام کریں
ثمر بیش رس حسن میں وہ گدراہٹ
طرفہ چہرہ کی لطافت، وہ سنہری رنگت
دست افشار طلا سے بھی سوا زرہاہٹ
آپ ہی چھیڑ کرے آپ ہی پھر حد سے بڑھے
توسن ناز کو پوئی سے وہ پھینکے سرپٹ
مستی حسن سے گودوں پہ کبھی ڈالدے ہاتھ
نے چھوئے گا وہ لجالو کی طرح جائے سمٹ

پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے کہیں ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ
فتنۂ حشر کو دیکھے تو کہے زلف سے آنکھ لا چھپٹنے میں اُسے دیر نہ کر دوڑ جھپٹ
طاقِ کاکل وہ پھینکتی ہیں کہ سر کی کوئی چوٹ روک لے ہٹ کے تو وہ جھک کے لگائے پالٹ
دیکھکر ابرو پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں پہلواں دو ہیں کہ کشتی میں ہوئے ہیں غٹ پٹ
جلوہ گر مردمِ چشم و صفِ مژگاں سے یہ تھا حور بیٹھی ہے درِ خلد پہ کھولے ہوئے پٹ
بڑھ کے گلبرگ سے بھی وہ کفِ رنگیں نازک غنچے لیں انگلیوں کی کیوں نہ بلائیں چٹ
سینہ آئینہ شفاف شکم چشمۂ حسن موجِ دریائے لطافت شکمِ صاف کی بٹ
غرض اس شکل کی معشوقہ کیا جس کا بیاں نظر آئی تو عجب جی کو ہوئی للچاہٹ
شوقِ دل نے یہ کہا مست ہی پیر بھی عشق پیچے کی طرح جائیے مستی میں لپٹ
ہاتھ دامن پہ پڑا تھا کہ وہ پیچھے سرکی سر قدم تک بھی نہ پہنچا کہ گئی دور وہ ہٹ
چوٹ سی دل پہ لگی ہاتھ گیا جب خالی تازیانہ سے نہیں کم وہ پڑی تیغ چپٹ
ہنس کے ظاہر میں کہا واہ ری ٹھدی کر آپ ہی لطف و کرم آپ ہی یہ جھنجھلاہٹ
چپ ہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد تھی ملاقات کہاں کی کہ یہ تیزی جھلپٹ
ہوش میں آؤ ذرا خیر ہے کیسا ہی مزاج خفقاں سے تو طبیعت میں نہیں گھبراہٹ
میں وہ ہوں جسکی ہوس میں ہیں ہزاروں نامی سیکڑوں مر گئے تھی جنکو مرے نام کی رٹ
ذوقِ وصلت میں ہوئے گور کنارے کتنے شوقِ دیدار میں کتنوں کی گئی آنکھ الٹ
پاؤں کتنوں کے گھسے لی سبو سر پھوڑے بادۂ وصل کی پائی نہ کسی نے تلچھٹ
ناطقہ خانۂ دولت ہے مرا نام صفت میں مکیں ہوں تو مکاں جا زر و سیم سے پٹ
ملہمِ غیب نے بھیجا تو میں آئی ترے پاس ہو گراں تجھکو جو آنا ابھی جاؤں میں پلٹ

وصف تو کرتا ہی جس کا ہیں اسکی ہوں صفت دیکھ اعضا کو ذرا پردۂ غفلت کو الٹ
رائے انور سے اُسی کی مری آنکھوں میں ہی نور خلق اُسکا مرے گیسو میں ہی خوشبو کی لپٹ
صفِ مژگاں سے عیاں پنجۂ پرزور کی شکل عزم اسکا مرے شاہینِ نگہ کی ہی جھپٹ
اُسکی جو راستیِ طبع وہ ہے قد میرا دامنِ فیض کا لٹکاؤ مرے زلف کی لٹ
مصحفِ رخ کو جو دیکھو تو نمایاں وہی شان کعبۂ دل کو جو دیکھو تو اُسی کی چوکھٹ
کون وہ کلب علیخاں بہادر جم جاہ دیتے ہیں جسکو ملک عالمِ بالا کی رٹ

عالمِ خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل شجرِ طور کو جس باغ کی کہیئے کونپل
خواب میں سبزۂ خوابیدہ جو یاں کا دیکھے خواب ہو طالعِ خوابیدہ کا خوابِ مخمل
سامنے اُس کے کسی اور چمن کا کیا ذکر گلشنِ خلد بھی مجکو نظر آیا جنگل
اک شگوفہ تھا اُسی باغ کا باغِ عشرت ایک غنچہ اُوسی گلزار کا گلزارِ امل
ساغرِ عشرتِ کونین وہیں کے دو پھول میوۂ مقصدِ دارین وہیں کے دو پھل
سخت حیراں ہوں کہ دیوار کو دوں کس سے مثال کہوں آئینہ تو آئینہ میں نہیں اتنا دل
دستِ مژگاں سے سنبھالے تھیں نگہ کو آنکھیں پھر بھی دیوار پہ جب چڑھتی تھی جاتی تھی پھسل
خط گلزار سے ہو گل پہ یہ مصرع تحریر نقشِ ثانی ہے یہ فردوس ہی نقشِ اول
ہے یہ تاثیرِ نمو ہاتھ جو مجرم کے کٹیں صورتِ دستِ چنار اُگیں نئے پھر سے نکل
اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیضِ نمو نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل
ٹکڑے بدلی کے نہ تھے ہند و سوسن کے لئے بھر کے آیا تھا وہاں چھاگلوں میں گنگا جل
نوجوانانِ چمن دھوپ میں کیا کمھلاتے چتر کھولے ہوئے پھرتے تھے ہوا پر بادل

لڑکھڑاتا تھا جو مستی میں کہیں پائے نسیم
غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل

ہوگیا لوٹ میں سامان یہ آیا جو نظر
پاؤں کس طرح سنبھلتا کہ گیا دل ہی پھسل

ہے اڑی ہوش مری حیرتِ نظارۂ باغ
آگیا غش مجھے بیہوش گرا سر کے بَھل

متحیر تھا کہ یارب ہے یہ کیسا گلزار
غنچہ ہے تنگ دہن کس سے معمّا ہو یہ حل

گوشِ گل میں ہی ہوائے طرب انگیز بھری
کون سنتا ہے جو پوچھوں میں کہ کیا ہی یہ محل

قمریوں کو نہیں کو کو سے مجالِ گفتار
بلبلوں کو نہیں نغموں سے کسی شاخ پہ کل

تھا اسی فکر سے دریائے تحیر میں غرق
کہہ رہا تھا کہ زہے صنعتِ صنّاعِ ازل

ناگہاں طرفِ چمن میں نظر آیا اک نور
آنکھ نے دل سے کہا دیکھ کے اس کو کہ سنبھل

طرفۃ العین میں وہ روشنی آ پہونچی قریب
کھل گیا دیکھتے ہی اسکو مرے دل کا کنول

دیکھتا کیا ہوں کہ ہے بیچ میں اک حور لقا
کچھ حسیں گرد ہیں آگے ہے فروزاں مشعل

حور وہ حور جسے دیکھے تو فردوس سے حور
مضطرب نعرہ زناں خاک بسر آئے نکل

فرق سے تا بقدم پیکرِ انداز و ادا
غمزہ و ناز سے ڈالے دلِ عاشق کو مسل

گرمیِ حسن سے رخسار بھبھوکا ایسا
شمع کی طرح جسے دیکھ کے دل جائے پگھل

چوکڑی آہوئے مشکیں کو ختن میں بھولے
بال کھولے جو حلب میں وہ دکھائے چھل بل

قطرے کہتے تھے پسینے کے رخِ گلگوں پر
جوش کھا گرمیِ حسن آئی ہے چہرے پہ اُبل

پتلیوں کا جو ان آنکھوں کی تماشا دیکھا
دلِ ناداں مرے پہلو میں گیا اور مچل

تیر پر تیر پڑے دل پہ نگاہیں جو لڑیں
نیمجاں پاؤں پہ اُس کے میں گرا سر کے بھل

اور کی عرض کہ اے عشوہ گر جلوہ فروش
رحم کر رحم بس آگے دلِ مضطر کو نہ چھل

رخِ روشن کی طرح آئینہ تو مجکو کیا
اپنے گیسو کی طرح کر مرے عقدوں کو بھی حل

کون سا باغ ہے یہ کون ہو تو میں ہوں کہاں　　تجھ سے وحشت نہیں یہ اور ہی حیرت کا محل
متبسم ہوا پہلے تو وہ سرمایۂ ناز　　پھر اک انداز سے بولا یہ دکھا کر کس بل
سر اُٹھا پانوں سے یہ بے ادبی خوب نہیں　　اچھی صورت پہ گیا دیکھتے ہی خوب پھسل
ہوش میں آ یہ نہیں قسم نباتات سے باغ　　ہے سراپا چمن صنعتِ خلّاقِ ازل
اُنس کچھ آج نیا تجکو نہیں ہے مجھ سے　　کھا چکا چوٹ مرے حسن کی تو روزِ ازل
نہ پری ہوں میں نہ انساں ہوں نہ غلماں ہوں نہ حور　　پر لطافت میں نزاکت میں ہوں اُن سے افضل
باغ نقشہ ہے صفاتِ حسنہ کا اُس کے　　حسن فطرت میں جو یوسف سے کہیں ہو افضل
(معاذ اللہ)
ہاتھ پھیلائے جو شاخیں زرِ گل دیتی ہیں　　ہے یہ مطلب کہ دہش میں ہو وہ بے مثل و بدل
اشرفی کے جو گلوں کا ہو چمن میں انبار　　یہ اشارہ ہے کہ دولت میں ہو وہ ضرب مثل
جوش رحمت کا ہے اس بحرِ کرم کے شمہ　　اس گلستاں میں جو برساتا ہے پانی بادل
دیکھتا ہے جو رواں نہر میں پانی شفاف　　چشمۂ فیض یہ اُس کا ہے نہیں گنگا جل
پوچھتا ہے جو حقیقت کو مری او ناداں　　طبعِ نازک ترے آقا کی ہوں اے عبد اقل

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو

کہاں وہ اہلِ وطن کی صحبت وطن کو چھوٹے ہوئی ہے مدت　　کسی کسی کی ہو یاد دل میں خیال کچھ ہو کہیں کہیں کا
قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر　　جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

لاکھوں اس لیلیٰ کے دیوانے ہیں اُن میں عشق نے　　اک مشتِ استخواں کا نام مجنوں رکھ دیا

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا
امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ الٹا مرے چاک گریباں کا
جگر کو دوں کہ دل کو دوں بتا اے ناوک قاتل
کہ دو پیاسوں میں ہے یہ ایک قطرہ آب پیکاں کا

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

جب کہا میں نے شب غم کوئی غمخوار نہ تھا
درد نے اٹھ کے کہا کیا یہ گنہگار نہ تھا

ہر جگہ جوش محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا
روکنا فرقت میں اشکوں کا نہیں اچھا امیر
چار دن کے ضبط میں دیکھو تو کیا عالم ہوا

مرغان باغ! تم کو مبارک ہو سیر گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا
ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا میں روز حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخ حرم
آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بتخانہ تھا

دیکھ اے درد جدا ہو نہ دلِ محزوں سے
اور الجھے گا یہ بیمار جو تنہا ہو گا

خواہشِ وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح
دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہو گا
آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی
اور کیا تجھ سے بھرا لے دیدۂ گریاں ہو گا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی گیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا
آنے والا جانے والا بے کسی میں کون تھا
ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا

گل ہوا غنچہ تو آوارہ یہ اُس سے آئی
جمع پھر دل نہیں ہوتا ہے پریشاں ہو کر

ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کے بولتا ہے بہت
ملے وہ اب کی ناصح کو سامنے کر دیں

عمر کو سارا زمانہ گذران کہتا ہے
دن جدائی کا مگر عمر میں محسوب نہیں

کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے لیکن نہال ہوں
کھٹکوں گا اور اپنے عدو کی نگاہ میں

تو نے تو اے سیاہیِ شبہائے تارِ ہجر
دھبہ لگا دیا مرے بختِ سیاہ میں

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسنِ بتاں کے ہیں
پھر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

دنیا ہے طرفہ میکدۂ بےخودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجو مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

وصال پر ہے جو وصل امتحاں کر دیکھو
امیر یوں ہی سہی چند روز مر دیکھو

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

غیروں کے حال پر تو بہت لطف ہیں تمہیں ہم پر بھی لطف حال ہمارا ابھی غیر ہے

مسجد میں بلاتا ہے ہمیں زاہدِ نافہم ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

قدم کو لغزش، زبان کو لکنت، ہے رعشہ ہاتھوں کو، سر میں جنبش
کہاں گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں مجھے پھنسا کر

لگی دل کی بجھائے بیکسی میں کون ہے ایسا مگر اک گریۂ حسرت کہ بیتابانہ آتا ہے

شبِ وصلت قریب آنے نہ پائے کوئی خلوت میں ادب ہم سے جدا ٹھہرے حیا تم سے جدا ٹھہرے

ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جانِ جہاں اسی انداز سے کہدے کہ نہیں تھوڑی سی

چھوڑے کہیں نہ گیسوئے پُرخم نے اسکے پیچ کچھ رہ گئے تو میرے مقدر میں رہ گئے

آنکھ کہتی ہے یہ دل سے کہ کریگی برباد خواہشِ وصل تجھے حسرتِ دیدار مجھے

تھی کھٹک درد کی پہلے سے مرے دل میں مگر تم مرے پاس سے اُٹھے کہ قیامت آئی

ہیں تغافل میں بھی سرگرم ستم وہ آنکھیں
آپ تو سوتے ہیں فتنوں کو جگا رکھا ہے

قاصد یہ زباں اُس کی، بیاں اُسکا نہیں ہے
دھوکہ ہے تجھے اُس نے کہا اور ہی کچھ ہے
آفت تو ہے وہ ناز بھی انداز بھی لیکن
مرتا ہوں میں جس پر وہ ادا اور ہی کچھ ہے

نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی
اِسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے
نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے، نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

قطعہ

محفل برخاست ہے، پتنگے
رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر
تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم
وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو
کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

نواب مرزا خاں داغ

شوخی کہ در کلام اوست بندہ نہ دانم کہ امروز دیگرے را دادہ باشند زبانے کہ اورا بخشیدہ اند فی زماننا ہیچ کس را میسر نیست بیش ازیں ستایش گفتار او چہ تواں گفت خیر الکلام ما قل و دل (از طور کلیم)

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص، نواب شمس الدین خلف نواب احمد بخش خاں

دہلی کے بیٹے تھے، ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ کو دلی میں پیدا ہوئے، چھ سات برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، ماں شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو خلف بہادر شاہ ابوظفر کے گھر بیٹھ گئیں اور شوکت محل کا خطاب پایا،

یہ بھی ماں کے ساتھ لال قلعہ پہنچے، وہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا زوروں پر تھا، بادشاہ اور مرزا فخرو، دونوں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے، یہ بھی استاد ذوق سے مشقِ سخن کرنے لگے، اور ایک عرصہ تک مشاعروں میں ان کے ساتھ جاتے اور دادِ سخن لیتے رہے،

سنہ ۱۲۷۲ھ میں مرزا فخرو نے وفات پائی، ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ سے نکلے، یہ مصیبت کیا کم تھی کہ سنہ ۱۲۷۳ھ میں عالم آشوب ہنگامہ غدر کا برپا ہو گیا، وہ ایک عام مصیبت تھی، ان کو بھی وہی جھیلنا پڑی، جو سب جھیل رہے تھے،

غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد رامپور چلے آئے اور نواب یوسف علیخاں بہادر کی عنایت سے دم لینے کی مہلت ملی، نواب کے بعد اُن کے لائق جانشین نواب کلب علیخاں بہادر کی عنایت نے سرپرستی فرمائی، پھر ان کی زندگی بھر رامپور میں رہے، کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی،

نواب کلب علیخاں کے انتقال کے بعد حیدرآباد گئے، کئی برس امیدواری میں بسر ہوئی، آخرکار قسمت نے یاوری کی، پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے اور روزِ ورود سے اس وقت تک کی تنخواہ مل گئی، چند روز کے بعد ایکہزار روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا دو دن اس سے مرتے دم تک اعلیحضرت محبوب[1] علیخاں آصفجاہ ششم کی مصاحبت میں زندگی بسر کی، اور

---

[1] میر محبوب علیخاں فتح جنگ نظام الدولہ نظام الملک مظفر الممالک آصفجاہ ششم (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بیش قرار صلوں کے علاوہ سپہ سالار، یار وفادار، مقرب السلطان، بلبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک کا خطاب پایا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۸) نواب افضل الدولہ میر تہنیت علی خاں آصفجاہ پنجم کے بیٹے تھے، ۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، ۱۳ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ میں باپ نے سفر آخرت اختیار کیا، دستور کے موافق محل سرا اور شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور آصف جاہ ششم کی حکمرانی کی منادی کی گئی، اس کے بعد مرحوم کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی، اور فاتحہ سوم کے بعد تخت نشینی کے رسوم ادا کیے گئے،

نواب شمس الامراء امیر کبیر بہادر نائب حضور اور نواب مختار الملک سالار جنگ اول مدار المہام قرار پائے، سالار جنگ اول نے جس خوش اسلوبی سے ملک و دولت کا انتظام کیا وہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا،

اعلیٰحضرت میں فرزانگی و دانشمندی کے آثار نمایاں، ذہن و ذکاوت خداداد تھی، مولوی محمد زماں خاں شہید، مولوی مسیح الزماں خاں، مولوی الہ داد اللہ خاں، مولوی اشرف حسین، مظفر حسین، خوشنویس مرزا نصر اللہ خاں، مسٹر کلارک، سرور جنگ، افسر جنگ اور منو خاں، علوم و فنون، شہسواری، نشانہ بازی وغیرہ کی تعلیم پر وقتاً فوقتاً سرفراز ہوئے، اور اعلیٰحضرت نے تھوڑے زمانے میں بہت سی چیزوں میں دستگاہ حاصل کر لی،

سنہ ۱۳۰۰ھ میں سر سالار جنگ اول نے وفات پائی، راجہ نریندر پرشاد ان کی جگہ مدار المہام ہوئے، ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۱ھ میں اعلیٰ حضرت نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور لارڈ رپن ویسرائے و گورنر جنرل ہندوستان نے حیدر آباد جا کر گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے کمر میں تلوار باندھی، نواب لائق علی خاں سالار جنگ دوم نے مدار المہامی کا جائزہ حاصل کیا، اور اسی سال کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی، اعلیٰ حضرت میں بعض صفتیں غیر معمولی تھیں، سب سے مقدم ان کی بے نظیر فیاضی اور سیر چشمی ہے جس نے برامکہ کی فیاضی اور سخاوت کو افسانہ کر دیا، ہندوستان کا کوئی گوشہ مشکل سے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

نواب مرزا خاں داغ، حریف، ظریف، خوش طبع، رنگین مزاج، زبان میں فصاحت و سادگی، بیان میں شوخی اور بانکپن، کلام کو دیکھو فصاحت اور محاورے کا دریا بہہ رہا ہے، حسن و عشق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۹) ایسا ملے گا جہاں اُن کی داد و دہش کا فیض نہ پہونچا ہو، دور دراز مقامات پر بھی خانقاہیں، مدرسے اور مسجدیں اب تک ان کے احسانات کی منت پذیر ہیں، اور خاص کر دکن کے مندر اور دیول بھی آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہیں،

دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد ارباب فضل و کمال کا ملجا و ماوٰی صرف اعلیٰ حضرت کی سرکار تھی، جہاں سے ہر ایک کے فراخور حال تنخواہیں ہو گئی تھیں، مولانا کرامت علی صاحب سیرۃ احمدیہ، مولینا حیدر علی صاحبِ منتہی الکلام، مولینا عبد الحلیم فرنگی محلی، مولوی محمد حسن نیوتنی، مولوی امین الدین خاں خلف علامہ رشید الدین خاں، مولانا محمد لطف اللہ صاحب، مولوی وحید الزماں خاں، مولوی محمد زماں خاں، مولوی مسیح الزماں خاں، مولوی مہدی علی، مولوی مشتاق حسین، مولوی سید حسین، مولوی سید علی، مولوی نظام الدین حسن، مولوی نذیر احمد، مولوی عزیز مرزا اور خدا جانے کتنے جوہر قابل وہاں جا کر مناصبِ عالیہ پر فائز ہوئے،

مولانا عبد الحی لکھنوی، مولانا عبد الحق خیرآبادی، مولانا عبد الحق دہلوی، مولانا عبد الحی کانپوری، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، دو چار ہوں تو کوئی ان کا نام گنا سکتا ہے، سیکڑوں اربابِ کمال تھے جن کے دامنِ فیض سے ایک عالم تربیت پا رہا تھا، اور وہ صرف اسی سرکار کی بدولت فارغ البالی سے گھر بیٹھے علمی خدمتیں انجام دے رہے تھے، اور سیکڑوں میل سے بیش قرار تنخواہیں اُن کو گھر بیٹھے مل رہی تھیں،

دوسری غیر معمولی صفت اُن کی بے خطا نشانہ بازی تھی، شاہزادہ جرمنی اور ولیعہد روس (بعد کو شہنشاہ روس) سے جس وقت نشانہ بازی میں سابقہ ہوا تو وہ اُن کی (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات، گویا اُس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں، جس کو سنکر عوام سر دھنتے ہیں اور خواص مزہ لیتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صـ ۴۲۰) قدر اندازی کو دیکھکر محو حیرت ہو گئے۔ اور ان کو ماننا پڑا کہ یہ اس فن میں بھی فرد فرید ہیں، اپنی تھوڑی سی زندگی میں ہزارہا خونخوار شیر شکار کئے، اور ایسے صعب و دشوار گذار مقامات میں پہنچے جہاں بڑے بڑے دلیروں کے بھی چھکے چھوٹتے تھے،

تیسری صفت اُن کی جفاکشی اور محنت تھی، باوجود تنعم اور نازپروری کے جب کسی کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کے سوا اور کوئی کام پیش نظر نہیں، اہل کار اور مصاحبین تھک کر چور ہو جاتے تھے، اور وہ تازہ دم اُسی کام میں لگے رہتے، آفتاب کتنے بار طلوع و غروب کرتا مگر وہ اُس کام سے ہاتھ نہیں کھینچتے تھے،

چوتھی صفت رحمدلی اور رعایا پروری تھی، آج رعایا ان کو یاد کرتی ہے اور روتی ہے، جس کو ملک بدر بھی کیا، تو اُس کی زندگی بھر کی آسایش کا انتظام اوّل کر دیا، فرماتے تھے کہ پیٹھ کی مار دو پیٹ کی مار مت دو،

پانچویں صفت خاصان حق کی خدمت میں عقیدت و نیازمندی تھی،

چھٹی صفت سادہ زندگی،

ساتویں صفت خودداری تھی، جس کی وجہ سے باوجود رحمدلی و بے آزاری کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے تھے

مگر افسوس ہے کہ با ایں ہمہ ذہانت و ذکاوت بعض خودغرضوں نے اُنکو جام و ساغر پر لگا دیا تھا جس کی وجہ سے یہ خداداد قوتیں یہاں تک کہ اُن کی صحت جسمانی کمزور ہوتی گئی اور عمر طبعی تک پہنچنے سے پہلے اُنھوں نے ۴ رمضان سنہ ۱۳۲۹ھ کو وفات پائی،

ان کو شعر و سخن کا بھی شوق تھا، اکثر درباروں کی اسپیچیں بھی نظم میں ارشاد (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حسنِ اتفاق سے زمانہ بھی ان کو اچھا ملا، شاعری کا آغاز لال قلعہ سے جو اردوئے معلیٰ کا گہوارہ تھا، اور اس کے شباب کا زمانہ نواب کلب علی خاں مرحوم جیسے قدردان کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوا، گلزارِ داغ، آفتابِ داغ دو دیوان، ایک مثنوی فریادِ داغ اسی زمانے کی کمائی ہے، حیدرآباد میں تیسرا دیوان مہتابِ داغ تیار ہوا، مگر اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسافر بڑی بڑی منزلیں طے کر کے تھک کر کسی مقام پر بیٹھ گیا ہے، رامپور میں اسیر، امیر، بحر، جلال اور تسلیم کا جمگھٹا تھا، خود نواب سخن گو و سخن سنج، کلام کی نوک پلک کے دیکھنے اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے میں مشاق، اس وقت طبیعت پر غیر معمولی زور ڈالنے کی ضرورت تھی، ذرا چوکے تو ٹکسال باہر، حریفوں سے دادِ سخن لینا ہنسی کھیل نہیں تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۲) فرماتے تھے، جو کلام اُن کی طرف منسوب ہے اُس میں سے چند شعر ملاحظہ ہوں،

اے یاس تو نے داغ تمنا مٹا دیئے
گلزار تھا یہ دل اُسے ویرانہ کر دیا

ایسے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نہ کریں
مرد جو کہتے ہیں وہ کر کے دکھا دیتے ہیں

جھگڑے تو ہزاروں ہیں مگر بات ہے اتنی
ہم تم سے وفا کر کے پشیمان بہت ہیں

ہوا بھی ہم اسیروں تک نہیں آتی جو یہ پوچھیں
فضائے باغ کیسی نکہت گلزار کیسی ہے

نہ کرو کسی سے محبت یہ ہم نہ کہتے تھے
دلِ فریفتہ سنتا ہے تو بھلا کس کی

برخلاف اس کے حیدرآباد عیش و عشرت کا گہوارہ، کاوشِ فکر جو شاعری کا جزوِ اعظم ہے، مفقود، وہاں جا کر طبیعت بجائے محنت کش ہونے کے عشرت پسند ہو گئی، کچھ جوانی کی امنگیں بھی رخصت ہو چکی تھیں، ان سب وجوہ سے کلام پھیکا پڑ گیا، اور آخرکار ۶ ذی الحجہ سنہ ۱۳۲۲ھ میں زبان تک بند ہو گئی، مرنے کے بعد یادگارِ داغ اور ضمیمہ یادگارِ داغ کے نام سے دو مجموعے اُن کے کلام کے اور شائع ہو گئے ہیں،

غزلوں کے منتخب اشعار

ستم وہ چشمِ کافر سے تری چلنا اشاروں کا
غضب وہ دل پکڑ کر بیٹھ جانا بے قراروں کا
خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں اس میں
پھپھولوں سے مرے سینہ پہ عالم ہے مزاروں کا

ہو کے ظاہر تو کیا عشق نے اک حشر بپا
حسرت اُس دل پہ کہ جس دل میں یہ پنہاں ہوگا

عشق کیا شے ہے یہ وہ شے ہے کہ دل میں شوقِ وصل
خون ہو کر آگیا، غم بن گیا، سم ہو گیا

اک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے آزار تنگ
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

لئے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمھیں بھی اُس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

مری تقدیر کی برگشتگی سب میں بری ٹھہری
حسینوں کے لئے اک حسن ہی برگشتہ مژگاں کا
بہت ہیں آنکھیں فرشِ راہ چلنا دیکھ کر ظالم
کفِ نازک میں کانٹا چبھ نہ جائے خارِ مژگاں کا

ڈوب کر سینہ میں اس رنگ سے پیکاں نکلا
دل سے بیساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا

دل میں نے دیکر رکھا تھا ایک قطرہ خون کا
کچھ نیازِ غم ہوا، کچھ صرفِ مژگاں ہو گیا
بوسہ لیکر دل دیا ہے اور پھر نالاں ہیں داغ
کوئی جانے مفت میں حضرت کا نقصاں ہو گیا

وہ مرا چھیڑنا آغازِ اُلفت میں شکایت سے
وہ رکھ کر ہاتھ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا

ترے دستِ حنائی میں بھی ہے چھد
کسی کو ہاتھ کا سچا نہ پایا،

وصل میں ہائے وہ اترا کے مرا بول اٹھنا
اے فلک دیکھ تو یہ کون مرے گھر آیا

عرضِ وفا پہ دیکھنا اُس کی ادائے دلفریب
دل میں کچھ اعتبار سا، آنکھ میں کچھ ملال سا

نومید کرم ہوکیں ہم سے کریں توبہ
دوزخ میں پڑے زاہد بے لطف ثواب ایسا

وعدہ یہ مرے اُن کے قیامت کی ہی تکرار
اور بات ہی اتنی کہ اُدھر کل ہی ادھر آج

جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ گری ہی پڑتی ہے بیمار ناتواں کی طرح

اے شیخ جس کو جو نہ ملے گا بڑھے گا شوق جنت کو میں پسند جہنم کو تو پسند

عمر کیونکر نہ بسر کیجئے غافل ہو کر کہ ملا ہے ہمیں اک قطرۂ مے دل ہو کر

بزم اغیار کا ظاہر ہے اثر آنکھوں پر مہرباں آنکھ کی خفت مرے سر آنکھوں پر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

دل میں سما رہی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

مجھ کو تباہ چشم مروت نے کر دیا مل جائے تو چرا دوں کسی کی نظر کو میں

کس سے وعدہ ہے جو گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں یہ وہ گردش ہے کہ میرے بھی مقدر میں نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں اگر آگ نہ لگا دوں تو داغ نام نہیں

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہی
وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی رونا ہے الفت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہی

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گذار دے

دنیا میں جانتا ہوں کہ جنت ملی مجھے
راحت اگر ذرا سی مصیبت میں مل گئی

ہزار بار جو مانگا کروں تو کیا حاصل
دعا وہی ہے جو دل سے کبھی نکلتی ہی

ایک تو حسن بلا اُس پہ بناوٹ آفت
گھر بگاڑیں گے ہزاروں کے سنورنے والے
خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اُترنے والے

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

نہیں آتا تجھے گر اے تمنا
نکلنا سیکھ لے جانِ حزیں سے

مرگِ دشمن کی دعا مانگ کے پچھتاتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو وہ غیر کے ماتم میں رہے

وقتِ خرامِ ناز دکھا دو جدا جدا
یہ چال حشر کی، یہ روش آسماں کی ہے

تیرے جلوہ کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

سید ظہیر الدین ظہیر

ظہیر الدین نام، ظہیر تخلص، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے، ان کے والد ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ کے خوشنویسی میں استاد اور دربار شاہی سے صلاح الدولہ مرصع رقم خان بہادر" کے خطاب سے سرفراز تھے،

بارہ سال کے سن میں فارسی کی درسی کتابیں اور عربی کی مختصرات پڑھنے پائے تھے کہ "قور بیگی" کے عہدے پر سرفراز ہو گئے، اور پڑھنا چھوٹ گیا، چند روز کے بعد کارگذاری کے صلہ میں "راقم الدولہ" کا خطاب پایا، تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار تھی، وہی قائم رہی،

شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی، مکتب ہی میں کچھ غوغاں کرنے لگے تھے، اتفاق سے ان کے مکان کے قریب قطب الدین مشیر شاگرد شاہ نصیر نے اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا تھا، یہ بھی اس میں آنے جانے لگے، اور جب زیادہ شوق بڑھا تو شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہو گئے، اس وقت ان کا سن چودہ برس کا تھا،

غدر ۵۷ء میں ناچار دہلی سے نکلنا پڑا، جھجر، سونی پت، اور نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے، یہاں سے لکھنؤ کا قصد تھا کہ معلوم ہوا کہ وہاں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، مجبور ہو کر کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رامپور چلے گئے، وہاں چار برس رہے، اس کے بعد دہلی آئے اور محکمۂ جنگی میں

ملازمت مل گئی،

چنگی میں زیادہ دنوں نہیں رہے تھے کہ اخبار جلوہ طور (بلند شہر) کی اڈیٹری مل گئی، یہ اخبار مہاراجہ شیوداں سنگھ مہاراجہ کی نظر سے گذرتا تھا، وہ نہایت ہنرپرور رئیس تھے، اُن کو الور بلا بھیجا، چار برس الور میں رہے، علاوہ تنخواہ کے تقریبوں میں قصائد کا صلہ بھی عنایت ہوتا تھا جس سے بہت اچھی طرح ان کی گذر اوقات ہوتی جاتی تھی، مگر بدقسمتی سے مہاراجہ کے بعض بدخواہوں نے جھوٹی سچی شکایتیں کرکے مہاراجہ کے اختیارات سلب کرا دیئے، یہ یہ مجبور ہوکر پھر دلی آئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش لے کر جے پور گئے، سفارش کا یہ اثر ہوا کہ محکمۂ پولیس میں ان کو جگہ مل گئی،

کم و بیش انیس برس جے پور میں رہے، مہاراجہ رام سنگھ والی جے پور کے مرنے پر ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا، چند روز پریشانی میں بسر ہوئی تھی کہ نواب احمد علی خاں رونق خلف نواب میر خاں مرحوم نے ان کو ٹونک بلا بھیجا، جب تک رونق زندہ رہے، یہ بہت آرام سے ان کے ساتھ رہے، ان کے مرنے پر نواب ابراہیم علی خاں بہادر فرمانروائے حال نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، اس طریقہ سے پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے،

آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق پیدا ہوا، ٹونک سے رخصت لیکر حیدرآباد چلے گئے اور آٹھ مہینہ تک باریابی کی تمنا میں وہیں پڑے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ٹونک سے جو کچھ ان کو ملتا تھا، وہ بند ہو گیا،

حیدرآباد میں آٹھ مہینے کے بعد باریابی ہوئی اور ہر تقریب پر قصیدے بھی پیش ہوئے مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا،

بیکاری کے زمانہ میں مہاراجہ کشن پرشاد نے ایک سال بعد چالیس روپیہ ماہوار

مقرر کر دیئے تھے، راجہ بھگوان سہائے اور نواب محمد عمر خاں تونا بھی کچھ کچھ خدمت کرتے رہتے تھے،

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دیوان ان کا جس کا نام گلستانِ سخن ہے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ گیا ہے، دیوان دوم و سوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا ہے، معلوم نہیں چھپا یا نہیں، دیوان چہارم جس میں بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ، بہت سے قصیدے اور مسدس شامل ہیں، ان کے نواسہ کے پاس ہے،

کلام کے متعلق حسرت موہانی کی رائے سے مجھے اتفاق ہے، اس میں بجائے ذوق کے مومن خاں کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے، ذوق کے کلام کی ممتاز خصوصیت کلام کی پختگی، محاورہ کی صفائی اور زبان کی درستی کے ساتھ تعقید الفاظ کا عیب بھی ہے، جو ظہیر کے یہاں نہیں پایا جاتا،

مومن خاں کے یہاں شاعری کا مدار خیال کی نزاکت، ترکیب فارسی کی خوبی اور اسلوب بیان کی جدت پر ہے، جو ظہیر کی شاعری کا سرمایۂ ناز ہے، چنانچہ خود ظہیر نے جا بجا اس کا اعتراف کیا ہے،

طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جبتک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

دوسری جگہ فرماتے ہیں،

کیا بنا ہی طرز مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

جہاں کہیں نزاکت خیال اور جدت اسلوب کے ساتھ الفاظ کی رنگینی اور ترکیب کی تازگی کی خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں تو مرزا نسیم کی طرح دلپذیری کی شان ان کے کلام میں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں کہیں استاد کا رنگ ہے، وہاں مرزا داغ اور اُن کے کلام میں فرق کرنا دشوار ہے، غرض کہ مجموعی حیثیت سے ظہیر کی شاعری دلی کی اصلی اور قدیم شاعری کا ایسا نمونہ ہے، جس کی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام میں نہیں مل سکتی،

نمونہ ملاحظہ ہو،

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا   نگاہِ شرمگیں سے ہیں نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا
دلِ خوں گشتۂ حسرت نے کیا کچھ گل کھلائے ہیں   بہار آگیں ہو کچھ اب کی برس فصلِ خزاں کیا کیا
تصور میں وصالِ یار کے سامان ہوتے ہیں   ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا۔
قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے   بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا۔

بہت ظہیر کو ہم یاد کرکے واں روئے   کہیں جو ذکرِ حریفانِ بادہ خوار آیا

اک مشغلہ ٹھہری ہے تمھیں رنجشِ بیجا   اک کھیل ہوا تم کو ستانا مرے دل کا

بیخود ہوں تصور میں کسی برقِ ادا کے   سرمایۂ تسکیں ہے تڑپنا مرے دل کا

اعجازِ دلفریبیِ انداز دیکھنا   ہر ہر ادا پہ مجکو گمانِ نظر رہا
قاصد بھی کوئی صبرِ دلِ ناشکیب تھا   آتے ہی آتے راہ میں کمبخت مر رہا
پرہیزِ عشق سے مجھے وحشت فزوں ہوئی   میں کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا

بات کیا اُن سے کروں ان کو اُٹھاؤں کیونکر   مدعی بیچ میں دیوار بنے بیٹھے ہیں،
کیا بُری شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ   جرمِ ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں،
وہ ہیں اور غیر ہیں اور عیش کے سامان ظہیر   ہم الگ سب سے گنہگار بنے بیٹھے ہیں،

ہے مرے گھر پہ ابھی سے تیرگی چھائی ہوئی
گو ابھی شام شب ہجراں سحر سے دور ہے

کہیے تو کہوں انجمن غیر کی روداد
کیا اب بھی اسے آپ کرامت نہ کہیں گے

یہ شوخی ہے کہ تمکین ہے الٰہی کیا قیامت ہے
اُلجھتے ہیں دم رفتار سو سو بار دامن سے
اُلجھ کر خار دامن سے مرے کیا کیا پشیماں ہیں
کہ اب دامن چھڑانا ہو گیا دشوار دامن سے

مرزا قربان علی سالک

قربان علی نام، سالک تخلص، نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے، حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور دلی میں نشو و نما پائی، اور فارسی کی درسی کتابیں وہیں کے ارباب فضل و کمال سے پڑھیں، مومن و غالب بقید حیات تھے، اس زمانہ میں شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا، ان کو بھی اس کا شوق ہوا پہلے بطور خود کچھ کہتے رہے، اس کے بعد حکیم مومن خاں کی خدمت میں پہونچے، اُس وقت قربان تخلص کرتے تھے، غالباً خاں صاحب کے مرنے پر مرزا غالب کے یہاں رسائی پیدا کی اور سالک تخلص اختیار کیا،

خوش مزاجی اور شگفتہ روئی کے ساتھ خدا نے ان کو ذکاوت ایسی عنایت فرمائی تھی کہ چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں یہ اپنے معاصرین سے بہت بڑھ گئے، اور مرزا غالب کے شاگردوں میں سب سے بہتر نظر آنے لگے،

۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامہ کے بعد الور میں جا کر پناہ لی، اور خوش قسمتی سے وکالت کے عہدے پر سرفراز ہو گئے، ایک عرصہ تک وہاں رہنے کے بعد اپنا مسقط الراس یاد آیا،

اور حیدر آباد چلے گئے، وہاں محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ داری کے عہدے پر تقرر ہو گیا، اسی خدمت پہ زندگی بسر کر دی،

حیدر آباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک وقت الشیوع رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکالا، جو اُس زمانہ میں ناظم سررشتہ تعلیم تھے، یہ رسالہ عرصہ تک جاری رہا اور اُس میں بہت کار آمد تاریخی مضامین نکلا گئے،

ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۲۶۱ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، اور حیدر آباد میں مدفون ہوئے، ہنجار سالک دیوان کا نام ہے،

یوں عمر گذاری تری فرقت میں کہ ہر دم　　جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی　　بے وفا تو بھی اسے لے کے پشیماں ہوگا

نہیں اکبار بھی اب سننے کی طاقت دل میں　　پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

میرا ہوا آشیانہ اور آدھا جلا ہوا　　بجھ بھی گئی تھی آگ تو بجلی کو کیا ہوا

تم غیر کے ہوئے تو رہا کیا جہان میں　　گویا ہمارے واسطے کچھ بھی بنا نہ تھا

کچھ ہو پہ اُن کو جانب اغیار دیکھنا　　اک بار منع کیجے تو سو بار دیکھنا

گرے ہیں چشم خلائق سے خاک ہو کر ہم
ستم سے تم نے کیا کس طرح جہاں اپنا

اپنی ستم کشی کا مجھے امتحاں ہے اب
درکار ایک اور نیا آسماں ہے اب

اب تک بھی میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہوئے
سالکت کا حال رات کو ایسا سنا کہ بس

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں بجا
میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

کاش اے سپہر تجھ سے بھی رکھتے تو سہل تھیں
وہ خواہشیں کہ رکھتے ہیں اُس بیوفا سے ہم

تم آگئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون
آج اپنے گھر میں ہی کچھ میہماں سے ہم

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

اعتبار نگہ ناز ہے کیا کیا اون کو
قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

اے خضر اتنے دن ترے کیونکر بسر ہوئے
ہم سے تو رات کٹ نہ سکی انتظار کی

ہوں وہ خود رفتہ کہ کیا جانے کہاں دل کھویا
یاد آتا ہے تو اتنا کہ نہیں یاد مجھے

جانے دے اے تصور جاناں نہ کر تلاش   ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے

پہنچ مزار میں بھی وہی اضطراب ہے   دل ہے کہ اک فرشتۂ قہر و عذاب ہے
پہنچے عدو کے گھر ہیں تو دامن جھٹک دیا   ہم خاک بھی ہوئے ہیں تو مٹی خراب ہے

صیاد اور بند قفس سے کرے رہا   جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

میر مہدی مجروح

میر مہدی مجروح، خلف میر حسین فگار، دلی کے رہنے والے اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کے منظور نظر و تربیت یافتہ تھے، وہ زمانہ آنکھوں سے دیکھا تھا، جب کہ میر نظام الدین ممنون مفتی صدر الدین خاں آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، شیخ ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں وغیرہ ارباب فضل و کمال بقید حیات تھے، اور ان کے نتائج فکر سے مشاعروں میں زندگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں تھے،

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہ بھی خانماں آوارہ ہو کر مدتوں پانی پت میں رہے، جب دلی میں امن و امان قائم ہو گیا تو واپس آئے، مگر وہاں کیا دھرا تھا، ناچار گھر سے نکلے اور کچھ دنوں مہاراجہ شیودان سنگھ رئیس الور کی قدر دانی سے الور میں رہے تھے کہ وہاں بھی بدقسمتی نے رہنے نہ دیا، اخیر زمانہ میں قسمت نے یاوری کی اور نواب حامد علی خاں رئیس رامپور کی عنایت و مہربانی سے زندگی کے آخری لمحے کسی قدر راحت سے بسر ہوئے،

۱۳۱۹ھ میں ایک دیوان مرتب کر کے مظہر معانی کے نام سے چھپوایا ہے، جس میں قصائد

غزلیں، رباعیاں، مخمس، ترکیب بند وغیرہ اصنافِ سخن موجود ہیں،

مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ ہے، چھوٹی چھوٹی بحروں میں اکثر غزلیں لکھی ہیں، جن میں محاوروں کی چاشنی زیادہ پائی جاتی ہے، مگر اسالیبِ کلام میں جدت و تازگی نہیں ہے، انہی مضمونوں کو جنہیں متوسط طبقہ کے شعرا نے اپنی مخصوص زبان و طریقۂ بیان میں ادا کیا ہے، یہ بھی کلام میں لائے ہیں، مگر بعض جگہ نزاکتِ خیال کی دلفریبی نبھ نہیں سکی، معمولی بات چیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ کلام میں پختگی کے لوازم اچھی طرح پائے جاتے ہیں،

عودِ ہندی میں مرزا غالب کے ان کے نام بہت سے خطوط ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں، ان کے ایک ایک فقرے سے پیار و محبت کی تراوش ہوتی ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں

"میر مہدی! جیتے رہو، آفریں صد آفریں اردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، مجھ کو رشک آنے لگا، سنو دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے، یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت ہے، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔"

سخت مضطر دلِ ہنگامہ طلب ہے یارب
آج ہی کیوں نہ وہ ہو جائے جو فردا ہوگا

کبھی چشمِ خمار آلود کی مستی نہیں دیکھی
بجا ہے حضرتِ ناصح کو دعویٰ ہوشیاری کا

ساقی کی چشمِ مست کا گر دور ہے یہی
زاہد کو آج کل ہی میں میخوار دیکھنا

نہ کچھ عرض تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا   میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

اچھا ہوا محفل میں مجروح نہ کچھ بولا   وہ حال اگر کہتا تو کس سے سنا جاتا

نہ سوجھتی ہے رہائی نہ موت آتی ہے   نہ مہربان ہے قسمت نہ مہرباں صیاد

اس جہاں میں نہیں جز رنج مآلِ شادی   گرتے ہیں خاک میں گل شاخ پہ خنداں ہو کر

ہوائے گل ہے اب نے شوقِ پرواز   یہ تھے سارے بکھیڑے بال و پر تک

کوئی لخت دل آکے اٹکا ہی کیا   کھٹک سی ہے کچھ چشم پر آب میں

کسی نے کوٹ کر بجلی کو شاید بھر دیا دل میں   نئے ڈھب کی تڑپ ہے کچھ ہماری جانِ مضطر میں

تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق   خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں

جو درد دل کی ہے لذت وہ دل ہی جانتا ہے   یہ دل لگی کی ہیں باتیں کہ بیقرار ہوں میں

اب ہم ہیں اور کنج قفس کی صعوبتیں   وہ نغمہ سنجیاں وہ نشاطِ چمن کہاں

دل ہی سمجھے ہے کچھ تڑپ کر مرے   برق کو لطف اضطراب کہاں

یہ بھی کچھ جی میں آگئی ہوگی   کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں
طور جس آگ نے جلایا تھا   ہم وہ دل میں چھپائے بیٹھے ہیں

ملتی ہے اُس کی وضع زبس خوئے یار میں   آئے نہ کیوں مزہ ستم روزگار میں
سوز دروں نے مجکو کیا نخلِ آتشیں   شعلے بھرے ہوئے ہیں مرے برگ و بار میں
کب دیکھیں چاک جیب سے فرصت ملے ہمیں   دستِ جنوں کا دھیان ہے اک ایک تار میں
گل سے تو لاکھ مرتبہ بہتر ہے روئے یار   بلبل پہ کیا ہے میں تو یہ کہہ دوں ہزار میں

مرے کس کام کا ہے بخت خفتہ   اسے رشوت میں دونگا پاسباں کو

تھا بُرا مجروح پر اتنا نہیں   جس کے مرنے کی مبارکباد ہو

رہے شکوہ سنج ستم ہم سدا   کبھی آسماں کے کبھی یار کے

واں ستم تک دریغ ہے ہم سے   یاں تو قصے ہیں عنایت کے
دل کو کوئی بچا سکے کیونکر   اس کے انداز ہیں قیامت کے

کچھ ان بن ہو چلی ہے باغباں سے
بس اب نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

مشکل ہے وصل میں بھی تلافی فراق کی
پہلو میں گر یہی دل حسرت مآب ہو

سوزِ غم سے نہ دل بجھے جب تک
سوزشِ عشق کا مزا کیا ہے

صبر کے فائدے بہت ہیں ٹلے
دل ہی بس میں نہ ہو تو کیا کیجے

کوئی ہمنوا ہے نہ یادِ آشیاں
جو چھوٹے بھی ہم تو کدھر جائیں گے
یہ اہلِ عدم اور ہم میں ہے فرق
گئے وہ تو ہم ٹھہر کر جائیں گے

عاشق نہ سمجھے تو وہ منھ کو نہ چھپاتے
کھویا دلِ بیتاب نے وہ لطفِ نظر بھی

ہم لوگوں میں ہو ربط نہ باہم تو عجب کیا
جب گرم نہ صحبت رہی موسیٰؑ و خضرؑ کی

جز غمِ مرگِ دوستاں اے خضرؑ
کیا دھرا عمرِ جاودانی میں

حکیم ضامن علی جلالؔ

ضامن علی نام، جلال تخلص، حکیم اصغر علی داستاں گو کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے

تھے سنہ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، غدر سے پہلے لکھنؤ کچھ اور ہی لکھنؤ تھا، عیش و نشاط کی گرم بازاری کے ساتھ ہر علم و فن کے ارباب فضل و کمال کا بے نظیر مجمع جن کے فیضانِ صحبت سے یہاں کا معمولی سے معمولی آدمی بھی دوسری جگہ کے قابل اور لائق لوگوں سے تقریر کی روانی اور شستگی میں بہتر نظر آتا تھا، اُس کی باتیں سن کر کبھی اس کا گمان نہ ہوسکتا تھا کہ اُس نے درسی کتابیں نہیں پڑھیں،

جلال اُسی زمانہ کے آدمی تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، فارسی کی درسی کتابیں اُس زمانہ کے رواج کے موافق پوری پڑھیں، عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے ہی تھے کہ شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، امیر علی خاں[1] ہلال کے پاس آنے جانے اور اپنا کلام دکھانے لگے، ایک عرصہ تک انہی سے مشقِ سخن کی چونکہ ان میں قابلیت اور مناسبت فطری موجود تھی، چند ہی روز میں اُس نے اپنا رنگ دکھایا، جب ہلال نے ان کے کلام اور اپنی اصلاح کا اندازہ کرلیا تو خود انہیں اپنے استاد میر علی اوسط رشک کے پاس لے گئے، یہ کچھ عرصہ تک اُن سے مشقِ سخن کرتے رہے، جب وہ کربلائے معلّیٰ چلے گئے تو مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے، اور کثرتِ مشق سے کلام میں رنگ پیدا ہوگیا،

---

[1] امیر علی خاں ہلال پسر تراب علیخاں باشندۂ لکھنؤ میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے، غزلوں کا دیوان مقفیٰ و مردف، مثنوی اور سراپا ان کی تصنیفات میں بیان کیجاتی ہے، واجد علی شاہ کی سرکار میں ان کا نو تھا، انہی کے ساتھ کلکتہ گئے، نمونہ کلام کا یہ ہے،

مجھ سے الگ جو دفن یہ ہوتا تھا خوب تھا
پہلو میں میری قبر کے بنتا مزارِ دل

بڑھ بڑھ کے کیا ہی وار لگائے ہیں جی میں ہے
ہاتھوں کے بدلے چوم لوں اُس تیغ زن کے پاؤں

یہ ہاتھا پائی بھی کہیں دیکھی سنی نہیں
لاتوں کے ساتھ آپ کی چلتی ہیں کہنیاں

غدر ۵۷ء کے بعد رامپور چلے گئے، اُس وقت ان کا سن بائیس برس کا تھا، ان کے والد نواب یوسف علی خاں ناظم کی سرکار میں داستان گوئی کی خدمت میں مقرر تھے، یہ بھی اسی سرکار میں نوکر ہو گئے، یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی قدردانی فرمائی، جلال کو سو روپیہ ماہوار ملتا تھا، چند مرتبہ مستعفی ہو کر چلے آئے، مگر قدردان نواب نے ایام معزولی کی بھی تنخواہ ادا کی، اور ان کو ہر مرتبہ بلوا بھیجا،

منگرولی کے نواب حسین میاں ان کو پچیس روپیہ ماہوار بھیجتے، اور ہر قصیدہ پر سو روپے دیتے تھے، علاوہ ان کے اور لوگ بھی ان کی خدمت کرتے تھے، ان کا یہ بھی دستور تھا کہ بغیر مالی منفعت کے کسی کے کلام میں اصلاح نہ دیتے تھے، اور کسی خط کا جواب نہ دیتے جب تک اُس میں جواب کے لئے ٹکٹ نہ رکھا ہو،

ان کو اپنی زباندانی کا بڑا دعویٰ تھا، اور اس بات پر ناز تھا کہ وہ محاورے کو صحیح طور پر ادا کرتے ہیں، اس بارہ میں وہ کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے تھے،

مگر باوجود بددماغ اور نازک مزاج ہونے کے اہل کمال سے بتواضع پیش آتے اور اپنی فروگذاشت کو جلد تسلیم کر لیتے،

نواب کلب علی خاں مرحوم کے بعد لکھنؤ چلے آئے تھے اور منصور نگر میں ایک مکان خرید کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی،

سرمایۂ زبان اردو کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، جس میں محاورے، کنائے اور اصطلاحیں زبان اردو کی بیان کی ہیں، مفید الشعرا ایک رسالہ تذکیر و تانیث کی بحث میں ہے، قواعد المنتخب ایک اور رسالہ ہے جس میں بعض مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق و تصریف بیان کی ہے،

علاوہ ان کتابوں کے چار دیوان ہیں، بعضے مبسوط، بعضے مختصر، چہتر برس کی عمر پائی،

اور سنہ ۱۳۲۵ھ میں جہاں کے تھے وہاں چلے گئے،

خبر کیا تھی کہ خاموشی ہی رازِ عشق کہدیگی
وہی غمّاز ہوگا جو ہمارا رازداں ہوگا
جفا کرتے ہیں کہتے کہ باوفاؤں پر وہ دیکھیں تو
ہمیں جو آزماتے تھے اب انکا امتحاں ہوگا

جی خوب بہلتا ہی بھلا ہو کہ بُرا ہو
سن لیتے ہیں ناصح سے کچھ افسانہ کسی کا

دلِ ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے
کام اس سے بھی نکل جاتے تھے بیکار نہ تھا

گناہِ عاشقی خواہانِ تعزیر آپ ہوتا ہی
بنا دیتا ہے شوقِ دار خود منصور ہو جانا

طاقت نے سنبھالا نہ تحمل نے دمِ ہجر
سب دعویٰ ہی کرتے تھے کوئی کام نہ آیا

پائی راحت ترے خنجر ہی کے نیچے قاتل
پھر جو ٹھہرا تو نہیں کچھ دلِ بسمل ٹھہرا

اُٹھے جو بزمِ یار سے تنہا ہم آئے گھر
طاقت کہیں حواس کہیں دل کہیں رہا

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغِ چمن
شگوفے دیکھیں اُنھیں کیا نہاں کرتے ہیں

ترا دامن دبا لینا تہِ زانو سمجھتے ہیں
ابھی کوئی نہ اُٹھے ہم بھی یہ پہلو سمجھتے ہیں

نقش قدم پکارتے ہیں راہِ عشق میں
مٹ جائے حوصلے جسے نام نشاں کے ہیں

اندازۂ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا
کم حوصلہ ہمیں ہیں وہاں کچھ کمی نہیں

اداؤ ناز پر یوں جان دیتے ہیں بتا دیگا
ذرا جینے تو چندے کسی مر جانے والے کو

جگر کا درد کھویا اور نہ کی دل کی تڑپ نے اُف
تمھیں سے پوچھتے ہیں کس مرض کی پھر دوا تم ہو

آنسوؤں کے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق
حسرت ٹپک پڑیگی ہماری نگاہ سے

کوئی دامن جنوں میں کھینچتا ہے آستیں کوئی
اتارے لیتے ہیں خارِ بیاباں پیرہن اپنا

کیا تھی کسی کی ترچھی نظر کچھ نہ پوچھئے
اک تیر تھا کلیجے کے جو پار ہی رہا

رہتا ہے کلیجے میں نہاں دردِ محبت
یہ چوٹ وہ ہے جس کو اُبھرنا نہیں آتا

نہ ہو برہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا میں نے
چلو جانے دو بیتابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے

جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہو
نہ یہ ناداں سمجھتا ہو نہ وہ جاہل سمجھتا ہے

ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق کو
فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے

لو بند کئے لیتے ہیں ہم دیدۂ مشتاق
اب دیکھیں کہ آجاتے ہو تم دل میں کدھر سے

خوبرویوں کے بگڑنے میں ہیں لاکھ بناؤ
کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے

سی لیں گے گریباں کو ہم یہ تو بتا دو
کس طرح رفو اس میں ہو دل تم سے جو پھٹ جائے

شیخ امیر اللہ تسلیم

احمد حسین نام تھا، مگر امیر اللہ کے نام سے مشہور ہیں، مولوی عبد الصمد انصاری کے بیٹے تھے، نواحِ فیض آباد میں منگلیسی ایک گاؤں تھا وہاں سنہ ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے والد ان کے پلٹن میں ملازم تھے، اس تقریب سے لکھنؤ میں نشو و نما پائی، باپ اور بڑے بھائی عبد اللطیف سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں، اور خطاطی میں کمال پیدا کیا،

شعر و سخن سے مناسبت خداداد تھی لکھنؤ میں صحبت بھی ایسے لوگوں کی میسر ہوئی جو شعر و سخن سے مذاق رکھتے تھے، اس لئے وہ رنگ چمک گیا، جب مرزا اصغر علی خاں نسیم لکھنؤ آگئے تو اس میں برگ و بار پیدا ہو گئے، اُن سے مشقِ سخن کرنے کے بعد اپنی راہ اہلِ لکھنؤ سے الگ نکال لی،

ان کے والد پلٹن میں کسی عہدے پر مقرر تھے جس کی تنخواہ تین روپیہ ماہوار ان کو ملتی تھی، جب وہ کبر سنی کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہے تو انھوں نے محمد علی شاہ کے زمانے

میں ان کو اپنی جگہ پر کرا دیا، یہ مدت تک کام کرتے رہے، اور مشقِ سخن بھی جاری رہی، واجد علی شاہ کے زمانے میں مسٹر سلیمن، رزیڈنٹ لکھنؤ کی کسی شکایت پر ان کی پلٹن توڑ دی گئی، یہ بیکار ہو گئے، تین برس مسلسل کوششیں کیں، مگر بے سود،

اُس زمانے میں شاعری زوروں پر تھی، ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھکر مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خاں قبولؔ کی وساطت سے پیش کی، وقت آگیا تھا، بادشاہ کی نظر اُس پر پڑ گئی، نظم میں حکم لکھوایا، ؎

بشنوائے خوشنویس واے خوش گو ہر دو فن می کنی و ہر دو نکو،
اسم تو مندرج بدفتر شد بست وده روپیہ مقرر شد

اُس دن سے ان کو تیس روپیہ ماہوار پھر ملنے لگے، ایامِ غدر میں جب لکھنؤ میں نوابی ہو گئی تو پھر کسی پلٹن میں اسی عہدہ پر یہ مقرر ہو گئے جو شاہی زمانے میں تھا، نو مہینے تک جنگ کی کشاکش میں مبتلا رہے، جب کام بگڑا تو رامپور چلے گئے، اور عرصہ تک وہاں رہے،

جب لکھنؤ میں پھر انگریزوں کا تسلط ہوا، اور راستے محفوظ ہو گئے، تو رامپور سے چلے آئے، نواب محمد تقی خاں نے دس روپیہ ماہوار کر دیئے اور اپنا کلام اصلاح کے لئے انکو دینے لگے، اور منشی نولکشور نے اپنے چھاپہ خانہ میں بیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا،

نواب کی زندگی تک تیس روپیہ ماہوار اُن کو ملتے رہے، ان کے مرنے پر بیس روپیہ رہ گیا، تھوڑے دنوں کے بعد نواب کلب علی خاں مرحوم مسند نشینِ رامپور ہوئے اور اُن کی قدردانی سے ہر طرف سے نامی گرامی شاعروں نے رامپور پہنچ کر خلعتِ ملازمت حاصل کیا، تسلیم ابھی بیس روپیہ پر لکھنؤ میں پڑے ہوئے تھے،

نواب کو خود یاد آیا، اُن کو بلوا کر تیس روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی، مگر اسی تیس روپیہ میں

ان کی بسر اوقات کیا ہوتی، عید بقر عید میں قصیدے پیش کرتے اور ہر موقع پر دو سو روپیہ ان کو ملا کرتا، اس پر بھی یہ قرضدار ہو جاتے، نواب مرحوم کو خبر ہوتی تو وہ افسوس کرتے، اور بلا کر پوچھتے کہ کتنا قرض ہے، یہ جو کچھ بتاتے اس سے دونا چوگنا ان کو مل جاتا، اور تاکید ہوتی کہ احتیاط رکھنا مگر نواب کی فیاضیوں نے سیر چشم بنا رکھا تھا، احتیاط کون رکھتا،

نواب کی زندگی بھر یہی تماشا رہا، نواب کے مرنے کے بعد ان کی پنشن ہو گئی، اور بجائے تیس کے دس پندرہ روپیہ رہ گئے، اس پریشانی اور ناکامی میں ٹونک گئے اور وہاں سے ناکام واپس ہوئے پھر مانگرول گئے، نواب حسین میاں قدردان رئیس تھے، پچاس روپیہ ماہوار اور خرچ پر روکنا چاہا، مگر وہاں کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی، چلے آئے،

جب نواب حامد علی خاں مسند نشین ہوئے تو داداجان کے وقت کا شاعر سمجھ کر دربار میں بلایا اور حال پوچھا معلوم ہوا کہ پنشن ہوئی ہے، فرمایا کہ پنشن کیسی، یہ کوئی سپاہی تھے کہ اب بندوق نہیں چلا سکتے، یہ تو شاعر ہیں جو کام پہلے کرتے تھے، وہ اب بھی کر سکتے ہیں، خلد آشیاں کے عہد کے تیس روپیے بحال کئے جائیں، اور ہماری طرف سے دس روپیہ ماہوار اضافہ،

اس طرح تھوڑی فراغت پھر نصیب ہوئی، مگر آنکھوں اور کانوں کی نعمتوں سے محروم ہو گئے تھے بقیہ حیات مستعار کو پورا کر کے چھیانوے برس کے سن میں ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی،

غدر سے پہلے ایک دیوان تیار ہو گیا تھا، وہ غدر کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا، دوسرا دیوان غدر کے بعد مرتب کیا، جس میں قصائد غدر سے پہلے کے شامل ہیں، یہ دیوان نظم ارجمند کے نام سے چند قصیدوں اور دو مثنویوں کے ساتھ لکھنؤ میں شائع ہو گیا ہے، اور اس کی کاپی خود انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، رامپور میں تیسرا دیوان تیار ہوا جو نظم دل افروز کے نام سے چھپا، اس کے بعد چوتھا دیوان دفتر خیال کے نام سے شائع ہوا، پانچویں دیوان کے متفرق اجزا ان کے رامپوری

شاگردوں کے پاس تھا جن سے شائع ہونے کی توقع نہیں،

مثنویوں میں نالۂ تسلیم اور شام غریباں پہلے دیوان کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، اس کے بعد صبح خنداں، دل و جان، نغمۂ بلبل، شوکت شاہجہانی، گوہر انتخاب اور تاریخ بدیعی یعنی تاریخ رامپور وقتاً فوقتاً لکھیں اور شائع ہوئیں، سفرنامۂ نواب رامپور جس میں پچیس ہزار شعر سے کم نہ ہوں گے، رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں قلمی موجود ہے،

تسلیم کو اصناف سخن میں جو قدرت مثنویوں پر حاصل تھی وہ ان کے معاصرین میں سے کسی کو حاصل نہ تھی، اخیر زمانے کی مثنویاں جو اُن کی کمزوری اور بدحواسی کے زمانے کی تصنیف ہیں، دیگر اساتذہ کی بہترین مثنویوں کے برابر بلکہ ان سے بہتر کہی جا سکتی ہیں،

قصیدوں میں بھی ان کا رنگ خاص ہے، مضمون کی بلندی اور بلاغت کو الفاظ کی رنگینی اور فصاحت کے ساتھ ایسا نمایاں کرتے ہیں کہ اکثر موقعوں پر قصیدہ میں غزل کا رنگ جھلکنے لگتا ہے،

تغزل میں نظم ارجمند کی غزلیں اپنی خصوصیتوں اور گوناگوں مضمون کے لحاظ سے اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ ہیں، اس کے بعد کلام میں کمزوری کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں، عام جوہر ان کے کلام کا پختگی کلام، رنگینی الفاظ اور دلپذیری مضامین ہے جس سے بے ساختگی کی شان اُس میں کھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے،

قصیدوں کا نمونہ ملاحظہ ہو،

نغمہ سنجی کے نہ قابل نہ سزاوار فغاں   بلبل تصویر ہوں رکھتا نہیں گویا زباں
ہر طرح پوشیدگی حاصل ہے مجھکو غیب سے   سینہ میں مانند دل ہوں دل میں ہوں مثل گماں
بوئے گل ہوں گل کو بھی صحبت مری ہو ناگوار   ہوں سبک روحی سے اپنے طبع نازک پر گراں

عین پستی میں خیالِ سربلندی ہے وہی
ہوں ترقی آشنا مثلِ غبارِ ناتواں
ہوشیار اے خامۂ بیہودہ پیما ہوشیار
تاکجا وقفِ زباں آئین و رسمِ شاعراں
مطلعِ مضمونِ عالی یاد آیا ہے مجھے ،
جس سے پیدا ہے عروجِ آسمانِ قدسیاں

اوج دکھلاتا ہے حسنِ پست فطرت ہر زماں
بوسہ روئے زمیں لیتا ہے کیا کیا آسماں
جوشِ مستی میں جوانانِ چمن کے سامنے
چلتی ہے بادِ صبا کرتی ہوئی اٹکھیلیاں
منبرِ ہر شاخ پر پڑھتی ہے بیٹھی عندلیب
خطبہائے مدحتِ واجد علی شاہِ جہاں
جس کی ادنیٰ ریزشِ زر کی بدولت دہر میں
مختصر ہے طولِ دامانِ زمین و آسماں

ٹپکے ہیں دیدۂ بے خواب سے کیا کیا گوہر
دیکھتے دیکھتے مٹ مٹ گئے کیا کیا گوہر
بے ثباتی کو مری دیکھ کے آنسو کی طرح
خود بخود ٹوٹ گیا ہاتھ جو آیا گوہر
تھا وہ غم دوست کہ صناعِ ازل کے آگے
اشک ہوتا میں بگڑ کر جو بناتا گوہر
دیتے ہیں اہلِ صفا اہلِ صفا کو قوت
ضعفِ دل کے لئے لکھتے ہیں اطبا گوہر
کس طرف جوش میں جاتا ہے کدھر اے تسلیم
تاکجا تارِ پریشاں میں پروتا گوہر
ہذا بشنو دیدہ وری ہے تجھے حق مجھ سے
مطلعِ صاف کہ ہر نقطہ ہو جس کا گوہر

غور سے دیکھ ذرا ابر سے ہم ڈالا گوہر
آمد میں وہ مضمون ہیں سوایا گوہر
یہ دل و جاں ہے دل و جانِ صفا طینت کا
آبلہ ہے جگرِ چاکِ صدف کا گوہر
اس سے ہے حشمتِ ملک زینتِ تاجِ ممدوح
چند دم ہے سببِ رونقِ دنیا گوہر

گر تامل ہے تو چل منصفِ دوراں کے حضور   نہ رہے شک سخن اچھا ہے کہ اچھا گوہر،

یوں ہی چندے جو رہا حوصلۂ صرفہ دکرم   عالمِ بحر میں ہو جائے گا عنقا گوہر
پرتوِ عارضِ روشن جو دکھائے اعجاز   درِ نظارہ ہو اک دیدۂ بینا گوہر
نقشِ پا ہے سببِ زینتِ عالم ایسا   جیسے ہو تاجِ سرِ شاہ کو زیبا گوہر

غزلوں کا رنگ ملاحظہ ہو،

وطن میں تازہ وارد ہوں طبیعت گھر میں کیا بہلے   ابھی پھرتا ہے آنکھوں میں مرے نقشہ بیاباں کا

وہ ہوا خواہ اسیری تھے کہ آزادی کے بعد   رو دیئے ہم دیکھ کر خالی قفس صیاد کا

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤنگا اے وحشتِ جنوں   اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤنگا

اللہ رے اضطرابِ تمنائے دیدِ یار   اک فرصتِ نگاہ میں سو بار دیکھنا

اجل خفا ہے، فلک مدعی، زمیں دشمن   مرا جہاں میں کوئی نظر نہیں آتا
حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو   یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا

نالہ کھینچا ہے دل نے خفا شوق ہے اداس   تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

آبرو گر چاہتا ہے کنجِ خلوت کر قبول
قطرۂ نیساں صدف میں آ کے گوہر ہو گیا

محبت میں یہ بے رحمی کہ جینا ہو گیا مشکل
خدا نا کردہ کیا ہوتا جو وہ کافر عدو ہوتا

تنگیِ کنجِ قفس، رنجِ اسیری، داغِ گل
اتنے سامانِ ستم اور ایک جانِ عندلیب

راحتِ طفلی، جوانی، غفلتِ پیری و مرگ
جیتے مرتے ہم نے دو آنکھوں سے دیکھے چار خواب

خشک گل، افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں اداس
جی بھر آیا عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

پروازِ اولیں میں اسیری ہوئی نصیب
گویا قفس میں تھے جو اڑے آشیاں سے ہم

چاہیئے سب کچھ مگر اے دوست آتی ہے شرم
ان نصیبوں میں کسی شے کی تمنا کیا کروں

مانا کہ حسنِ یار سے لبریز ہے جہاں
لیکن وہ حوصلہ وہ شکیبِ نظر کہاں

غیر کیا دوست بھی ہوتا نہیں مشکل میں شریک
پھر گئیں وقتِ اجل دیکھ کے بیدم آنکھیں

وہ برق میں شوخی وہ لگاوٹ تھی ہوا میں
دی رخصتِ مے خود مجھے توبہ نے گھٹا میں

لے چلے ہیں دشت سے کیوں اقربا سوئے وطن
اب تو مجھکو وادیِ غربت بھی گھر سے کم نہیں

دو دن کی زندگی ہے اسیری میں عندلیب
فکرِ قفس کرے کہ اسیری کا غم کرے

کیونکر کہوں کہ لطف بھی اُنکا ستم نہیں
کب آئے دیکھنے کو کہ جب مجھ میں دم نہیں
اُس کی سحر نہ اُس کی زمانے میں شام ہو
فرقت کی شب بھی روزِ قیامت سے کم نہیں

کیا خبر مجکو خزاں کیا چیز ہے کیسی بہار
آنکھیں کھولیں آکے میں نے خانۂ صیاد میں

نہیں ہیں صبحِ وطن کی آرزوئیں خاک میں آکر
مبارک باد دے اے بے کسی شامِ غریباں کو

پارسائی کیسی اے زاہد بتوں کے عشق میں
میں اسی کا شکر کرتا ہوں کہ ایماں رہ گیا

ہٹ اُس کی رہ گئی یہ بڑی بات ہے مجھے
دل چیز کیا تھا ہاتھ سے اپنے گیا گیا

گل ہوں تو جگر چاک ہوں بو ہوں تو پریشاں
ہر رنگ میں اک آفتِ غم دل سے لگی ہے

ہمسایگی بھی سوختہ قسمت کی قہر ہے   بھڑکی جو دل کی آگ کلیجہ کو جا لگی

کیا خاک سنوں ناصح مشفق تری باتیں   کہنے میں نہیں میرے طبیعت کئی دن سے

رہا بھی ہوں تو کیا پرواز کی دل سے ہوس نکلے   کہ ہل سکتے نہیں جو بال و پر زیرِ قفس نکلے
امید فیصلہ محشر میں کیا ہو وہ جو بیٹھے ہیں   وہاں تھے جان کے دشمن یہاں فریادرس نکلے
ادھر ارماں گردن تہِ خنجر ہیں دونوں دیکھئے کیا ہو   کسے ناکام رکھے آسماں کس کی ہوس نکلے
نکالے گا کوئی کب تک دلِ بسمل سے پیکاں کو   جو سو ہیں ایک بھی نکلے تو یہ لاکھوں میں نکلے
یونہی لڑتے جھگڑتے عمر دو روزہ گذر جائے   نہ ہم نکلیں نہ میخانہ سے اے ساقی عسس نکلے

قیامت ہے قفس میں دیکھ کر بازو کو رہ جانا   بلا سے صبر آجاتا اگر بے بال و پر ہوتے
اُٹھا لینے کی فرصت اضطرابِ دل اگر دیتا   تو جیتے جی مرے پامال کیوں لختِ جگر ہوتے
مجھے تو طعنۂ پرواز فصلِ گل میں کیوں دیتا   اسی قابل اگر صیاد میرے بال و پر ہوتے
چلو ہم مر گئے فرصت ملی جھگڑا مٹا ورنہ   یہی شکوے گلے باہم مری جاں عمر بھر ہوتے
دمِ پیری مآلِ کار سے کیونکر نہ غفلت ہو   کہ اکثر آنکھ لگ جاتی ہے انساں کو سحر ہوتے
برنگِ شمع مہماں شب کا ہوں رو لے جو رونا ہو   کہاں پائیگی تو اے بیکسی مجھ کو سحر ہوتے
نہ رہتا کفر و دیں کا ایک بھی پابند دنیا میں   خدائی کھنچ اس طرف ہوتی مری جاں تم جدھر ہوتے
پسِ پردہ سے بے پردہ دری ہے جانِ مضطر کی   قیامت جلوہ گر ہوتی جو تم پیشِ نظر ہوتے
فقط آواز سُن سُن کر وہ رو دیتے ہیں غیروں کی   خدا معلوم کیا ہوتا جو نالے با اثر ہوتے

نہ شامیانہ، نہ شمعِ تربت، نہ موجِ سبزہ، نہ چادرِ گل
بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہوئی بے کسی کی

نالۂ تسلیم کا نمونہ

آغازِ کلام

شگافِ کلکِ رنگیں خندہ زن ہو   مبارک بادِ آغازِ سخن ہے
بھری ہے بے نیازی مدعا میں   سرِ تمکیں ہے عرضِ التجا میں
بڑھی ہے ناتمامی گفتگو سے   مرا مطلب سوا ہے آرزو سے
خیالِ آئینہ حیرت فزا ہے   زباں مصروفِ حمدِ کبریا ہے

دعائے عاشقانہ

الٰہی دے زبانِ نکتہ دانی   دکھاؤں جلوۂ حسنِ معانی
اجازت خواہِ لطفِ گفتگو ہے   خموشی بہرِ رخصت روبرو ہے
نظر لوثِ سخن سے پارسا ہے   ابھی نادیدۂ حسنِ مدعا ہے
سحاب آسا عطا کر چشمِ گریاں   مصیبت زادۂ آغوشِ طوفاں
رہے بیداریوں کا حفظِ آداب   نہ ہوں آنکھیں کبھی منت کشِ خواب
نہ کم ہو کوئی دن سامانِ سودا   رہے سر منزلِ احسانِ سودا
ترقی پر رہے شوقِ اسیری   رہے وحشت کو پاسِ دستگیری
فلک کو لذتِ ذوقِ جفا سے   نہ دوں فرصت تقاضائے بلا سے

خاتمہ

پلا ساقی شرابِ جامِ حسرت
کہ ہوں خدمت سے اب مشتاقِ رخصت
جو تو نے شیشہ و ساغر اٹھایا
مجھے قولِ غنیمت یاد آیا
بیا ساقی بیا اے قبلۂ شوق
کہ دور آخر شد و باقی است ایں ذوق
طبیعت جوش پر آنے نہ پائی
عروجِ فکر دکھلانے نہ پائی
نہ نکلا حوصلہ اپنی زباں کا
قلق ہے دل کو انجامِ بیاں کا
اجّا نے کہا ہنگامِ اتمام
کہ اس کا نالۂ تسلیم ہے نام
یہاں تک یہ پسندِ طبع آیا
کہ گویا دل سے میرے نقل پایا
ہوا ہاتف سے بہرِ سال ارشاد
قبولِ خاطرِ اربابِ فن باد
۱۲۷۵

نمونہ شامِ غریباں

حمد

اجازت دو خیالِ قاصدِ دل
کہ آ پہونچا دمِ تکلیفِ مشکل
طبیعت پھر رہی کچھ ناز پر ہے
کوئی مطلب مگر آغاز پر ہے
مضامیں بیٹھے ہیں فکرِ رسا سے
زباں جنبش میں ہے حمدِ خدا سے
طلسمی کارخانہ اک بنا کے
نظر سے چھپ رہا صورت دکھا کے
کسی کو عشق کی لذت عطا کی
مزہ دیتی رہی اندوہ ناکی
کہیں ہے التماسِ شوقِ دیدار
کہیں ہے محرمِ اسرارِ انکار

کہیں طالب کہیں مطلوب وہ ہی　　غرض ہر رنگ میں کچھ خوب ہی وہ
تماشا دوستِ یارِ خود نما ہے　　تصور بن کے پھرتا جا بجا ہے
کہاں تک ایک سی آہنگِ فریاد　　بدل اب اور کوئی رنگِ فریاد
ملک مشتاق ہیں حرفِ دعا کے　　فلک پر بھیج تحفے التجا کے

مناجاتِ عاشقانہ

الٰہی دے کوئی دل سربسر جوش　　برنگِ زخم خنداں غم فراموش
ہمیشہ سایۂ خنجر میں تڑپے　　اگر محشر بھی ہو محشر میں تڑپے
ہنسے رسوائی حالِ زبوں پر　　بہائے اشک تدبیرِ جنوں پر
نہ ہو پامال غم کی سرکشی سے　　اُٹھائے نازِ دشمن بھی خوشی سے
بڑھے گر بدگمانی چشمِ تر کی　　قسم کھائے سرِ داغِ جگر کی
نہ ہو کائل مذاقِ تلخ کامی　　رہے ہر مدعا میں ناتمامی
رگِ سودا جنوں میں خون کو ترسے　　سنے طعنے زبانِ نیشتر سے
مروں تیور اگر بدلیں الم کے　　رُکے سینہ میں دم رکنے سے دم کے
اجل سامانِ شادی کا سبب ہو　　صفِ ماتم صفِ بزمِ طرب ہو
بڑھیں رُتبے یہ جنسِ سرسری کے　　اُٹھاؤں ناز قحطِ مشتری کے
سیہ کاری قبولِ لم یزل ہو　　لباسِ کعبہ طومارِ عمل ہو
بس اے تسلیم کب تک جوشِ مستی　　کہاں تک شیوۂ مطلب پرستی
کمی کر شوقِ عرضِ التجا میں　　گرہ دے طولِ زلفِ مدعا میں

زباں ہے مائلِ ذکرِ پیمبرؐ
دہن ہے حلقۂ گردابِ کوثر

مولوی محمد محسن محسنؔ

مولوی محمد محسن محسنؔ تخلص، مولوی حسن بخش خلف مولوی حسین بخش علوی کاکوروی کے بیٹے تھے، سنہ ۱۲۴۲ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے، سات برس کے سن سے سولہ برس کے سن تک اپنے دادا کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی، اُن کے انتقال کے بعد باپ اور مولوی عبدالرحیم سے تحصیلِ علم کی،

مولوی ہادی علی اشکؔ ان کی ماں کے خالہ زاد بھائی تھے، ثقہ، پرہیزگار، عالم باعمل، تحقیقاتِ علمی اور اصولِ شاعری پر ان کو عبورِ کامل حاصل تھا، انہی سے مشقِ سخن کی، مین پوری میں چند روز عہدۂ نظارت پر کام کیا، اور وہیں سے وکالت ہائی کورٹ کا امتحان دیکر کامیابی حاصل کی، اُس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی، بعد کامیابی آگرہ میں بود و باش اختیار کی، غدر سنہ ۱۸۵۷ء تک آگرہ میں رہے، اُس کے بعد مین پوری میں مستقل قیام کرکے وکالت کو خوب ترقی دی، چند روز میں اُن کی دیانت، راستبازی، صفائی معاملہ، نازک خیالی اور عالی دماغی کی دھوم مچ گئی، حکام ان کو خاص عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے،

ہر شخص سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور ہر کسی کے درد دکھ میں شریک ہوتے، انکسار جوہرِ طبعی تھا، پرانی وضعداری اور ایشیائی مروت کا وہ بے مثل نمونہ تھے جنمیں حکمتِ عملی، ضرورتِ وقت اور پالیسی کا گذر نہ تھا، جس شخص سے جو برتاؤ ایک مرتبہ ہوجاتا

اس کو وہ اخیر تک نباہتے رہتے تھے،

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا، ابتدا میں کچھ غزلیں بھی لکھیں اور کبھی کبھی کسی کی فرمائش سے قصیدہ یا مثنوی، یا دوستوں اور بزرگوں کی تحریک سے تاریخہاے ولادت و وفات لکھیں، اس کے سوا نعت کے سوا انھوں نے کچھ نہیں لکھا، کلیات ان کے بڑے بیٹے مولوی نور الحسن بی اے ال ال بی نے جمع کر کے چھپوا دیا ہے، اس میں سب سے پہلے ایک نعتیہ قصیدہ "گلدستۂ کلام رحمت" ہے، سنہ ۱۲۵۸ھ میں لکھا تھا، اس کے بعد "سراپاے رسول اکرم" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، جس کو سنہ ۱۲۶۶ھ میں تصنیف کیا تھا، پھر ان کا مشہور قصیدہ ہے جو شہیدی کے قصیدے کے جواب میں ہے، اس کو سنہ ۱۲۷۴ھ میں لکھا تھا، اور منشی امیر احمد امیر نے اس کی تضمین کی ہے، پھر "چتر شہنشاہی" ایک ترکیب بند ہے، جو واجد علی شاہ کی تعریف میں کسی دوست کی فرمائش سے اور انہی کے نام سے لکھی تھی، پھر مثنوی "صبح تجلی" ہے، جو سنہ ۱۲۸۹ھ میں لکھی ہے، پھر "فغانِ محسن" اور "نگارستانِ الفت" دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں، جن کو سنہ ۱۲۸۹ھ اور سنہ ۱۲۹۳ھ میں لکھا تھا، پھر "مدیح خیر المرسلین" اُن کا وہ مشہور نعتیہ قصیدہ ہے، جس نے ہر کہ و مہ سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے، اس کا پہلا مصرع ہے، ع

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

اس کو سنہ ۱۲۹۳ھ میں لکھا تھا، اور اس کا خمسہ منشی عبد المجید سحر نے بھی بڑے زور کا لکھا ہے،

پھر اپنی مشہور مثنوی چراغِ کعبہ، شبِ معراج کے حال میں سنہ ۱۳۰۱ھ میں لکھی تھی، پھر اُن کی مثنوی شفاعت و نجات ہے، اُس کو سنہ ۱۳۱۱ھ میں لکھا تھا، اس کے بعد رباعیاں، غزلیں اور تاریخیں ہیں،

عام جوہر اُن کے کلام کا مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کا شان و شکوہ، بندشوں کی چستی، استعاروں کی رنگینی اور قصہ طلب تلمیحات ہیں جس میں اُن کے معاصرین میں کوئی اُنکا شریک نہیں بلکہ اردو شاعری میں اس کا جواب نہیں،

ثاقب نے مکتوباتِ امیر مینائی کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ منشی امیر احمد امیر سے محسن کاکوروی کی سخن آفرینی اور بلاغت کلام کا تذکرہ کیا، تو فرمایا کہ "ان کا کلام ایک عالم ہے، خیالاتِ نادرہ کا کہ اُس کو دیکھکر انسان حیران ہو جاتا ہے، اور ان کا ہر شعر معراجِ بلاغت ہے"

۱۸ صفر سنہ ۱۳۲۳ھ کو اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت کی، مرتے وقت یاسِ انفاس جاری تھا، تاریخِ وفات منشی زین العابدین فرجاد نے بڑی معقول نکالی جو کہ آیۂ کریمہ ہے، اِنَّہٗ فِی الْآخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ،

صبحِ تجلّی

بیضاویِ صبح کا بیاں ہے
تفسیر کتاب آسماں ہے
ہے خاتمۂ شب دل افروز
دیباچہ نگارِ نسخۂ روز
آثارِ سحر ہوئے نمایاں
سیپارہ لئے ہوئے ہے دوراں
واللیل کو ختم کر چکا ہے
آمادۂ دورِ والضحیٰ ہے
عنوانِ فلک ہے در منثور
لوحِ زریں سورۂ نور
اطرافِ بیاضِ مطلع صاف
"والفجر" کے حاشیہ پہ کشاف
ہر دشت ہے مثلِ دشتِ ایمن
ہر کوہ برنگِ طور روشن

گردوں کے غلاف میں ہے پنہاں
مشکوٰۃ شریف مہرِ تاباں
ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے
انجم کا ستارا ڈوبتا ہے
ہنگام سپیدۂ سحر گاہ
ساعات ہیں روز و شب کے واللہ
اِک مخبر صادق البیاںؐ ہو
پیغمبر آخر الزماںؐ ہے
کیفیتِ وحی میں ہے بلبل
ہے وقت نزولِ مصحفِ گل
سبزہ ہے کنارِ آب جو پر
یا خضر ہے مستعد وضو پر
نوبت ہے صدائے قمریاں کی
تیاری ہے باغ میں اذاں کی
اک شاخ رکوع میں رکی ہے
اور دوسری سجدہ میں جھکی ہے
سوسن کی زباں پر مناجات
جاری لب جو سے التحیات
تسبیح شگوفہ یا مصوّر
تحریمۂ تاک "ربِّ اغفر"
اللہ اللہ کیا سماں ہے
ہر شے کو حیاتِ جاوداں ہے
سرسبزی ہے باغ میں جہاں کی
آمد ہے بہارِ بے خزاں کی
لوح و قلم ادیب تقدیر
محوِ خطِ نسخ عالمِ پیر
ایام کا بخت پھر جواں ہے
پھر عہد شبابِ آسماں ہے
ہستی و عدم میں ایک لے ہے
لاشے کے بھی لب پہ آج نے ہے
کیفیتِ خرمی سے آج مسرور
رنگین طبعانِ عالمِ نور
رضواں نے کہیں سبیل رکھی
ہر کوزے میں سلسبیل رکھی
تیار کئے بحکم باری
میکائیل اک طرف نہاری
آئی ہے ساغر و صراحی
کوثر سے کھنچی ہوئی صبوحی

گلدستے بہشت نے بنائے   جبرئیل درود پڑھتے آئے
بیٹھے ہوئے ہیں خوشی سے بھولے   غلمان لئے ہار حور گجرے
خاکہ ہے زمیں میں آسماں کا   نقشہ ہے مکاں میں لامکاں کا
گویا اُتر آئے ہیں زمیں پر   مینا بازار چرخ اخضر

ناگاہ بجلوۂ عبارت   پیدا ہوئی غیب سے بشارت
یہ صبحِ سعادتِ جہاں ہے   نوروزِ بہارِ جاوداں ہے
نازل ہے زمیں پہ کبریائی   بندے کے لباس میں خدائی
اس وقت دیار میں عرب کے   مطلع ہے تجلّیاتِ رب کے
برجِ شرفِ قریشیاں میں   اور ہاشمیوں کے خانداں میں
کعبے کی زمینِ نامور سے   اور عبد المطلب کے گھر سے
اسلام کا آفتاب چمکا   بے پردہ و بے نقاب چمکا
پیدا ہوئے سرورِ دو عالم ؐ   پیدا ہوئے فخرِ نوح ؑ و آدم ؑ
محبوبِ خدا نبیِ مرسل ؐ   صبحِ دو یمنِ روزِ اوّل
مقصودِ ازل اجل و اعلیٰ   منظورِ حضورِ حق تعالیٰ
عینِ عرفان و مردمِ عین   ابروئے جبینِ قابِ قوسین
جانِ دلِ مرسلیں محمد ؐ   روحِ روحِ الامیں محمد ؐ
کیفیتِ وجد میں ہے اب ذوق   کہتا ہے خطیب خامۂ شوق
ہے ذکرِ ولادتِ پیمبر ؐ   اعلیٰ ادنیٰ اہم و اکبر

چراغِ کعبہ کا نمونہ

جبرئیلؑ

عمانِ کرم کے درِ منثور　　قرآنِ شرف کے سورۂ نور
مانند دوا زمیں پہ نازل　　مانندِ دعا سپہر منزل
منشورِ اوامر و نواہی　　عنوانِ صحیفۂ الٰہی
وارد ہوئے ابرساں زمیں پر　　ساتھ اُن کے براقِ برق پیکر

بُراق

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل　　کھیت اُس کا بہشت خلد جنگل
مہ پارہ فلک سے آنے والا　　اطلس کو کتاں بنانے والا
یوں چرخ سے نکلے وہ سبک رَو　　فانوس سے جس طرح کہ پرتو
شیشے سے پری چمن سے شبنم　　سیپی سے گہر حباب سے دم
گلشن سے بہار جسم سے جاں　　آنکھوں سے نیند دل سے ارماں

درود

حاضر ہوئے اُس کے آستاں پر　　جس کا کہ مکاں ہے لامکاں پر
محبوب خدا اے انس جاں کا　　مقصودِ رموزِ کن فکاں کا

ہاشم کی کلاہ میں گلِ تر   دامن میں قریشیوں کے گوہر
امکاں کے گہر کا ابرِ نیساں   دریاے قِدم کا شاخِ مرجاں
صانع کے قلم کا رنگِ ایجاد   بندوں کے چمن کا سروِ آزاد
ایمان کی سند کا نقشِ خاتم   عرفاں کے نگیں کا اسمِ اعظم
لاہوت مقام و عرش مسند   شاہنشہِ انبیا محمدؐ

بیداری

آداب سے آپؐ کو اُٹھایا   یا اپنے نصیب کو جگایا
بیدار ہوئی جو چشمِ حق بیں   آہو ہوئی شکلِ خوابِ شیریں
دیکھا کہ عجیب ماجرا ہے   گھر برجِ قمر بنا ہوا ہے
انشاے رموزِ غیب مخبر   ہونے کا نہیں یہ دن کبھی پھر
سونا کبھی ہو نہ یہ جگانا   لیتا ہے کروٹیں زمانا
طالع میں نہیں یہ شب کسی کے   اختر سو بار سو کے جاگے
ہوگی نہ یہ پھر زمیں کی توقیر   مٹی ہو ہزار بار اکسیر
انوار کا ہے ورود پیہم   تاروں کی برس رہی ہے شبنم
جبریلؑ ہیں اور براق بھی ہے   قاصد بھی ہے اشتیاق بھی ہے

سیرِ مقامِ اعلیٰ

زیرِ قدمِ جنابِ مولاؑ   اعلیٰ سے تھا جو مقامِ اعلیٰ

دل کی تگ و دو تھی دم سے آگے   سرچار قدم قدم سے آگے
چمکا ہوا آئینِ تجلّی   پھیلا ہوا دامنِ تجلّی
وحدت کا کھلا ہوا وہ ناکا   جس میں نہیں دخل ماسوا کا
وارفتہ خیال جست وجو کے   چھاپے لئے خونِ آرزو کے
امید کے تہ نشیں سفینے   ٹوٹے ہوئے حوصلے کے زینے
نکلی ہوئی ہمتوں کی جانیں   اتری ہوئیں چلّے سے کمانیں
پھیلے ہوئے دور باش ادب کی   طوبیٰ و بہشت عرش و کرسی
جانے کا لے سکیں ملک نام   روحوں کا پہنچ سکے نہ پیغام
تاثیر دعا کے در سے محروم   کوشش شرفِ اثر سے محروم
انسان کی واں تھی کب رسائی   آنکھوں میں کشش بٹھا کے لائی
وہ مردمِ چشمِ دین و ایماں   کحل البصر وجوب و امکاں
آنکھوں کو تلاشِ جلوۂ رب   کانوں میں صدائے "نحنُ اقرب"
آیا سوئے بزمِ "لی مع اللہ"   آئینہ میں جیسے پرتوِ ماہ
پہونچا وہ وہاں جہاں نہ پہنچے   جبریلؑ کی عقل کے فرشتے
نزدیک خدا حضورؐ پہنچے   اللہ اللہ دور پہونچے

مدیح خیر المرسلینؐ

تشبیب

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جاکے گنگا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل
دہر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل
ابر پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم
برق بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
شاہدِ کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ
چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل
جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل
وہ دھنوا دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع
گرچہ پروانہ بھی ڈھونڈے اسے لیکر مشعل
ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے
برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

غزل

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل

خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل

سطح افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی
روپ بجلی کا سنہرا ہے روپہلا بادل

بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں
وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل

میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوش خروش
کسی بیدرد کو دکھلائے کرشمہ بادل

دل بیتاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی
چشم پر آب کا ہے ایک کرشمہ بادل

طپش دل کا اڑایا ہوا نقشہ بجلی
چشم پُر آب کا دھویا ہوا خاکا بادل

پنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے
میری آنکھوں کا ہے اترا ہوا صدقا بادل

جام عمر فلک پیر ہوا ہے لبریز
لئے آتا ہے جنازہ دیئے کاندھا بادل

راجہ اندر ہے پری خانے کا پانی
نغمہ نے کا سری کشن کنہیا بادل

دیکھتا گر کہیں محسنؔ کی فغان و زاری
نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

گریز

روے معنی ہے جھکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف
تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل

اک ذرا دیکھئے کیفیت معراج سخن
ہاتھ میں جام زحل شیشۂ مہ زیر بغل

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں کھا پاؤں
کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بل

یعنی اُس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں
خرمن برق تجلی کا لقب ہے بادل

تا بارانِ مسلسل ہے ملائک کا ورود
پئے تسبیح خداوند جہاں عز و جل

گلِ بے رنگیٔ مطلق کے لہکتے گلزار   بے نیازی کے ریاحین مہکتے جنگل
باغ تنزیہہ میں سرسبز نہالِ تشبیہ   انبیاؑ جس کی ہیں شاخیں عرفاں ہیں کونپل
گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی ﷺ   زیبِ دامانِ ابد، طرۂ دستارِ ازل

سراپا کے چند بند

للہ الحمد شبِ غم نے اٹھایا چادر   مرحبا طالعِ بیدار مبارک ہو سحر
مژدہ اے دل کہ ہوا نورِ خدا پیشِ نظر   بارک اللہ طبیعت کا ہے رنگِ دیگر
گر نہ ہو پاسِ ادب تو مجھے کچھ دعویٰ ہے
سجدہ کرتے ہیں ملائک مرا وہ رتبہ ہے

لامکاں تک لئے جاتی ہے مجھے طبعِ رسا   لڑ گیا عرش کے پایے سے سخن کا پایا
ہو رہا ہے صفِ ارواح میں میرا چرچا   خیر مقدم کی چلی آتی ہے ہر سو سے صدا
بزمِ قدسی کا بلایا ہوا مہماں ہوں میں
ملک آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں وہ انساں ہوں میں

آج کس دھوم سے خدامِ سخن آتے ہیں   مسندیں فکر کی محفل میں بچھا جاتے ہیں
تنگیٔ بزمِ جہاں دیکھ کے گھبراتے ہیں   گاؤ تکیہ کرۂ ارض کا اٹھواتے ہیں
جشن کا روز ہے معنی کے شہِ اقدس کا
اور اونچا کرو خیمہ فلکِ اطلس کا

ہم دکھاتے ہیں طبیعت سے تماشے کتنے   عالمِ نور میں چھوڑ آئے ہیں شوشے کتنے
حل کئے غنچۂ خورشید سے نکتے کتنے   عقدِ پرویں سے لکھے ہم نے مثنّے کتنے

سادہ کاغذ ورقِ مہر درخشاں ہے آج
دستِ پر نور عطارد میں قلمداں ہے آج

تضمین

کنویں جھانکا کروں کنعاں کے تو سودا ہے مجھے   طور پر جاؤں تو ناحق کا بھٹکنا ہے مجھے
خبط ہے گر سرِ اعجازِ مسیحا ہے مجھے   سچ تو یہ ہے کہ ترے گھر میں کمی کیا ہے مجھے

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، ید بیضا داری
انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دورِ سوم

جدید شاعری کا آغاز

اردو شاعری کا یہ نیا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب کہ پنجاب کے دار السلطنت لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ہو کر آئے اور ان کو اردو زبان کی اصلاح کی طرف توجہ ہوئی، اس کے لئے اُنھوں نے اردو میں قواعد کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرائیں اردو نثر میں قصے لکھوائے، مضمون نگاری کو ترقی دینے کے واسطے ایک سرکاری اخبار نکالا اور ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی،

اس مشاعرے میں بجائے مصرعۂ طرح کے عنوانِ مضمون دیا جاتا تھا تاکہ عاشقانہ خیالات کی جگہ پر مناظرِ قدرت اور جذباتِ انسانی کے خاکے کھینچے جائیں، سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے جو اردو شاعری میں ذوق و غالب کی یادگار تھے اور حسنِ اتفاق سے انکا تعلق "سررشتۂ تعلیم" سے تھا بطور نمونے کے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں

کوئی طرز بھی ہو اوّل اوّل اُس میں کمزوریاں ہوتی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ اُس میں تراش خراش ہوتی ہے اور وہ حسن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، یہی حالت اس طرز کی بھی ہوئی، پہلے پہل اخباروں میں شور و غل برپا ہوا، پھبتیاں اُڑائی گئیں، اور کمزوریوں کو خوب نمایاں کر کرکے دکھایا گیا، مگر اب آندھی نکل گئی ہے، اور یہ طرز اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ کہن سال اور کہنہ مشق شاعر جن کی ساری عمر گل و بلبل کی داستان سرائی میں بسر ہوئی تھی اُسی طرز پر اتر آئے ہیں

مولوی محمد حسین آزاد

مولوی محمد حسین خلف مولوی باقر علی، آزاد تخلص، دلّی کے رہنے والے اور قوم کے مغل تھے، شمالی ہندوستان میں اُردو اخبار پہلے پہل مولوی باقر علی کے قلم سے نکلا ہے،

مولوی باقر علی کا بچپن سے شیخ محمد ابراہیم ذوق سے یارانہ تھا، اُس زمانے کی یاری رشتے اور ناطے سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتی تھی، اس لحاظ سے استاد ذوق آزاد کو اپنا بھتیجا سمجھتے تھے، انہی کے سایۂ عاطفت میں آزاد نے تعلیم و تربیت پائی، اور اُن کے مرنے کے بعد حکیم آغا جان عیش[1] کے فیضِ صحبت سے فائدہ اُٹھایا،

غدر کے ہنگامہ میں آزاد کا گھر بار لُٹ گیا، باپ شہید ہوئے اور اُستاد کی عمر بھر کی کمائی جس کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتے تھے، برباد ہوگئی، کچھ دنوں پریشان حالی میں اِدھر اُدھر

---

[1] خاندانی طبیب تھے اور شاہی دربار سے تعلق تھا، آزاد کہتے ہیں کہ زیورِ علم اور لباسِ کمال سے آراستہ صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں، ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا، طبیعت ایسی ظریف اور لطیفہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں، غزل صفائیِ کلام، شوخیِ مضامین اور حسنِ محاورہ سے پھولوں کی چھڑی ہوتی تھی، اور گویا لطائف و ظرائف کی پھلجھڑی،

آزاد نے ان کو پہلے پہل استاد ذوق کے ساتھ مشاعرہ میں دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ اُس وقت کی تصویر اس وقت آنکھوں میں پھر گئی، میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک اُنگل بال سفید، ایسی ہی داڑھی، اس گوری سُرخ و سپید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی، گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مارے مارے پھرتے رہے، آخرکار لاہور پہنچے اور سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں پندرہ ماہوار کی اسامی مل گئی، اس پر مدتوں پڑے رہے، رفتہ رفتہ چھپتر روپے ہو گئے، پھر اور کچھ بڑھ گئے، اور ان کو موقع ملا کہ یہ اپنی کارگذاری کا جوہر دکھائیں، اُس وقت گورنمنٹ کو بھی اردو کے نشو و نما و ترقی کی فکر تھی، ان کو اس سے خاص طرح کا لگاؤ تھا، انجمن پنجاب میں مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی اور بجائے طرح کے مصرع کے مضمون کا عنوان دینا قرار پایا، اُنھوں نے نمونے کے طور پر کئی نظمیں لکھیں اور مقبول ہوئیں،

اسی اثنا میں تعلیمی کاموں کے علاوہ ملکی کاموں میں بھی ان کو شریک کیا گیا، ایک مرتبہ کسی سرکاری کام پر کلکتہ بھیجے گئے، کچھ دنوں کے بعد پنڈت من پھول میر منشی گورنمنٹ پنجاب کے ہمراہ کابل و بخارا کا سفر کیا، پھر ایران گئے،

کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے قصص ہند کا دوسرا حصہ ان سے لکھوایا، اس کے بعد اُنھوں نے خود اپنی خواہش سے نیرنگ خیال کے دو حصے تالیف کئے اور اُس میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸) پر اہنس رہا ہے، استاد مرحوم کے بعد ذوق سخن اور ان کی کمال کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں بھی پہنچایا، اب ان صورتوں کو آنکھیں ترستی ہیں اور نہیں پاتیں، غدر کے کچھ دنوں بعد دنیا سے انتقال کیا، افسوس ہے کہ آزاد نے ان کے دو شعر بھی نہیں لکھے،

سب سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے گلشن بیخار میں اُن کا ذکر بھی نہیں کیا، دو شعر سخن شعرا سے اور ایک آبحیات سے نقل کرتا ہوں[1]،

کہتا ہے کوئی شعلۂ جوالہ کوئی برق　　اس دل پہ گماں لوگوں کا کیا کیا نہیں ہوتا
اک لف کا بل ہو تو کہوں سیکڑوں بل ہیں　　پیشانی سے ابرو تلک ابرو سے کمر تک

---

[1] اس لحاظ سے تو تین شعر ہونے چاہئیں لیکن صرف دو ہی شعر نقل کئے ہیں، ”ع“

انگریزی طریقہ کی مضمون نویسی کا چربہ اُتارا،

سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آبِ حیات ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشا پردازی کا بہترین کارنامہ ہے، عبارت کی بیساختگی اور برجستگی اور اس میں شاعرانہ تخئیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے، جس پہ غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کر دینے کے قابل ہیں،

اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھدی ہیں، وہ آج اردو کی انشا پردازی کے قالب میں روح کی طرح سے پیوست ہو گئی ہیں، اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں، جس طرح سے اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چون و چرا مانے جاتے ہیں، اُسی طرح سے ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے،

آزاد کی ایک اور تصنیف دربار اکبری ہے، جو اُسی قلم کی کشش کا نتیجہ ہے، جس نے آبحیات لکھی تھی، فرق اتنا ہے کہ اُس کے مسودے کو وہ خود صاف نہیں کر سکے، یکایک دماغ بگڑ گیا، اور اُن کے شاگردوں نے اُس کو مرتب کر کے شائع کر دیا،

ایک اور تصنیف ان کی سخندان فارس ہے، جو ایران سے لوٹنے پر لکھی تھی، علاوہ ان کتابوں کے مجموعۂ نظم اردو، قواعد اُردو، اور چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں ہیں جو سررشتۂ تعلیم کے تعلق سے لکھی تھیں،

اخیر زمانہ میں پچھتر روپیہ ماہوار کی پنشن ہو گئی تھی، مگر دماغ کے بگڑ جانے سے یہ کام کے نہیں رہے تھے، سنہ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی،

صنم ہے گردشِ عالم نگاہِ مہر سے تیری
اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا

سر اپنا کاٹ کے پھینک آیا کوئے قاتل میں
یہ بوجھ تھا مری گردن پہ سو اُتار آیا

جو ان معرکۂ حسن و عشق تھا آزاد
چلا نہ دل پہ جو قابو تو جان ہار آیا

ادھر بھی چشمِ عنایات ہو ذرا ساقی
کہ مست دیر سے امیدوار بیٹھے ہیں
کمان ابروئے جاناں کے دل سے ہوں قرباں
کہ جتنے تیر ہیں سینے کے پار بیٹھے ہیں

آفریں ہمت کو اُس کے دل کی جس نے عشق میں
جان تک پیاری نہ کی ایسا جگر والا تو ہو
ناخنِ خار آکے خود کر دیگا تیرا عقدہ وا
پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

پوچھتا حالت ہے کیا میرے دلِ ناشاد کی
آہ کی ہمت نہیں، طاقت نہیں فریاد کی

دیکھنا قیدِ تعلق میں نہ آنا آزاد
دام آتے ہیں نظر سبحۂ و زنار مجھے

سنے گا دیکھنا رو رو کے آواز اک جہاں میری
تمھارے عشق کی ہے داستاں اور ہے زباں میری
تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھکو چاک کر ڈالو
تمنا ہے یہ دامن کی اڑا دو دھجیاں میری

از مثنوی شبِ قدر

اے رات تیرے وصف کہاں تک رقم کروں
اور اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر — بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھوٹے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے — رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اُس کے عمل کا توڑنا تیرا ہی کام ہے — سکہ ہے اب ستاروں پہ اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اُس کا تو راحت تھا پھل ترا — چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

از مثنوی ابر کرم

چلنا وہ بادلوں کا قدم چوم چوم کر — اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی — سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آئی ادھر صبا ہے اُدھر ہے نسیم بھی — اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آئی شمیم بھی
مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا — جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا
سبزے کے عکس سے در و دیوار سبز سبز — سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے — اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا رہے طوفاں لبوں میں ہیں — پردیسیوں کی یاد سے ارمان دلوں میں ہیں

ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹھکور ہے

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

"مولوی الطاف حسین خلف ایزد بخش پانی پتی امروز در دہلی است" در صحبت حضرت

شیفتہ خیلے بسر بردہ، مرزا غالب را فرو ہیدہ یادگار است و در نغز سرائی
نادرۂ گفتار" اھ (طور کلیم)

مولانا الطاف حسین حالی، اُس زمانہ کے مسلّم الثبوت شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں، اُن کی نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، اُن کی ولادت پانی پت میں سنہ ۱۲۵۳ھ کو ہوئی، دادھیال انکا انصاری اور ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھا، ولادت کے بعد اُن کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا، جب نو سال کے ہوئے تو والد نے رحلت کی، اس وجہ سے تعلیم و تربیت کا جیسا انتظام ہونا چاہئے تھا، وہ اِن کو میسّر نہیں ہوا، قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد اپنے شوق سے سیّد جعفر علی سے کچھ فارسی پڑھی، اس کے بعد مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو شیعوں میں ایک جیّد عالم تھے عربی شروع کی، ابھی اچھی طرح کتابیں نکلی نہ تھیں کہ ان کے سرپرستوں نے مجبور ہو کر شادی کر دی، اُس وقت اُنکا سن سترہ سال کا تھا، شادی کے بعد یہ روپوش ہو کر دلی چلے گئے،

دلی میں مولوی نوازش علی مرحوم سے صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں، عربی میں اچھی طرح استعداد نہ ہونے پائی تھی کہ اہلِ وطن نے ان کو پانی پت بلا لیا، یہ وطن میں تھے کہ ہندوستان میں غدر ۱۸۵۷ء کا محشر خیز ہنگامہ برپا ہو گیا، اور چھ سات برس تک ان کو نکلنے کا موقع نہ ملا، تاہم کچھ نہ کچھ کرتے رہے، مولوی محب اللہ، مولوی قلندر علی اور مولوی عبد الرحمن محدث سے بغیر ترتیب و انتظام کے کبھی منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، کبھی حدیث و تفسیر کا درس لیا، جب یہ لوگ باہر چلے جاتے تو شروح و حواشی کے مدد سے ادب کی کتابیں بطور خود مطالعہ کرتے رہتے،

جس زمانہ میں دلی میں تحصیلِ علم کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے، اُن کو اکثر مرزا غالب کے پاس جانے کا اتفاق ہوتا تھا، ان سے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے معنی

اُن سے پوچھا کرتے تھے، اُسی زمانہ میں مرزا نے اپنے فارسی کے دیوان کے چند قصیدے بھی ان کو پڑھا دیئے تھے، مرزا غالبؔ کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر سے منع کرتے تھے، اُنھوں نے جو دو ایک اردو یا فارسی کی غزلیں کہہ کر مرزا کو دکھائیں، تو اُنھوں نے کہا کہ میں اگرچہ کسی کو شعر کہنے کی صلاح نہیں دیتا مگر تمھاری نسبت میرا خیال یہ ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے، مگر دلی میں ان کو ایک دو غزل سے زیادہ کہنے کا اتفاق نہیں ہوا،

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں ان کو بیکار رہتے گذر گئے، اور فکرِ معاش نے انھیں وطن سے باہر جانے پر مجبور کر دیا، تو حسنِ اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد سے شناسائی ہو گئی، اور اُن کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا، نواب مرحوم جس درجہ کے شاعر تھے اُس سے کہیں زیادہ ان کا مذاقِ شاعری تھا، حکیم مومن خاں کے بعد وہ اپنا کلام مرزا غالبؔ کو دکھاتے تھے،

یہ جب اُن کے پاس پہنچے تو ان کا پُرانا شوق شعر و سخن کا جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا، اُنھوں نے متعدد غزلیں اردو فارسی کی لکھیں، اور جس طرح نواب مرحوم اپنا کلام جہانگیر آباد سے دلّی مرزا کے پاس بھیجتے تھے انھوں نے بھی بھیجیں،

مرزا کی اصلاح نے ان کی طبیعت پر اتنا اثر نہیں کیا جتنا کہ نواب مرحوم کے فیضِ صحبت سے یہ متاثر ہوئے، نواب مرحوم مبالغہ کو ناپسند کرتے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنے اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانے کو منتہائے کمال سمجھتے تھے، چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ کو یکساں نفرت تھی، اُن کی شاعری نے نواب مرحوم کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی، اور انکی

صحبت میں رہ کر ایک خاص مذاق اُن کی طبیعت میں پیدا ہو گیا جس پر اُنھوں نے آگے چل کر جدید شاعری کی بنیاد ڈالی،

گورمنٹ بک ڈپو کی ملازمت میں جب کہ ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں درست کرنی پڑتی تھیں تو رفتہ رفتہ ان کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی اور شاعری اور مشرقی انشا کے فضول حصوں کی وقعت اُن کے دل میں کم ہوتی گئی،

جب کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات کے ایما سے لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا مشاعرہ تھا، اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا، مولنا حالی نے چار مثنویاں لکھ کر اس مشاعرہ میں پڑھی تھیں (۱) برکھارت (۲) نشاط اُمید (۳) مناظرۂ رحم و انصاف (۴) حب وطن، یہ مثنویاں بہت مقبول اور بار بار چھپ کر شائع ہوئیں،

اینگلو عربک اسکول کی مدرسی کے زمانہ میں بھی کئی نظمیں، اسی طرز کی لکھیں جس کی تحریک لاہور کے مشاعرہ میں ہوئی تھی، اسی زمانہ میں سر سید احمد خاں مرحوم نے ان کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کے موجودہ تنزل اور پستی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو بہت مفید ہو گی، اُنھوں نے ان کی تحریک پر مسدس مد و جزر اسلام لکھا جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے، اور جس کے اشعار ہر شخص کی زبان پر ہیں اور ہر قومی مجلس میں پڑھا جاتا ہے، آخر عمر میں ایک حصہ اپنے عربی کلام کا شایع کیا ہے، اردو کا دیوان اُنھوں نے مرتب کیا ہے، اور اردو شاعری پر سوا دو سو صفحہ کا ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اُس میں شامل کر دیا ہے، جو دیکھنے کے قابل ہے، اور اردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے

اس سے مولانا کے مذاقِ شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے،

اُن کی مشہور تصنیف حیاتِ سعدی ہے جس میں شیخ سعدی شیرازی کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں، اور ان کی نظم و نثر پر نہایت عمدگی اور خوبی سے تنقید کی ہے،

ایک کتاب یادگارِ غالب ہے، اُس میں مرزا نوشہ کے حالاتِ زندگی تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان کے فارسی و اردو اشعار کا انتخاب بھی شامل کر دیا ہے،

ایک کتاب حیاتِ جاوید ہے جس کی ضخامت ہزار صفحہ سے زیادہ ہے، اُس میں اُنھوں نے سرسید مرحوم کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں، اور اُن کی تمام حیثیتوں پر مورخانہ و فلسفیانہ بحث کی ہے،

علاوہ ان کتابوں کے اور بھی اُن کی تصنیفات ہیں، جن میں سے کچھ شائع ہوئی ہیں اب ملتی نہیں، اور کچھ اب تک شائع نہیں ہوئیں،

بہر حال مولانا حالی اُس زمانہ کے اُن مشہور لوگوں میں تھے جنھوں نے پرانے مدرسہ میں تعلیم پا کر ایسے کارنمایاں کئے جن کی مثال تعلیم جدید اب تک نہیں پیدا کر سکی،

۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ کو مولانا نے وفات پائی،

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کوئی آسماں نہ تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ الم کا ظہور تھا

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

دل سے خوشیاں سب ہوئی ہیں گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط
غنچہ چٹکا اور آ پہونچی خزاں
فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا ایک ایک

اب بھاگتے ہیں سایۂ لطفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

ہیں تو ہیں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہی ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

چارہ گر کار باندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

ہے کچھ اک باقی خلش اُمید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

ترک دنیا کے علائق تو کئے سب زاہد
گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعان جوانی کی بہار آخر حیف
طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب نہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی کی امنگ
سر ہی سودا سے تہی ہے عشق سے دل ہی خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجئے درد جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانی کے دل آتش کی طرح
وہ ہو جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
"قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے
گر کبھی حملہ پہ اسکے غالب آ جاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جنکو نادانی سے حملے اُسکے ٹھہراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زور بازو پہ ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں — پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہلِ ملک کو — گو کہ اُن کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہاں جس کے کبھی چاقو نہ لیں — اُس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں اُنھیں — ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
الغرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ — جانتے ہیں دین و ایماں اپنا قصہ مختصر
سن کے حالی نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا — ایک سے ہے ایک قوم اس عیب سے آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کے — یہ وہ خصلت ہے کہ مجبور اس پہ ہے طبعِ بشر
مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاسِ قوم میں — اچھے اچھے راستباز اور حق پسند اور دادگر
ہاں بری اس عیب سے لے دے کے اس دنیا میں ہے — چشم بد دور امتِ مرحوم اے جانِ پدر
اور قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز — حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہوگا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یہاں — جس قدر ہے ان سے اپنوں اور بیگانوں کو خطر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجامِ ترقیِ بشر — یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہیگا کوئی انسان میں عیب — ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

توقع بیجا

ہیں یار رفیق، پر مصیبت میں نہیں — ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انساں سے توقع ہے عبث — جو نوعِ بشر کی خود جبلت میں نہیں

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کیلئے　　بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح　　مردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

وقت کی مساعدت

اے دل بگاڑ کا ہے سب کے چارہ　　پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہی یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی　　پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

فکر عقبیٰ

منزل ہے بعید باندھلو زاد سفر　　مواج ہے بحر رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے بیچلو مال کھرا　　ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہ گذر

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

محمد اسمٰعیلؒ نام، وطن میرٹھ تھا، ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے ۱۷ سال کا سن تھا کہ سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی،

پہلے سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں ملازم رہے، پھر کے بعد اسکول میں "ہیڈ مولوی" کے عہدے پر مامور ہوئے، اول سہارنپور، پھر میرٹھ میں مدت تک رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے، چنانچہ اردو ریڈروں کی تصنیف قیام آگرہ کے زمانہ میں ۱۸۹۳ء کے درمیان کی، تقریباً ۱۲ سال آگرہ میں مدرس فارسی کے عہدہ پر مامور رہ کر ۱۸۹۹ء میں پنشن پائی اور اپنے وطن مالوف میرٹھ میں واپس آکر قیام اختیار کیا،

کے درمیان کی، تقریباً ۱۲ سال آگرہ میں مدرس فارسی کے عہدہ پر مامور رہ کر سنہ ۱۸۹۹ء میں پنشن پائی، اور اپنے وطن مالوف میرٹھ میں واپس آکر قیام اختیار کیا،

ان کو تصوف کا بھی ذوق تھا، اور حضرت غوث علی شاہ قدس سرہ العزیز پانی پتی کے مریدانِ خاص میں تھے،

اردو زبان کی نظم اور نثر میں خواہ وہ عاشقانہ رنگ میں ہو یا تمدنی و اخلاقی و سیاسی ہو، قدیم و جدید ہر ایک طرز میں بلند پایہ رکھتے تھے، اور بقول مولانا شبلیؒ کے جدید رنگ میں مولانا حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی تھے،

مرحوم کا یہ بھی قصد تھا کہ لغاتِ اردو کی ترتیب اور قواعد اردو کی تکمیل جدید طرز پر اپنے خیالات میں کر جائیں، چنانچہ اُن کے مسودات محفوظ ہیں، اور ان کے جانشینوں سے امید ہے کہ اسکی تدوین و اشاعت کر کے پبلک کو مستفید کریں گے،

ان کی آخری علمی خدمت یہ تھی کہ وہ نواب محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سکریٹری ایم اے او، کالج علی گڈھ کی فرمائش سے حضرت امیر خسروؒ کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانحعمری نہایت کامل طور پر مستند کتب و تواریخ وغیرہ سے مرتب کر رہے تھے، اور تنقید مثنوی قران السعدین منجملہ اس کے تکمیل ہو چکی تھی، اور کچھ حصہ کتب مذکورہ کا مرحوم کے ناگہانی حادثہ کی وجہ سے نامکمل رہ گیا پچھتر سال کی عمر میں یکم نومبر سنہ ۱۹۱۷ء کو اپنے وطن میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے

کلیات ان کا چھپ چکا ہے، اور سررشتۂ تعلیم کے تعلق سے اردو ریڈریں ان کی اسکولوں میں بسبب کمال سادگی اور سلاست کے مقبول ہو چکی ہیں، ان سے بہتر درسی کتابیں گورنمنٹ کا سررشتۂ تعلیم آج تک نہیں لکھوا سکا،

نظم بے قافیہ کی بیرنگی کو اردو زبان میں گوارا اور پسندیدہ کرنا انہی کا کام ہے، اُنھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور وہ کلیات میں موجود ہیں، جو بلحاظ متانت بیان و پختگی الفاظ کے وہی اثر رکھتی ہیں جو دیگر اساتذہ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے،

کھولا ہے مجھ پہ سر حقیقت مجاز نے   یہ پختگی صلہ ہے خیالات خام کا
میں بے قرار منزل مقصود بے نشاں   رستہ کی انتہا نہ ٹھکانا مقام کا

وصل و فراق وہم سہی دل لگی تو ہو   پھر ہم کہاں جو پردۂ راز نہاں اٹھا

اب اور ڈھونڈھیے کوئی جولانگہ جنوں   صحرا بقدر وسعت یک گام ہو گیا

سب جتایا کیے نیاز قدیم   وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
کیا کھلے جو کبھی نہ تھا پنہاں   کیوں ملے جو کبھی جدا نہ ہوا
تو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا   میرا کیا تھا ہوا ہوا نہ ہوا

ہے اشک و آہ راس ہمارے مزاج کو   یعنی پلے ہوئے اسی آب و ہوا کے ہیں
ان بد دلوں نے عشق کو بدنام کر دیا   جو مرتکب شکایت جور و جفا کے ہیں

تو ہی نہیں ہے رمز محبت سے آشنا   ورنہ دیار حسن میں رسم ستم نہیں

خود فروشی حسن کو جب سے ہوئی مدِ نظر
نرخِ دل بھی گھٹ گیا، جانیں بھی ارزاں ہو گئیں

کچھ لطف ہے جو کرتے ہیں کرم حضرتِ ناصح
تھے ورنہ مرے ایسے ہوا خواہ کہاں کے

رہ گئی تیرے سوا شاید تمنا اور بھی
کچھ کھٹکتے ہیں ابھی پہلوئے دل میں خار سے

بتلا دیا ہے راہ نما نے مجھے پتا
دنیا بھی اک مقام تری رہگذر میں ہے
چل شاہراہِ دل میں اڑا توسنِ طلب
وحشت کا جوش چاہئے صحرا بھی گھر میں ہے

کشودِ کار سے تسکینِ دل کبھی نہ ہوئی
عجب نشاط تھی جو ترکِ مدعا نے دی

کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے
پھر چمن اور آشیانہ اور ہی
ہاں دلِ بے تاب چندے انتظار
امن و راحت کا ٹھکانہ اور ہی
شمع بھبکی، رات کم، محفل اداس
اب مغنی کا ترانہ اور ہی
اتفاقی ہے یہاں کا ارتباط
سب ہیں بیگانے یگانہ اور ہی

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے
راحت طلبی موجبِ راحت نہیں ہوتی

باایں ہمہ درماندگی انسان کے یہ دعوے
کیا ذاتِ شریف ان کو بنایا ہی خدا نے

ہے آج رُخ ہوا کا موافق تو چل نکل
کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے

برسات

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا
ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا
گھٹا کے جو آنے کی آہٹ ہوئی
ہوا میں بھی اک سنسناہٹ ہوئی
گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی
تو بے جان مٹی میں جان آگئی
زمیں سبزے سے لہلہانے لگی
کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی
جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل
عجب بیل پتے عجب پھول پھل
ہر اک پیڑ کا اک نیا ڈھنگ ہے
ہر اک پھول کا اک نیا رنگ ہے
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا
وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا
ہزاروں پھدکنے لگے جانور
نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا
میں اور کے گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیاناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
ڑی ، پتھر تمام ہیں گرم

خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت   پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری   میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم   سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی   کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی
اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور   ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت   بھڑکی اُس کی رگ حمیت
بولا للکار کر کہ آؤ لو   میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گذرو جو ہو سکے کچھ احسان   ڈالو مردہ زمیں میں جان
یارو یہ ہچر مچر کہاں تک   اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر جو کرو گے جاں فشانی   میدان پہ پھیر دو گے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں   آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ   دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت   کی اُس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرأت جو اُس سخی کی   دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا   قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار   بارش لگی ہونے موسلا دھار
پانی پانی ہوا بیا باں   سیراب ہوئے چمن خیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت   اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت
جرأت قطرہ کی کر گئی کام   باقی ہے جہاں میں آج تک نام

نظم بے قافیہ تاروں بھری رات (۱)

ارے چھوٹے چھوٹے تارو   کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہوئے   مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر   جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے   کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں
گہر اور لعل گویا

جو ہیں آفتاب تاباں   نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم   یہ تمھاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں   بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی   نہ میسر آتی اون کو
تو غریب جنگلوں میں   یوں ہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس وچپ کی   نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشان راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے   وہ امیدوار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی   کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں گہہ رہا ہے خرمن   کہیں آنکھ اُن کی جھپکی
یوں ہی شام سے سحر تک   ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ   نہ شمار وقت وساعت

مگر اے چمکنے والو! ہو تمھیں ، انھیں سمجھاتے
کہ گئی ہے رات آدھی

وہ جہاز جن کے آگے ہے وسیع بحر اعظم
انھیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے کوئی آ رہا ہے واپس
انھیں کچھ خبر نہیں ہے کہ کدھر ہے اُن کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ جو کی نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اے فلک کے تارو
تمھیں ان کے رہنما ہو!

سیّد اکبر حسین اکبرؔ

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، میر تفضل حسین کے بیٹے، الہ آباد وطن ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے، جہاں اُن کے چچا تحصیلدار تھے، بچپن ہی سے آثار ذہانت فرزانگی ان کے ناصیۂ اقبال پر درخشاں تھے،

۱۲۸۴ھ ۱۸۶۷ء میں وکالت درجہ اولی کا امتحان پاس کیا، ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور ایک سال بعد ہائی کورٹ میں مسل خواں ہو گئے، مگر اُن کی ترقی خواہ طبیعت کے لئے یہ سہارا کافی نہیں ہوا، ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ کی وکالت میں کامیابی حاصل کی، اور چند برسوں کے بعد منصف مقرر ہو گئے،

انگریزی بطور خود دیکھی تھی، مگر عہدۂ منصفی میں قانونی قابلیت کے ایسے گراں قدر

جوہر اُن سے نمایاں ہوئے کہ سب ججی پر اُن کو ترقی دی گئی، پانچ سال نہیں گذرے تھے کہ ڈسٹرکٹ و سشن ججی کے لئے اُن پر نظر پڑی، اور اُسکی قائم مقامی اُنھوں نے سالہا سال کی ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۳ء میں اپنے مستقل عہدۂ ججی عدالت خفیفہ سے پنشن پر سبکدوشی ہو کر خانہ نشین ہو گئے اور گورنمنٹ نے بطور اعتراف خدمت کے "خان بہادر" کا خطاب عنایت کیا،

شعر و سخن کا ذوق ان کو بچپن سے تھا، کچھ دنوں مولوی وحید الدین[لہ] وحید رئیس کو

[لہ] مولوی وحید الدین وحید کڑہ ضلع الہ آباد کے رہنے والے عالی خاندان اور ذی وجاہت بزرگ تھے، ایک بھائی مولوی رفیع الدین مرحوم لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے، میرے بچپن میں اُن کی وکالت اچھی تھی اور مہمان نوازی میں بہت مشہور تھے،

مولوی وحید الدین کہنہ سال اور کہنہ مشق شاعر تھے، مصحفی کا زمانہ انھوں نے پایا تھا، اور ان سے مشورۂ سخن کیا تھا، الہ آباد کے اکثر شعرا ان کے شاگرد تھے، تحصیل علم کے لیے پہلی مرتبہ جو مجھکو سفر کا اتفاق ہوا تو میں الہ آباد گیا، اس وقت چودہ پندرہ برس کا سن تھا، وہاں پہنچکر دیکھا کہ وحید میاں کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا، یوں تو منشی غلام غوث خاں بیخبر، مولوی غلام امام شہید، محمد جان حسرت، حکیم خلیل الدین خاں وغیرہ سبھی اپنے اپنے رنگ میں خوشگو سمجھے جاتے تھے، مگر وحید میاں کا نام بہت وقار اور عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا، ایکمرتبہ وحید کے گھر میں آگ لگی، انکو اپنا دیوان یاد آیا جو ساری عمر کی کمائی تھی، اسکے نکالنے کو کوٹھری میں گھسے، دیوان تو ہاتھ آگیا، مگر دھواں اتنا بھر گیا تھا کہ نکلنے کو انکو راستہ نہ سوجھا، جب لوگ تلاش کرتے ہوئے مکان کے اندر گھسے تو دیکھا کہ دیوان ہاتھ میں ہے، ایک کرسی پر بیٹھے ہیں، اور دم نکل چکا ہے، بچپن کے سنے ہوئے دو شعر اُن کے یاد ہیں،

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
ہم نے اپنے آشیانے کے لئے — جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

ضلع الہ آباد سے جو مصحفی کے شاگرد تھے مشق سخن کی، اور باوجودیکہ ساری عمر سرکاری ملازمت اور عہدہ ہائے جلیلہ کی ذمہ داریوں میں بسر کی، مگر چونکہ شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، ان مخصوصوں پر بھی شاعری ترقی کرتی رہی،

جس زمانہ میں الہ آباد میں پڑھنے کو گیا ہوں، اکبر کی شاعری کا آغاز تھا، ان کے چھوٹے بھائی اکبر حسن رستم اور نسبتی بھائی میر کاظم علی سے ہر وقت یکجائی رہتی تھی، اُس وقت اکبر کی نظمیں اودھ پنچ میں چھپا کرتی تھیں اور اُن کی شوخی اور ظرافت کا چرچا رہا کرتا تھا، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اکبر روم و روس کی جنگ کا حال نظم کر رہے ہیں، خدا جانے انجام کو پہنچایا نہیں، اُسی زمانہ میں اُنھوں نے مسٹر بلنٹ کی فیوچر آف اسلام کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا "جنگ روم و روس" کا دلوں پر اثر غالب تھا، لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور قدردانی کی، پنشن لے کر خانہ نشین ہونے کے بعد اُن کی شاعری چمکی، اور زمانے کے میلان عام اور جدید طرز معاشرت کی خرابیوں کا جو اثر ان کے دل پر پڑا ہوا تھا، اُس کو ظرافت کے پردے میں ظاہر کرنے کی راہ اُنھوں نے ڈھونڈھ نکالی،

میرے دوست شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن (حالی خان بہادر جسٹس عبدالقادر) نے ایک بار مخزن میں اُنکے کلام پر بحث کرتے ہوئے خوب لکھا ہی، جو انہی کے لفظوں میں سننے کے قابل ہے

> ایک دن میرے ایک طباع دوست نے جو خود ایک نامور شاعر ہیں مجھ سے پوچھا کہ تمھارے نزدیک اکبر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اکبر روشنخیالی کے ساتھ مشرق کی سچی محبت کا واعظ ہی، اس کے نزدیک ہر مشرقی نژاد کا فرض ہی کہ اپنے وطن سے محبت رکھے، اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا آداب ملحوظ رکھے، اور اپنے ہر رسم و رواج کو صرف اسلئے مذموم نہ سمجھے کہ وہ کسی مغربی رسم و رواج کے

خلاف ہے، بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر نازاں ہو، اپنے ماضی سے واقف ہو، اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے، یہ خیالات اس زور اور اس خوبی کے ساتھ معاصرین میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتے،

میرے دوست نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور یہ کہا کہ تمام باتیں جو آپ نے بیان کیں اکبر کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ایسی بہت سی اور جو گنی جا سکتی ہیں، مگر آپ نے نہیں گنیں لیکن میں ان سب کو ایک مرکب لفظ میں ادا کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اکبر لسان العصر ہے"

اکبر کے لئے "لسان العصر" کا خطاب اتنا موزوں ثابت ہوا کہ ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک اس کی صدائے بازگشت پہنچ گئی، اور گورنمنٹ کے دیئے ہوئے خطاب سے اُس نے زیادہ مقبولیت حاصل کی،

افسوس ہے کہ سنہ ۱۳۴۰ھ کو لسان العصر کی زبان بند ہو گئی اور جس منزل کی وہ دوسروں کو یاد اور زاد راہ کے مہیا کرنے کی رغبت دلایا کرتے تھے، وہی آخر کار ان کو پیش آگئی، ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ان کے کلیات کی تین جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، اور سنا ہے کہ خواجہ حسن نظامی ان کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں،

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مری آنکھوں سے ہے کیفیت مستی دل پیدا
لب ساغر سے افشا ہو رہا ہے راز مینا کا

ملا ہے ہم کو یہ مضمون روشن چشم بینا سے
کہ چھوڑی جس نے خود بینی اُسے سب کچھ نظر آیا

ہے صاف عیاں رُخ سے عیاں جوش جوانی
آنکھوں سے سنبھلتا نہیں مستانہ پن اُنکا

دیکھنے سے شوق پیدا شوق سے پیدا طلب
آفتِ دل آنکھ تھی دل آفتِ جاں ہو گیا

اک جھلک اُن کی دیکھ لی تھی کبھی
وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

جو دل میں آتی ہے اے واعظ نہیں کہتی
سکوت خوب ہے لیکن تمھیں نے کیوں نہ کیا

ضبط سے کام لیا دل نے تو کیا فخر کروں
اس میں کیا عشق کی عزت تھی کہ رسوا نہ ہوا

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا
یہ طرز احسان کرنے کا تمھیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا

حلاوت زندگانی کی کہاں اس تلخ کامی میں
خدا کا حکم ہے جیتے ہیں اے اکبر مزا کیسا

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول
یہ بات منحصر ہے تمھاری نگاہ پر

نہ سحرِ چشمِ جاناں ہے نہ لطفِ غمزۂ ساقی
تو پھر صحنِ چمن میں دیدۂ نرگس سے کیا حاصل

ترچھی چتون سے خدا جانے وہ دیکھیں مجھے کب
موت کا وقت کسی شخص کو معلوم نہیں

ادھر ہم سے بھی بات آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی
اُدھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں

ہو جس طرف طبیعت لازم ہے شوقِ کامل
ہر بات میں اثر ہے، ہر رنگ میں مزا ہے

کچھ قدر نہ کی عہدِ جوانی کی صد افسوس
ہم رہ گئے غفلت میں یہ آیا بھی گیا بھی

میں سمجھ گیا وہی ہے مرے پردۂ نفس میں
مجھے اب تو سانس لینا بھی ہے لطفِ زندگانی

میرے حواسِ عشق میں کیا کم ہیں منتشر
مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے

اسبابِ انتشارِ جنوں مجھ سے چھن گئے
مطلب یہ ہے کہ عشق و جوانی کے دن گئے

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اُس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

حضرتِ منصور انا بھی کہہ رہے ہیں حق کیساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

اخلاقی تعلیم ظرافت کے پیرایہ میں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا   کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مغوی کو بھی بد نہ کہئے ترغیب ہے یہ   کس سے میں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ

شیطان کو رجیم کہدیا تھا اک دن   اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے   بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے، صابون بھی ہے
لیکن میں پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی   یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اڑ جائے   مطلب کی کہوں تو پالسی میں اڑ جائے
باقی سہر قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش   غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اڑ جائے

جینا تھا جس قدر ہمیں دنیا میں جی لئے   ساغر کئی طرح کے ملے اور پی لئے
غم بھی رہا، خوشی بھی، تحیر بھی، فکر بھی   جاتے ہیں اب کہ آئے تھے ہم بس اسی لئے

عمل اُن سے ہوا رخصت عقیدے میں خلل آیا   کوئی پوچھے کہ اُن کے ہاتھ کیا نعم البدل آیا
محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے   تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اچھل آیا

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں میخانوں میں   واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

آج بنگلہ میں مرے آئی تھی آواز اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

زوالِ قوم کی تو ابتدا وہی تھی کہ جب
تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر لی۔

صبر، خود داری، دلیری، حق پرستی اب کہاں
رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے

فٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

حریفوں نے رپٹ لکھوائی جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اب تو اکبر بار ہے ہم پر نماز عید بھی
تم اگر رکھ سکتے ہو روزہ خدا روزی کرے

اغیار تو دنیا میں اٹھائے ہوئے سر ہیں
ہم بیٹھے ہیں اس طرح کہ اٹھتا نہیں سر بھی

اعدا تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف
ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اُس بت کی کمر بھی

دیر میں محوِ بت بھی ہو وعظ میں قبلہ رو بھی ہو
شیخ ہمارا خوب ہے پیر بھی ہے گرو بھی ہے

وضعِ مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلّی نہ ہوئی
ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقی نہ ہوئی

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے
کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے
یہی ہے عقدہ کشائی قوم تو اک دن
ازار بند کو کہدیں گے حبس بیجا ہے

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

حواس مختل سمجھ پریشان عمل میں سستی قدم میں لغزش
کبھی کوئی شوق رہنما ہے کبھی کوئی پالسی ہے غالب
مرے مشاغل کی کچھ نہ پوچھو کہ میں ہوں اور فلک میں اکبر
مقیمِ دیر دہر پیرِ شیخ و اسیرِ قانون و نحوِ مغرب

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر
فضلِ خدا سے بت ہی نہیں آئے راہ پر

گذر ان کا ہوا کب عالمِ اللہ اکبر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

اُس نے میدان میں سر دے کے کیا قوم کا نام آپ بنگلے میں منایا ہی کئے جان کی خیر
پارٹی کچھ بھی نہیں جب نہ ہو ذوقِ طاعت قوم کی خیر نہیں جب نہیں ایمان کی خیر

لطف چاہو اک بتِ نوخیز کو راضی کرو نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو
لیڈری چاہو تو لفظِ قوم ہے مہمان نواز گپ نویسوں کو اور اہلِ میز کو راضی کرو
طاعت و امنِ سکوں کا دل کو لیکن ہو جو شوق صبر پر طبعِ ہوس انگیز کو راضی کرو

معاذ اللہ غفلت باریاں یہ ابرِ مغرب کی کوئی آلودۂ آز، کوئی صرفِ جوانی ہے

ضمیمہ نمبر ۱

مراثی کا بیان

عرب میں شاعری کی ابتدا اظہارِ جذبات سے ہوئی تھی، اس لئے سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی، جو سب سے قوی تر جذبہ ہے، فارسی شاعری کی بنیاد تکلف، آورد اور مداحی پر قائم ہوئی تھی، اس لئے اُس کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی، اور اس لئے شاعری کے وہ انواع جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا، دفعۃً پستی کی حالت میں آگئے تاہم چونکہ آغاز میں ہر چیز میں فطرت کا اثر پایا جاتا ہے، اس لئے قدماء کی شاعری میں جا بجا جذبات کا اظہار خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے،

اردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی، وہاں شروع سے مرثیہ گو پیدا ہو گئے علی عادل شاہ کے زمانہ میں ایک مرثیہ گو تھا جو اردو میں مرثیہ کہتا تھا، اور بادشاہ کے اصرار پر بھی اُس نے اپنی زبان کو بادشاہ کی تعریف سے آلودہ نہیں کیا جب تک جیتا رہا صرف مرثیے کہتا رہا،

مولانا نصرتی کا دیوان مفقود ہے ورنہ معلوم ہوتا کہ دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ اُنھوں نے مرثیہ پر ہاتھ ڈالا ہے یا نہیں، محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں معتد بہ حصہ مراثی کا ہے،

ابو الحسن تانا شاہ کے زمانہ میں کثرت سے مرثیہ گو تھے جو اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے اُن میں سے شاہ قلی خاں شاہی تخلص بڑے اچھے شاعر تھے، میر حسن اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ

کہ شاید ان کا کلام ہاتھوں ہاتھ دکن سے ہندوستان لایا کرتے تھے، دکن کے شعراء میں سب سے پہلے ولی کا دیوان دلی میں آیا ہے، اور وہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے، ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے،

میر و مرزا کے زمانہ میں میاں مسکین مرثیہ گو تھے، سودا نے ان کا نام شہر آشوب میں لیا ہے، اس وقت تک عموماً مرثیے چہ مصرع ہوا کرتے تھے، غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو ان کے دیوان میں موجود ہے، اور اردو میں مرثیہ کی وسعت و ترقی کا پہلا قدم ہے، کیونکہ چہ مصرع میں اوّل سے آخر تک ایک خاص قافیہ کی پابندی کی وجہ سے ہر قسم کے مطالب ادا نہیں کئے جا سکتے تھے،

اسی زمانہ میں میاں سکندر ایک مرثیہ گو گذرے ہیں، ان کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، ان کے بعد میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، میاں فصیح کا نام لیا جاتا ہے، اگر اس وقت تک مرثیے کم و بیش تیس تیس بند کے ہوتے تھے، اور ان میں حزن و غم کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا، اور شاعری کے دربار سے ان کی کچھ عزت و حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی، اس زمانہ کی یہ مثل مشہور ہے، "بگڑا شاعر مرثیہ گو، اور بگڑا گویا مرثیہ خوان"!

جہاں تک معلوم ہوا ہے، سب سے پہلے میر مظفر حسین ضمیر نے اس میں جدتیں پیدا کیں اور جس نظم کی بنیاد محض درد و غم پر تھی، اس میں گھوڑے، تلوار وغیرہ اسلحۂ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے، سراپا ایجاد کیا، واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، لڑائی کے داؤں پیچ اور اس کے ٹھاٹھ کا خاکہ کھینچا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی، اور سوز خوانی کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی،

میر انیس و مرزا دبیر نے اس بنیاد پر ایک بلند و مستحکم عمارت کھڑی کر دی، بیان کرنے

کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیئے، ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا، مناظرِ قدرت کی ایسی تصویریں کھینچیں کہ فارسی شاعری میں بھی اس کا نمونہ مشکل سے ملے گا، اسی طرح جذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی کر کے اردو شاعری کو پستی سے بلندی پر پہنچا دیا،

سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حصہ کو اردو شاعری سے نکال لو تو پھر اس میں سوا خد و خال اور گل و بلبل کے کچھ نہیں رہ جاتا، اور اردو شاعری کی تاریخ نامکمل رہیگی، اگر اس میں اس کا ذکر نہ کیا جائے،

مرزا سلامت علی دبیر

(مرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص، مرزا غلام حسین والد کا نام تھا، کہتے ہیں کہ سنہ ۱۲۱۸ھ کو دلی میں پیدا ہوئے، چھ سات برس کی عمر میں باپ کے ساتھ لکھنؤ آئے، فارسی اور عربی کی کتابیں لکھنؤ کے نامور علماء سے پڑھیں،

حیاتِ دبیر کے مصنف نے لکھا ہے کہ درسی کتابیں ان کی لکھی ہوئی تھیں، مولوی غلام ضامن اور مرزا کاظم علی اخباری وغیرہ علماء کے شاگرد رہے، اور استعداد علمی فاضلانہ رکھتے تھے،

شعر و سخن سے قدرتی مناسبت تھی، میر مظفر حسین ضمیر اس زمانہ کے مرثیہ گو شاعروں میں بہت ممتاز تھے، ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہوتے ان کو بھی ذوق پیدا ہوا، اور پھر ان کے شاگرد ہو گئے،

جو کچھ استاد سے پایا اسے بقول آزاد بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا، جو مرثیے

بیس تیس بند سے آگے نہ بڑھتے تھے، ان کو دو ڈھائی سو تک پہنچایا، شوکت الفاظ مضامین کی آمد، اُس میں جابجا غم انگیز اشارے، اور درد خیز کنائے، الم ناک و دلگداز انداز جو مرثیہ کی اصلی غرض ہے، ان وصفوں میں وہ میر انیس سے ممتاز ہیں،

کچھ شک نہیں کہ میر انیس زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتے، مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہیں، یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے ایسے عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُن کے حریفوں کا طائر وہم بھی پرواز نہیں کر سکتا، بقول علامہ شبلی خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں،

مگر میری رائے میں اس فیصلہ کا یہ مطلب نکالنا خطرناک غلطی ہے کہ مرزا دبیر زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری ہیں، یا میر صاحب قوت متخیلہ میں بالکل ہیچ ہیں، اور ان کے ہاں عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں نہیں ہیں، ایسا خیال کرنا ان دونوں بزرگوں کے دامن کمال پر دھبہ لگانا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ہر شاعر کا رنگ طبیعت، انداز بیان اور طرز مذاق مخصوص قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک چیز ایک کے ہاں افراط سے ملے گی، دوسرے کے یہاں اُس سے کم، یہی حال میر و مرزا کا بھی ہے، اس سے نہ ان کی تنقیص کیجا سکتی ہے نہ اُن کی، ع

ہر طرز میں جو خوب سے خوب ہے وہ

مرزا صاحب نے چوہتر برس کی عمر پائی، چودہ پندرہ برس کے سن سے مرثیے کہنے لگے، اس پچاس ساٹھ برس میں کم سے کم تین ہزار مرثیے لکھے ہونگے، نوحوں اور رباعیوں کا

کچھ شمار نہیں، ۳۰ محرم سنہ ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی، اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے،

صبح

گلگونۂ شفق جو ملا چہرۂ صبح نے   اسپند مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیٔ طورِ صبح نے   ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافورِ صبح نے
لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے ہر درخشاں کے چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح   سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتانِ صبح   چرخِ چہارمیں پہ گیا خطبہ خوانِ صبح
منہ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرمِ سجدہ عیسی و خورشید ہو گئے

آیا جو تیغ روز لئے شاہِ نیمروز   ماہی شکار، شیر سوار و جہاں فروز
باندھے کمر میں خنجرِ بیضائے کینہ سوز   پھر دیا جو ہفت سر ہوا سپیدِ عقابِ زرد
مہتاب لشکرِ شہِ خاور میں گھر گیا
آرہ شعاع کا سرِ انجم پہ پھر گیا

بڑھ کر نقیبِ نور پکارا سحر سحر   ذروں میں نور بھر دو آیا قمر قمر
فرمانِ نور بدر کو پہنچا بدر بدر   لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر
برقع جو اٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبحِ ملمع نقاب کا

دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیِ پرِ طاوسِ شب ہوئی
اور قطعِ زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یوسفؑ غریقِ چاہِ سیہ ناگہاں ہوا — یعنی غروبِ ماہِ تجلّی نشاں ہوا
یونسؑ دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا — یعنی طلوعِ نیرِ مشرق شاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیمؑ اور یدِ بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا کہ چرخ کا جیبِ دریدہ تھا — یا چہرۂ مسیحؑ کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ چرخ کا اشکِ چکیدہ تھا — یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہئے نہ مہرِ صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امیدِ اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

نکلا اُفق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح — محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیرِ صبح — ہر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیرِ صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا — پھر مشکِ شب جہاں سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہو گیا — باطل رسالۂ شبِ دیجور ہو گیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کے ذرّوں کے نامے میں

گرمی کی شدّت

وہ دھوپ کہ مرغانِ ہوا کرتے ہیں نالا — بس ہاتھ دھرا قبضہ پہ اور پڑ گیا چھالا
بریاں ہوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا — اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہِ دیں پر

نایاب ہیں مرغانِ ہوا صورتِ عنقا — بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لبِ دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا — پر اوجِ امامت کا ہما رن میں ہے تنہا
کیا قہر ہے سایہ نہیں اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے پانی نہیں اور پیاس کڑی ہے

دوسرے موقع پر،

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جنابؑ — گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب — خطِ غبار ہے یہی ابرِ سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی — رنگت ہے برجِ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی — شدّت ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی

فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی
آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش　آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوزِ جگر سے مردمِ آبی ہیں نالہ کش　نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں
تر دامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

آمد آمد کا کوکبہ

برہم ہیں صفیں شاہِ شہیداں کی آمد ہے　ہر مورچہ لرزہ ہے سلیماں کی ہے آمد
فرعونیوں پر موسیٰ عمراں کی ہے آمد　تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہے آمد
جن سیر کو نکلے تھے یہ رستے سے [illegible]
پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اڑے ہیں
رن میں پسرِ فاتحِ خیبر کی ہے آمد　صف گرتی ہے صف پر شہِ صفدر کی ہے آمد
تاجِ شرف و فخرِ سکندر کی ہے آمد　شاہِ شہدا سبطِ پیمبر کی ہے آمد
پیشانیٔ جن و ملک اب فرشِ زمیں پر ہے
چترِ سرِ اقدس پرِ جبریلِ امیں ہے
خورشید ہے دن کو مہِ نو شرم سے گھٹ کر　اغلب ہے کہ سیدھا فلکِ کج ہو الٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھالوں کی ہٹ کر　اک سونے کا نگ بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر
ثابت ہے کہ سیارہ ہر اک ماند ہوا ہے

سیارے ہیں کیا شہر بدر چاند ہوا ہے

فتح و ظفر و نصرت و شمشیرِ دو سر ایک   قہر و اجل و رعبِ شہِ جنّ و بشر ایک
مولا کی سپر اور فلکِ ہفتِ سپر ایک   افضالِ خدا اور نظرِ فیض اثر ایک
ہیبت ہے یہ بندے کی و یا خوفِ خدا ہے
سر خود سے، دل سینے سے، جاں تن سے جدا ہے

نے چرخ ہے، نے دشت، نہ کہسار نہ قلزم   وہ سکتہ ہے وہ گرد، وہ رعشہ، وہ تلاطم
ہے برج بھی گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم   جس طرح سے آندھی میں جدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

عباس نامدار پانی لانے کو جاتے ہیں،

عباس جبکہ جانبِ باغِ جناں چلے   شانے پہ لاکھ شان سے لیکر نشاں چلے
زوجہ نے پوچھا اے مرے والی کہاں چلے   بولے جہاں سے اب نہ پھرینگے وہاں چلے
اب آخری وداع کی باری نہ آئیگی
آئی ہے سب کی لاش ہماری نہ آئیگی

عباس سے سنا جو یہ اُس تشنہ کام نے   دنیا سیاہ ہو گئی آنکھوں کے سامنے
اک آہ کی کمر کو پکڑ کے امام نے   پردہ اٹھایا بازوے شاہِ انام نے
جھک کر ہلال برجِ فلک سے نکل گیا
نورِ نگاہ تھا کہ پلک سے نکل گیا

پاسِ ادب سے مجرے کو سب دور دور آئے   عفو قصور کے لئے کبر و غرور آئے

غل پڑ گیا جلو کے لئے فوج نور آئے
ہاں لاؤ مرکب دو دکا بحضور آئے
آیا سجا سجایا تگاور جناب کا
پاکھر کرن کے تاروں کی، زین آفتاب کا

انگلی سے لکھ کے گردنِ توسن پہ یا علی
اک جست میں سوار ہوا حق کا وہ ولی
فی الفور نور طور کے معنی ہوئے جلی
بجلی جلانا بھول کے خود رشک سے جلی
ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرم عناں ہوا
صرصر کی سانس رُک گئی جب یہ رواں ہوا

پابوسی کو رکاب کا حلقہ دہاں بنا
اور اس دھن میں پائے مبارک زباں بنا
پھر آستان خانۂ زیں آسماں بنا
عرش جلیل زینِ تجلی نشاں بنا
آنسو مگر نہ تھمتا تھا اُس راہوار کا
یعنی بھی یہ آئے گا لاشہ سوار کا

تھکنے لگا جو ہاتھ تصور عنان پر
بگڑا بنا کے منہ کہ نہ کھیل اپنی جان پر
بولی زمیں کدھر تو کہا آسمان پر
پوچھا جو آسماں نے کہا لامکان پر
یہ کہہ کے فکر و وہم کی حد سے گذر گیا
سایہ ہوا سے پوچھ رہا تھا کدھر گیا

غل ہر مکاں سے واہ کا تا لامکاں اُٹھا
ایسا جھکا کہ نہ پھر سر آسماں اٹھا
شعلہ علم کے نور کا اک ناگہاں اٹھا
جنگل میں دھوپ جل گئی کوسوں دھواں اٹھا
انسان کیسے جان جنوں کی نکل پڑی
گاوِ زمیں یہ تڑپی کہ مچھلی اچھل پڑی

تلوار کی روانی ملاحظہ ہو،

نکلی غلافِ نو سے تفسیرِ جوہری
یا آکے دستِ بوسِ سلیماں ہوئی پری
یا حجلے سے عروس نے کی جلوہ گستری
یا ہے یہ شاخِ میوۂ طوبیٰ ہری بھری
اس ہاتھ سے مرادیں تھیں جو جو وہ مل گئیں
باچھیں خوشی سے تیغ کے قبضہ کی کھل گئیں

شاخِ نیام سے ہوا اس طرح پھل جدا
پیروں کے قد سے جیسے جوانی کا بن جدا
ہستی جدا زمیں پہ تڑپی اجل جدا
خنجر جدا فلک پہ گرا اور زحل جدا
غل تھا کہ اب مصالحۂ جسم و جاں نہیں
لو تیغِ برق دم کا قدم درمیاں نہیں

سایہ بھی صاف تیغ سے فوراً جدا ہوا
مطلب ملا کہ پانی سے روغن جدا ہوا
تنہا نہ رنگ چہرۂ دشمن جدا ہوا
گردن سے سر تو روح سے بر تن جدا ہوا
پیہم صدا دلوں سے دھڑکنے کی آتی تھی
آوازِ برق اٹھتی تھی اور بیٹھ جاتی تھی

سیدھی ہوئی جو تیغ تو لشکر الٹ گیا
میداں سے ہاتھوں جینے سے دل سب کا ہٹ گیا
سٹ رہے تھے زور کو واں سے بھی گھٹ گیا
مانند ناف خوف سے سینہ سمٹ گیا
بولی یہ تیغ دم سرِ اعدا پہ لوں گی میں
برش پکاری توبہ ٹھہرنے نہ دونگی میں

بڑھتی ہوئی زباں سے یہ لافتا چلی
روشن نگاہ کہنے کو آگے قضا چلی
بائیں کو قہر داہنے جانب بلا چلی
بالکل چراغِ عمر ہوئے گل ہوا چلی

کہئے نہ تیغ دولھا کو برچھی لگائی تھی
ان پر حسنؑ کی آہ نے بجلی گرائی تھی
پھل وزن میں تھا پھول تجلی میں نخلِ طور　　گرمی میں محض نار تو نرمی میں صاف نور
آسیب سایہ چال پری قبضہ چشم نور　　خود نہر آب زہر تڑپ قہر شور صور
یوں دفعتہً زمیں سے گئی آسمان پر
جس طرح غصہ آئے کسی ناتوان پر
پھر تو بکار تھی یہ ادھر وہ اُدھر گرا　　وہ پنجہ وہ ہاتھ وہ خود اور وہ سر گرا
بن بن کے برق سایۂ تیغِ ظفر گرا　　واں مورچہ سے باپ ٹھایاں پسر گرا
گر گر کے سر یہ رن میں برابر طبیاں ہوئے
جو رن میں سر زمین کے معنی عیاں ہوئے
چہروں پہ مردنی کی طرح تیغ چھا گئی　　ہر استخواں میں مثلِ تپِ دق سما گئی
اعجاز خاکساریِ حیدر دکھا گئی　　مانند خاک ناریوں کے تن جلا گئی
سب کے گلوں سے ملتی تھی لیکن رکی ہوئی
جوہر یہ تھے کہ بوجھ سے خود تھی جھکی ہوئی
آتے تھے جوڑ تو تعجب تیغ تیز کو　　سر سے گری جدا کیا پائے گریز کو
اپنے سے گرم دیکھ کے اس شعلہ ریز کو　　برق و شرر نے نذر کیا جستُ خیز کو
بو گل نے رنگ لالے نے سرعت ہوا نے دی
یہ ہدیہ کیا ہے اپنی نیابت قضا نے دی
قربانِ برق و بارقۂ تیغ شعلہ تاب　　موتی کی آب و تاب سمندر کا پیچ و تاب

خود نوح خود سفینہ و خود ماہی و خود آب   سرگوشیاں فرات میں کرنے لگے حباب
ظرفِ تنگ میں تھی نہ جگہ آب نہ تاب کی
بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی

کانٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو   پاؤں میں کجروی کو سروں میں غرور کو
سینہ میں بغض و کینہ کو دل میں فتور کو   نیت میں معصیت کو طبیعت میں زور کو
ذات اک طرف مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو

عباسؓ فرات پر تو پہونچ گئے، مگر پانی پینے سے وفاداری روکتی ہے،

چلو بھر فرات سے سرکا کے آستیں   عبرت سے دیر تک اسے دیکھا کئے وہیں
پھر لائے امتحاں کیلئے ہونٹوں کے قریں   سینہ میں دل تڑپ کے پکارا نہیں نہیں
گو نہر فاطمہ ہے پہ مجھ پر حرام ہے
ہفتم سے فاطمہ کا پسر تشنہ کام ہے

پانی جو پے حسینؑ کے منہ سے لگائیگا   ہے ہے وفا کا نام ابھی ڈوب جائیگا
اس وقت آبرو جو گئی پھر نہ پائیگا   یہ روز اب زمانے میں کاہے کو آئیگا
حضرت کہاں، فرات کہاں، کربلا کہاں
تا عصر خاتمہ ہے یہ دکھ، یہ بلا کہاں

غازی نے دل کے شوق سے پر مرحبا کہا   دریا سے رو کے پیاسوں کا سب ماجرا کہا
کاندھے پہ مشک بھر کے رکھی یا خدا کہا   چلتے ہوئے اجل نے پیام قضا کہا
ہے ہے نصیب پیاسوں کا رستے میں پھر گیا

سقہ حرم کا فوج میں طوفاں کے گھر گیا

علی اصغر کا پیاس کے مارے حال بیحال ہے،

سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم   پھیلائے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیہ پہ سر ڈھلا ہوا دیکھتے ہیں دم بدم   چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم
قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں

آخر کہا یہ سب نے بلاؤ امام کو   لاؤ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو   نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو
اکبر کی لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں
کوئی پکار لو وہ ابھی ہوں گے راہ میں

مظلوم کربلا شیر خوار بچہ کو لیکر پانی مانگنے کے لئے جاتے ہیں،

ہاتھوں پہ لیکے اسکو چلے شاہ اتقیا   اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
نکلا ہی دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا   اصغر پہ ماں نے ڈال دی اجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرہ پُر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفا   لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہونگا کیا
نے پانی مانگنا آتا ہے مجکو نہ التجا   منت بھی گر کرونگا تو وہ دیں گے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے   چاہا کریں سوال، یہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے   چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمھارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گر میں بقولِ شمر و عمر ہوں گناہ گار   یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
شش ماہہ بے زبان نبی زادہ شیر خوار   ہفتم سے سب کے ساتھ پیاسا ہی بیقرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زبان ہے تمھیں کچھ خیال ہے   در نجف ہے بانوے بیکس کا لال ہے
لو مان لو تمھیں قسم ذوالجلال ہے   یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علی کا تم سے طلب گار آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر ہونٹھ بے زبان کے چومے جھکا کے سر   رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر   سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

میر ببر علی انیس

(میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن کے پوتے اور میر ضاحک کے پرپوتے تھے، ان کی بکہ

ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلّٰی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی، اور انھیں بھی اس پر ناز تھا، ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سے پڑھیں، اور ضروریات فن سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد ہوئے، اور جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا، اس وقت سے تمام عمر اسی میں صرف کر دی،

بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیئے، ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کرکے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا، اور زبان کا ایک معتدبہ حصہ جس کو اب تک شاعروں کے قلم نے مس تک نہیں کیا تھا، اور جو محض اہلِ زبان کی بول چال میں محدود تھا، اس کو شعراء سے روشناس کر دیا، بقول مولانا حالی کے اردو شاعری میں جو ماء راکد کی طرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا،

مولوی محمد حسین آزاد نے آبحیات میں ٹھیک لکھا ہے کہ شاہنامہ کے ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں، انھوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیئے، ایک مقرری مضمون کو سینکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا، ہر مرثیہ کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا، اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقابلہ نیا، اور اس پر کیا منحصر ہے، صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شامِ غریباں کی اُداسی، کبھی رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے، غرض جس حالت کو لیا ہے، اُس کا سماں باندھ دیا ہے"

میر امجد علی اشہری نے حیاتِ انیس میں اور مولانا شبلیؒ نے موازنۂ انیس و دبیر میں ان کے شاعرانہ کمال کو جس جس رنگ سے ظاہر کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے،

میر انیسؔ کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہوا ہے، ان کی ابتدائی مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ کثرت سے متداول تھے، اور شعرا بے تکلف استعمال کرتے تھے، وہ ان کے ہاں بھی ابتدائی کلام میں پائے جاتے ہیں، پھر جس قدر زمانہ گذرتا گیا ان الفاظ اور ترکیبوں کو چھوڑتے گئے،

میر انیسؔ نے تہتر برس کی عمر پائی، غدر سے پہلے ان کو لکھنؤ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، غدر کے بعد اوّل اوّل نواب قاسم علی خاں کے اصرار سے عظیم آباد تشریف لے گئے، اور وہاں کی مجلس عزا میں اپنی شاعری کے زور اور بے مثل پڑھنے سے قیامت برپا کر دی، پھر ایک مرتبہ سیّد شریف حسین خان کی تحریک سے حیدر آباد تشریف لے گئے، نواب تہور جنگ بہادر نے ان کی شان کے موافق خیر مقدم کیا، سامعین کی مجلسوں میں بہ کثرت ہوتی تھی، کہ صدہا لوگوں کو سننے کی حسرت رہ جاتی تھی،

میر صاحب کا کلام جس طرح لاجواب ہے، ان کا پڑھنا بھی بے مثل تھا، ان کی آواز، قد و قامت، صورت کا انداز غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی، ان کا قاعدہ تھا کہ پہلے خلوت میں بڑا آئینہ سامنے رکھ کر بیٹھتے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے، وضع، حرکات سکنات اور بات بات کو دیکھتے اور آپ ہی اُسکی موزونی و ناموزونی کو اصلاح دیتے تھے، آخرکار ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی، اور سبزی منڈی میں اپنے ایک مکان کے اندر مدفون ہوئے،

نور کا تڑکا

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور   یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور   خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انسان زمیں پہ محو، ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیِ شفق کی ادھر چرخ پر بہار   وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار   پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ،

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم   مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم   سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار   تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار   کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

ایک اور موقع پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا   دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا   سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار   پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار   بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

گرمی کا سماں،

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب   کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب   خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور   جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر   خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں
کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار   اک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ہنستا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت،

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت سونلا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہرے پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

گھوڑے کی جست و خیز

وہ جست و خیز و سرعتِ چالاکیِ سمند سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُسکے جوڑ بند
سم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ پھر گیا
اترا براق بن کے پری ہو کے اڑ گیا

جرأت میں شکلِ شیر تو ہیکل میں پیلتن پویہ کے وقت کبکِ دری جست میں ہرن

بجلی کسی جگہ تو کہیں ابرِ قطرہ زن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں تھی زلف حور سے خوشبو ایال کی
دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرامِ ناز میں شاگرد چال کی
غصہ میں جست شیر کی، شوخی غزال کی
وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن براق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصہ میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھیے
بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
وہ تھوتھنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھکر

تلوار کی روانی

بجلی گری کہ فوج پہ تیغِ دو سر گری
کٹ کر کسی کی تیغ، کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ، کبھی فرق پر گری
سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری
زرہیں تنوں پہ مثلِ کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر
بہتی ہے جس کی آگ سے کوسوں لہو کی نہر
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کے جس کے نہیں ہے لہر
اتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر

زخموں سے جسم ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندانِ مار ہیں
غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری   برچھی سے اڑ گئی وہ سناں یہ گرہ گری
ترکش کٹا، کمانِ کیانی سے زہ گری   یہ سر اُٹھا، وہ خود اُڑا، یہ زرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برقِ قہرِ الٰہی اسی طرح
ہر ہات میں اڑا کے کلائی نکل گئی   کوندی گری زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی   مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی
چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

دیگر

خم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب   آتش کسی جگہ، کہیں بجلی، کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر کہ آگئی تاب   تیزی یہ بال میں ہو کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا
پیاسی بھی خون فوج کی اور آبدار بھی   غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی، ابر تر بھی، خزاں بھی بہار بھی   تلوار بھی چھری بھی سپر بھی، کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفت جہاں تھی لگانے بجھانے میں

ہنگامۂ جنگ

نقارۂ وغا پہ لگی چوب یک بیک   اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک   قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شورِ دہل تھا حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد   مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد   تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد   ہلتے تھے کوہ کانپتا تھا وادیِ نبرد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد   خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا کی گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشمِ دہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

حملہ کا زور شور

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے   اڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے   صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے
طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

× جنگل میں تھی علم جو وہ تیغ شررفشاں   تھرا گئے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
غار اژدروں سے چھٹ گئی شیروں سے نیستاں   برپا تھا بر و بحر میں اک شور الاماں
مانند موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر   تھیں موج کی طرح سب اُدھر کی صفیں اِدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور   پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارہ کو چھوڑ کے

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر   شیروں سے دشت گرگ سے بن اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر   اڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور
سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن میں ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرادیئے پر کانپ کانپ کے

دو حریفوں کی معرکہ آرائی

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی لگاں   چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں   ڈانڈ آئے ڈانڈ پہ تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر   قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر

دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر   جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو اُنگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اُٹھا کے جب   قبضہ میں لی کمانِ کیانی بصد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب   تیوری چڑھائی قاسمِ نوشاہ نے بھی تب
تیرِ نگاہ سے وہ خطاکار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اُتر گیا

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بدخصال   جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ، حسن کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال   اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اُس کی سپر سے ڈھال
اوجھڑ لگی کہ ہوش اُڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیئے سر پر سمند کے

عباسِؑ نامدار نے پہلو سے دی صدا   ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا   سنتے ہی بس فرس کو فرس سے کیا جدا
گھوڑا ابھی اس طرف کو اُدھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

امام کی بےکسی اور دشمنوں کا نرغہ

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے   ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اُس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے   یاں نہ بیٹا، نہ بھتیجا، نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسوں کو ہے شور ستمگاروں میں
زخمی بازو ہیں، کمر خم ہے، بدن میں نہیں تاب   ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے پاؤں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں ہیں پُرآب   تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کے جواب
شدتِ ضعف سے جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیرِ ستم تن سے گذر جاتے ہیں
گیسو آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے   شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سوفاروں سے   لاکھ آفت میں ہے اک جان دل آزاروں سے
فکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی
وار سے تیغوں کے فرصت نہیں دم لینے کی
خون میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے   ہے جبیں چاند سی پُر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب تیروں سے جو تا بہ کمر زخمی ہے   تیر بیداد سے دل زخمی، جگر زخمی ہے
ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں
برچھی اگر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے   مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے   بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے
گرد زہرا و علی گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دوجہاں گرتے ہیں

مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اتنی بات صاف کہنی چاہیے کہ حضرات اہل بیت اطہار

رضوان اللہ علیہم اجمعین، کی اصلی شان دکھانے میں مرثیہ گویوں نے بڑی کمی کی ہے، اکثر وقار وثبات کو جزع و فزع و اضطراب تک پہنچا دیا ہے، بیبیوں کی شان اُس پیرایہ میں لکھی ہی جس سے معلوم ہو کہ یہ نہایت بزدل اور خوف زدہ، دکھ کی ماری ہستی محو نوحہ و بکا ہے، حالانکہ وہ پاک بزرگ ان کمزوریوں سے بہر حال دور تھے، مدعا عوام کو رلانا تڑپانا تھا، اس نے مراثی کا پایہ بہت پست کر دیا ہے، شاعری میں جان پڑی ہو، مگر اخلاقی و مذہبی پہلو مفلوج ہو کر رہ گیا، شہادت نامہ خواہ کتنا ہی موثر ہو گیا، مگر وقائع نگاری کا خون ہو گیا،

ضمیمہ نمبر ۲

اس کتاب میں میرے والد بزرگوار کا ذکر کئی جگہ آیا ہے، نیز اس لئے کہ وہ بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے مورخ تھے، اُن کے حالات زندگی کے بیان کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں، جہاں تک ممکن ہے اختصار کے ساتھ لکھونگا، تاکہ جو حالات مجھے معلوم ہیں وہ اُن کی اکثر تصنیفات کی طرح ضائع نہ ہو جائیں،

مرحوم کا اسم گرامی مولوی سید فخر الدین، اُن کے والد کا نام مولوی سید عبد العلی، سادات قطبیہ حسینیہ کے چشم و چراغ تھے، نسب کا اتصال امام حسن مثنیٰ خلف الصدق سبط اکبر امام حسن مجتبیٰ سے ہوتا ہے، حسن مثنیٰ اپنے عم نامدار شہید کربلا امام حسینؓ کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ صغریٰ سے بیاہے ہوئے تھے، اسی لحاظ سے اس خاندان کے لوگوں کو حسنی حسینی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس خاندان میں سید شاہ علیم اللہ، سید محمد ہدیؒ، سید شاہ لعلؒ، شاہ ابو سعیدؒ، شاہ محمد واضحؒ، مولانا قطب الہدیٰ محدث، مولانا محمد ظاہرؒ، مولانا خواجہ احمدؒ، مولانا ضیاء النبیؒ، سید مصطفیٰ اور سب سے زیادہ نامور حضرت سید احمد شہیدؒ بڑے زبردست علما و مشایخ گذرے ہیں

والد مرحوم کی ولادت تکیہ شاہ علیم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ میں ہوئی، کم سنی میں اپنی والدہ کے ساتھ ناگور تشریف لے گئے، جہاں ان کے والد ماجد تحصیلدار تھے، وہیں فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی سید محمد طٰہٰ نصیر آبادی اور حکیم احمد جان دہلوی سے پڑھیں، تیرہ برس کا سن تھا کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا، سرکار نے اُن کی خدمات جلیلہ پر نظر کر کے کچھ وظیفہ تعلیم مقرر کر دیا، جو عرصہ تک والد مرحوم کو ملتا رہا،

ناگور سے آنے کے بعد اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہرؒ مرحوم کے دامن تربیت میں پرورش پائی، اور شرح وقایہ تک اُن سے اور مرزا رحیم اللہ بریلوی سے وطن میں رہ کر تعلیم پائی، اپنے نانا کے وفات پانے کے بعد لکھنؤ تشریف لائے، اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور طب کی کتابیں حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے شروع کیں، شعر و سخن کا ذوق ناگور میں حکیم احمد جان کی صحبت میں پیدا ہوا تھا، پھر اپنے نانا سید محمد ظاہرؒ کی صحبت میں ترقی ہوئی، وہ علمی فضل و کمال کے ساتھ فارسی و اردو خاص کر بھاشا کے بہت اچھے شاعر تھے لکھنؤ پہونچ کر وہ شوق تازہ ہو گیا، شیخ امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہوئے اور تین برس مسلسل لکھنؤ میں رہ کر متعدد علوم و فنون کی تحصیل کی، اور خطاطی میں بھی کمال پیدا کیا، نسخ و نستعلیق و شفیعہ بہت اچھا لکھتے تھے، اور اُن کے شکستہ میں عجیب طرح کی شیرینی تھی،

لکھنؤ سے وطن گئے اور چند روز وہاں رہے، اس کے بعد وجہ معیشت حاصل کرنے کو باہر نکلے، چند روز راجپوتانہ میں، چند روز ساگر میں رہے، ساگر میں مہتمم بندوبست کے اجلاس میں نائب سررشتہ دار ہو گئے تھے، مگر شاید سال ڈیڑھ سال کے بعد کسی بات پر برہم ہو کر نوکری چھوڑ دی، اور وطن چلے آئے، کچھ دنوں رہ کر حیدرآباد روانہ ہو گئے،

اُس زمانہ میں ہر جگہ ریل نہیں تھی، یہاں سے حیدرآباد تک کہیں گھوڑے پر، کہیں ریل پر، کہیں بہلی اور تانگے پر، شاید بیس دن میں امراوتی پہنچے تھے، حیدرآباد میں چند روز کی امیدواری کے بعد کسی اسکول میں صدر مدرس مقرر ہو گئے، اور تقریباً آٹھ برس تک مختلف اضلاع میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے،

ضلع بیدر میں سید محمود اصفہانی حریفؔ تخلص سے شناسائی ہوئی، یہ یہاں صدر مدرس تھے اور وہ صدر تعلقہ دار (کمشنر) کے میر منشی تھے، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اُن سے

فارسی زبان اور محاورے کی تصحیح کی اور جب تک وہاں رہے، ان کو اپنا کلام دکھاتے رہے، حیدرآباد سے بوجہ بُعد مسافت کے ترکِ تعلق کرکے وطن آگئے، اور دو ڈیڑھ سال وطن میں رہ کر بھوپال تشریف لے گئے، وہاں بھی چند سال رہے، جب وہاں سے آئے تو عرصۂ دراز تک کہیں نہیں گئے، مرحوم کی عادت تھی کہ رخصت لیکر بہت کم آتے تھے، جب کہیں رہتے رہتے دل گھبرا جاتا تھا تو نوکری چھوڑ کر چلے آتے تھے،

عرصۂ دراز تک وطن میں رہتے رہتے جب دل گھبرایا تو ٹونک تشریف لے گئے، وہ بھی مثلِ وطن کے تھا، اکثر اعزہ دو دو چار چار پشت سے رہتے رہتے وہیں کے ہو گئے تھے، نواب ابراہیم علی خاں نے صیغۂ طبابت سے تنخواہ مقرر کر دی، دو ڈیڑھ سال رہنے کے بعد پھر وطن چلے آئے، اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں زندگی پوری کر دی، بیعتِ طریقت اپنے پھوپھا مولانا سید خواجہ احمد علیہ الرحمہ سے کی تھی، اُن کی طرف سے نیز اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر کی جانب سے خلیفۂ مجاز تھے، اور ذکر و شغل خاندانِ نقشبندیہ کے طریقے پر کرتے تھے، مگر پیری مریدی نہیں کرتے تھے،

مزاج میں خاموشی، متانت، حلم، اور عزلت پسندی، انتہا درجہ کی تھی، برادرانہ جھگڑوں سے ان کو کچھ واسطہ نہیں تھا، ہر شخص سے دوست ہو یا دشمن اچھی طرح سے ملتے اور کسی سے پرخاش نہ رکھتے، صبر و قناعت کی صفت اُن کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور اُن کو چھو نہیں گیا تھا، ایک چمار یا کولی رات کے وقت آتا تو گھر سے باہر نکل کر اُس کا حال پوچھتے، اگر وہ کسی مریض کے دکھانے کو لے جانا چاہتا تو اسی وقت اس کے ساتھ ہو لیتے اور بڑی شفقت سے اسکو دیکھتے اور دوا بتاتے تھے،

ایک زمانہ میں طاعون شدت سے پھیلا ہوا تھا، گاؤں کے گاؤں ویران پڑے ہوئے

تھے، مرد و عورت، لڑکے، بوڑھے سب جھونپڑیوں میں پڑے ہوئے تھے، اُن جھونپڑیوں میں خود جاکر بیمار پرسی کرتے، اور دوا بتاتے، ایک مرتبہ اتفاق سے میں بھی حاضر تھا، مجھے ساتھ لیکر تشریف لے گئے، اور دیر تک گنواروں کو سمجھاتے اور دوا بتاتے رہے، اس تنگ جھونپڑی میں دیر تک مریض کے پاس کھڑے رہنے سے جو تکلیف مجھے ہوئی تھی وہ آج تک یاد ہے،

طبیعت میں کاہلی نام کو نہ تھی، جو کام جس وقت کرنے کا ہوتا اُسی وقت انجام کو پہنچاتے ایک شخص نبض دکھا رہا ہے، اُس کے مرض کی تشخیص کرکے نسخہ لکھ کر دیا، ایک نے کہا مجھے تعویذ لکھ دیجئے، اُس کو تعویذ لکھ کر دیا، ایک کھڑا ہے کہ اس طرح پر مجھے غزل لکھ دیجئے، کوئی کسی کی ولادت یا وفات کی تاریخ یا شادی کی منظوم نوید لکھوانے آیا ہے، وہ ہر ایک کی فرمائش پوری کر رہے ہیں، پڑھنے والے کتاب لئے بیٹھے ہیں، اُن کے سبق شروع ہو گئے، گھر میں اُن کا خلوت خانہ علیحدہ تھا، وہاں صرف ایک مشغلہ تھا کتب بینی اور تصنیف و تالیف

تصنیفات کا ایک دفتر بے پایاں تلف ہو چکا ہے، جو نام مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں: تاریخ نگھیل کھنڈ اردو، ناگور میں لکھی تھی، چمنستانِ اردو، اردو صرف و نحو کی بسیط کتاب ناگور یا ساگر میں لکھی تھی، جوشِ دل اردو کا پہلا دیوان، پریتم راگ بھاشا کا دیوان، دیوان فارسی اور رقعاتِ فخریہ دونوں حیدرآباد میں لکھے تھے، کیا عجب ہے کہ ان دونوں کی نقلیں اُن کے حیدرآبادی شاگردوں کے پاس ہوں، دیوانِ خیالی تیسرا دیوان اردو کا جس کو بھوپال میں ترتیب دیا تھا، مثنوی بہارِ تسلیم، جانِ فخر، فغانِ فخر، تینوں مثنویاں لکھنؤ میں یا وہاں سے آنے کے بعد وطن میں لکھی تھیں، ان میں سے فغانِ فخر ذو بحرین تھی، ان کے مسودے میرے بچپن تک موجود تھے، فغانِ فخر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

یاس ہے اب عشق کی تاثیر سے
بھر گیا دل نالہ شبگیر سے

آہ سے جاتا رہا بالکل اثر   کرتی ہے اب نفع کے بدلے ضرر
حسن کے گل سے اڑی بو مہر کی   لذتِ الفت نہیں باقی رہی
جل گئے پروانہ کے مانند ہم   خاک میں ابتک وہی ہے سوزِ غم
وحشتِ دل کا وہی ہے زور و شور   ہو گئی شیرینی جان ہائے شور
آتشِ جاں سوز ہے یہ بد بلا   پانی سے بجھتا نہیں اس کا جلا

بے سلسلہ

جوش میں وحشت کے جب آتا خلل   تھام کے دل پڑھتا یہ آخر غزل
عادتِ مشقِ ستم اچھی نہیں   اتنی بھی غفلت ستم اچھی نہیں

چشم تھی تر آہ کا لب پر دھواں   نبض تھی ساقط دلِ مضطر تپاں
لوٹتا تھا خاک پر بسمل کی شکل   پھرتی تھی پر آنکھ میں قاتل کی شکل
جلتا تھا اس آگ میں جس کا دھواں   دیدۂ ظاہر سے رہتا تھا عیاں
برق کی صورت کبھی آتی ہنسی   ابر کے مانند میں روتا کبھی
ناخنِ وحشت سے تھا سینہ فگار   فاش تھا رازِ دل و جاں بے قرار

”بہارِ تسلیم کا رنگ ملاحظہ ہو

مدحِ سخن

ہے لطفِ سخن نیا ہمیشہ   یہ بات ہے شوق زا ہمیشہ

ہے مخزنِ رازہائے لاریب
کہتے ہیں اُسے خزانۂ غیب
گلزارِ سخن سدا ہے باقی
فانی ہے زباں، صدا ہے باقی
کرتی ہے کرشمہ شکلِ دلدار
آغوشِ سخن میں بکرِ افکار
شبدیزِ سخن ہے کلکِ شاعر
ہے ملک کلام ملکِ شاعر
گلزارِ خیال ہو سخنور
رکھتا ہے بہار تازہ و تر

جانِ فخر کا نمونہ

ہوگئی باہم جو دونوں کی نظر
آئی آفت اک بیچارہ کے سر
ہاتھ سے جاتا رہا دامانِ ضبط
دل کی وحشت نے بگاڑی شانِ ضبط
راہ راہ اپنی گئی وہ تو گذر
یہ دلِ صد پارہ اپنا تھام کر
بسترِ غم پر گرا زار و نزار
دم بدم بڑھنے لگا رنج و فشار
دل میں برپا اک قیامت کا الم
پر بپاسِ وضع آنکھیں تھیں نم
تھم نہ سکتا اس سے جب گریہ کا جوش
اُٹھتا یہ بیساختہ دل کا خروش

غزل

پاس جب تک وہ قمر آتا نہیں
دل سنبھلتا اب نظر آتا نہیں
ڈر ہے اشکوں کا بھی ٹوٹا سلسلہ
سوئے مژگاں اک گہر آتا نہیں
فرطِ بیتابی سے وہ دن کون ہے
منھ تلک اپنے جگر آتا نہیں
دیدہ و دل میں تو کب کا آ بسا
گھر میں وہ ظالم مگر آتا نہیں

ایک مثنوی بھوپال میں کسی کی فرمایش سے لکھی تھی، نذرافشاں اس کا نام تھا، گلزار نسیم کی بحر اور نسیم کے رنگ کی مثنوی تھی، علاوہ ان کے فارسی اور اردو کے بیسیوں قصیدے جو حمد و نعت یا اپنے ممدوح اور اساتذہ کی مدح میں لکھے تھے تلف ہو گئے، اُن کے کچھ کچھ شعر بطریق انتخاب مہر جہاں تاب میں درج ہیں، نمونہ کے طور پر چند قصیدوں کے اشعار نقل کرتا ہوں،

فی التوحید

اے حکیمے ساتگیں از بادۂ جاں انداختہ
ہر زباں از نکتۂ اندر زباں انداختہ

شہر عرفاں طائرت در جیب منقار خودش
پر عنقا بہر نسبت آشیاں انداختہ

نو عروس لفظ را از حرفہا بستہ نگار
زلف معنی بلفظ اندر دہاں انداختہ

تیر فکر ہر کہ بر روے نشاں شد بوسہ گیر
خویشتن را از سر نام و نشاں انداختہ

بہر ہیچ جنس سرسبزی امید بہار
دست امکاں زیر دامان خزاں انداختہ

منم کہ مہر جہانتابم از بریق ضمیر
برخ کشیدہ ز ادراکم آں نقاب زریر

چو عکس خانۂ من چشم حاسد بیند
شود مشیمہ درون کور عقل نقد بصیر

بزہرہ آب کند شیر در نیستانہا
بر آورد از نے کلکم ز حرف نرم حریر

کشد بپایۂ چو طاوس خامہ نقش رقم
ہمائے ہوش عطارد کند بدام اسیر

بجام لفظ شراب معانیم طوقیست
بگیرد ار نخورد پاسبان فہم را زنجیر

رفتم اے آنکہ با سپہ تو بہ جہاں رفتم
خلعت زندہ آمدم و عریاں رفتم

غنچہ آمدم و گشودن چو گلے شدہ ام
چو سحر با جیب پرے گل خنداں رفتم

نکهت اندر دهن غنچه براهی آمد و رفت   آمدم صورت باد و صفت جان رفتم
گاه چون ابخره از ارض بر افلاک شدم   گاه چون قطره فرو گشته بعمان رفتم
از نگاه عرفا دور فتادم چون تجلی   در دل اهل نظر صورت احسان رفتم
کس ندانست چه دارم دل عصیان خیزم   بر در گبر شدم پیش مسلمان رفتم

عشق با کم نگرای دل که پیدا ز خاک شدن   خانه بر دوش هوا بر در جانان رفتم
همچو ذرات در انوار خورش رقص کنان   تا بجولانگه قدس از ره ایقان رفتم

لاله گونم کفن از تیغ تمنا بسمل   جامه رنگین چو گلے رنگ شهیدان رفتم
زلف فکرم شده پیچان بنخ دولت تو   گاه در هند شدم گاه بکرمان رفتم

مگرم دست کشد لطف کریمی که ازو   تا بصبح امل از شام غریبان رفتم
آن رحیمی که بهر بار سر قربت   در دلش بے زدن حلقه بسندان رفتم
معصیت گشته دلیل ره غفران اند   خار در پاے ز صحرا بخیابان رفتم

فی التوحید

نور وحدت را مصور شد حجاب کثرت است   ذرهٔ خاکم و لیکن هست گوهر آفتاب
سیرت اندر صورتم بین لفظ را معنی طلب   بازی دیگر کند همچون کبوتر آفتاب
اخگر روشن ز خاکستر حجاب اندر بود   جرم تن چون جسم خاکی نور اخگر آفتاب
همت عالی فرو نارد سر خود پیش کس   طبع من ماناست تابنده ز آفتاب

گرچه دل گرمم همی لرزد ز چرخ سرد مهر   سایه بر آیینه همی لرزد چو مضطر آفتاب
هان مگر دستم کشد اکلم که پیش رفعتش   همچو من فرعی بود وز ذره کمتر آفتاب
شامگاهان چون همی بوسد زمین مقدمش   می برآید هر سحر با تاج انور آفتاب
گر بچرخ او جلوه ننمودے بچشم دیده ور   می نمودش حلقهٔ زلف معنبر آفتاب

ای باکسیر نوالت بوته زر آفتاب   بهر ظرف سفرهٔ عامم تو زرگر آفتاب
نو عروسان بهاران احلی بندی ز قسمت   میدهد هم مهرگان را از تو زیور آفتاب
زلف لیلای شب از سودای لطف مشکبو   عارض سیمین قیس روز یکسر آفتاب

چیست که مهر منیر خلعت زر یافته   چرخ ز ماه شهیر تاج گهر یافته
خشک خزان را بهین فصل گل اندر چمن   بلبل شیرین سخن نغمهٔ تر یافته
آب بقا را اثر باد نمو را هنر   خاک سکون از سفر شعله شرر یافته
صحن چمن را بهار شاخ پر از برگ و بار   دشت گل نوبهار خردهٔ زر یافته
ابر سیه قطرها قطره گهر را بها   گوهر روشن ضیا بحر درر یافته
تاک مے خوشگوار نرگس شهلا خمار   گل ورق آبدار تازه و تر یافته

عالم کون و فساد دل بسکون در نهاد   ملک دکن را سواد زیب دگر یافته

جشن نوروزی عید است گل افشان امروز   غم فردا الم دی شده پنهان امروز

به بهاری شده افلاک خزان اگردش
که زمیں را خس و خار است گلستاں امروز
عمل نیک تو آورده فردوس بهشت
که بهر سو چمن آرا شده رضوان امروز
بسکه شد سوخته و بیخته عود و عنبر
مشک بیز است هوائے پر مرغاں امروز
بادهٔ ناب برد رشک بآب خالص
سبزه شد غیرت صد دستهٔ ریحاں امروز

ایک سو بیس شعر کے قصیدہ میں سے چند شعر بغیر کسی سلسلہ کے،

سپیده دم تتق خواب شد ز دیده چو دور
نمود جلوه در آغوش دل عروس سرور
مهِ دو هفته ز لوحِ جبینش داغ بدل
غریق لجهٔ تشویر پیشِ او کافور
گمان ابروے آں بت کشیده گر بینید
کنند چله کشاں خم بسجده فرقِ غرور
بدید نقش شده بادام بندهٔ بے دام
بشوخیش شده بیمار نرگسِ مخمور
ستاده یک طرف اسپانِ بادپیمایاں
که طے کنند بیک گام عرصه‌ہائے دہور
بیال کاہکشاں و بدم چو پرِ زینی
بچو گل بکثرتِ رنگ و بچهره همچوں حور
گه رکوب چو برق و گه سکوں چو زمیں
گه قتال چو رعد و دم صدا چوں صور

ده چه خورم بود گلستانے
غنچه خندان و ابر گریانے
بر کلاله بنفشه چشمک زن
بر سرِ زلف سنبلستانے
گلِ تر رشکِ خدِ گلرویاں
یاسمیں همچو ماه تابانے
نرگسِ نیمخواب و ز دیده
دیده بکشاده چون نگهبانے
شده رطب اللسان گلِ سوسن
چمن دهر را غزل خوانے
باد از رشحِ آب بر سرِ خاک
فرش گسترده سبز دامانے

طوطیِ سبز فام از مستی　　بر سرِ شاخ شکر افشانے
وہ ہمہ زیب و زین کے باشد　　کاندراں باغ باشد انسانے
ہست او آنکہ بے شک و شبہت　　عالمش تن بود و او جانے
حل کنِ عقد ہاے لاینحل　　ملت و ملک را نگہبانے
پایہ برتر کنِ فنونِ ملل　　مایہ دارِ علوم ادیانے

اردو قصیدوں میں سے صرف ایک قصیدے کی تشبیب پیش کرتا ہوں،

آگیا سامنے وہ بت دل و دیں کا دشمن　　رخصت اے شیخ حرم کفر ہوا توبہ شکن
کیا کہوں کیا نظر آیا رخِ کافر میں مجھے　　طالبِ رشتۂ زنار ہے ہر دم گردن
ہے تمنا کہ لکھوں اس کا سراپاے جمال　　سخنِ حسن سے لبریز ہے آغوشِ دہن
زلف ہے یا شبِ دیجور کہ جس کے آگے　　شامِ غربت سے زیادہ ہے سیہ صبحِ وطن
اس کی ہر ایک گرہ سے ہے پڑی دل میں گرہ　　کھل گئی یاں گرہ زلفِ چلیپاے سخن
مہ یک ہفتہ کہوں اس کو اسے ابر سیاہ　　یا اسے بال کہوں اس کو جبینِ روشن
شکلِ ابرو سے یہ ہوتا ہے نظر کو دھوکا　　دو ہلال ایک جگہ حق نے کئے جلوہ فگن
نرگسیں ناز بھرے دید کے قابل دیدے　　نشۂ حسن میں سرشار خرد کے رہزن
بینی اُس شوخ کی ہے حسن کے شعلہ کی لو　　دیکھ کر جس کو ہو پھر غنچۂ گل برگِ سمن
مہر و مہ صدقہ ہوا کرتے ہیں دونوں رخ پر　　پانی پانی ہوئے جاتے ہیں جوانانِ چمن
لب ہیں یا تعبیہ ہیں درجِ دہن پر یاقوت　　یا ہیں دو پنکھڑیاں گل کی لطیف و احسن
غنچۂ گل ہے دہن اُس پہ مسی کا جوبن　　ایک ہی شاخ میں پھولے ہیں گلاب و سوسن

والد مرحوم کی جو تصنیفات ضائع ہونے سے بچ گئی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ عجیب

کتاب مہر جہانتاب ہی، فارسی زبان میں ایک جلد اُس کی فلسکیپ کی تقطیع میں تیرہ سو صفحوں پر تمام ہوئی ہے، دوسری جلد آدھی لکھی تھی کہ عمر نے وفا نہ کی،

پہلی جلد میں تین دفتر ہیں، دفتر اوّل میں علوم و فنون متعارف و غیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں جس طرح سے سیوطی نے نقایہ اور اُسکی شرح میں لکھے ہیں، دوسرے دفتر میں انبیاے کرام، اہلبیت، صحابہ، تابعین، محدثین، علما، حکما، اور مشائخ کے حالات جدا جدا قلمبند فرمائے ہیں، تیسرے دفتر میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا شاعروں کے تذکرے علیحدہ علیحدہ درج کیے ہیں،

دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی، جس میں سے ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا، یہ جلد آدھی ہو چکی تھی کہ اُن کو یہ بات محسوس ہوئی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں، اُسکا زمانے نے ورق اُلٹ دیا ہے، اور چند دنوں میں اس کا کوئی سمجھنے والا بھی باقی نہ رہے گا، اس خیال کے آنے سے ہمت پست ہو گئی، چند دنوں کے لئے قلم رکھ دیا، پھر اپنی گذشتہ محنت پر تاسف ہوا اور اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا، دس بارہ جزو لکھ چکے تھے کہ داعی حق کو لبیک کہکر خلد بریں کو سدھارے،

ایک کتاب اُن کی سیرۃ السادات فارسی میں ہی، اُس میں بھی بڑی تفصیل کے ساتھ سادات کی بہت سی شاخوں کا نسب نامہ دیا ہے، اور جن بزرگوں کے حالات ملے ہیں اُن کو بھی ساتھ ہی ساتھ لکھتے گئے ہیں، اس کتاب کا شمار بھی اُن کی بہترین تصنیفات میں ہے،

ایک اور کتاب فارسی میں سیرت علیمیہ ہے، اس میں سید شاہ علیم اللہ کے حالات اور ان کے خاندان کے تمام علما، مشائخ، اور سادات کے حالات بیان کئے ہیں، یہ بھی بہت مفید اور عمدہ کتاب ہے،

ایک کتاب عربی میں سبیل النجات ہی، اُس میں ہر قسم کی دعائیں جمع کی ہیں، اور بطور حزب الاعظم کے اسکو احزاب پر تقسیم کیا ہی اور بین السطور ترجمہ اُس کا اردو میں کر دیا ہے،

ایک کتاب مجربات خیالی اردو میں ہے، اس میں وظیفے، دعائیں اور خاندانی اعمال ہیں

ایک مرض اور ہر ایک حاجت کے جمع کئے ہیں،

فخر المطالب سیوطی کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہی، ایمانِ ابوین کی بحث میں یہ کسی کی فرمایش سے کیا تھا، شاہ ولی اللہ کی انصاف فی بیان اسباب الاختلاف کا ترجمہ بھی اردو میں کسی کی فرمایش سے کیا تھا، اور حاشیہ پر فوائد لکھے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں شرح وقایہ کا حاشیہ عربی میں لکھنا شروع کیا تھا، اُس کے اجزا بطور مسودے کے موجود ہیں،

شعر و سخن میں جو کتابیں میں نے پائیں یا چھپ گئی ہیں اُن میں دیوان فخر حضرت کا دوسرا دیوان ہے، جو لکھنؤ میں مرتب کیا تھا، یہ مجکو اتفاقاً اُن کے ایک شاگرد سے مل گیا، اس میں چند قصیدے، غزلوں کا دیوان، نامے، مسدس، رباعیاں، اخیر میں مناظرۂ شب و روز اردو نثر میں ہے،

مثنوی ماہ و خورشید بھوپال میں غلام احمد فروغی کی فرمایش سے لکھی تھی، تقریباً پانچ ہزار شعر کی کتاب ہے، اُس کا ناتمام مسودہ میرے پاس ہی، کتاب صاف کرکے فروغی کو دیدی تھی، معلوم نہیں انھوں نے کیا کی،

مثنوی نگارخانۂ چین فروغی کی فرمایش سے بھوپال میں لکھی تھی، یہ بھی ماہ و خورشید کے برابر ہے، اس کو فروغی نے چھپوا لیا تھا،

مسدس خیالی، مسدس حالی کے جواب میں مولوی عبد العلی مدراسی نے لکھوائی تھی اور انہی نے اس کو چھاپ دیا ہے،

نثر خیالی، سہ نثر ظہوری کے طرز پر لکھی تھی، فروغی نے احمد جان صوفی کے مطبع میں چھپوایا تھا، مگر اب ملتی نہیں، مہجیات خیالی ایک مختصر مجموعہ نعت کی غزلوں کا میں نے چھپوایا تھا، اس کے اور ٹکڑے مثلاً واردات خیالی، مناجات خیالی وغیرہ ابھی رکھی ہوئی ہیں، یہ اخیر زمانہ کی تصنیفیں

ہیں، جب کہ اُن کو شاعری کا ذوق جاتا رہا تھا، بچوں اور عورتوں کی فرمایش سے ان کے مناسب حال کچھ فرما دیا کرتے تھے،

میرے ماموں مولانا سید عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ نے جب رحلت فرمائی تو ان کے شاگردوں اور مریدوں نے فارسی، اردو اور بھاشا میں اُن کے حالات لکھے، کسی نے مثنوی لکھی، کسی نے نثر میں لکھا، میرا سن اُس وقت چودہ برس کا تھا، دیکھا دیکھی اُن کی وفات کی تاریخ فارسی میں میں نے بھی لکھی، اور اردو میں مثنوی لکھنا چاہی، مگر اُس کا سلیقہ نہ اس وقت تھا نہ اب ہی، اسلئے میں نے والد مرحوم سے استدعا کی، اُنھوں نے نظم عالی کے نام سے ایک مثنوی لکھی جو میری طرف منسوب ہی،

شروع میں اردو فارسی اشعار میں فخر اور بھاشا میں ہمیر تخلص تھا، حیدرآباد میں اردو فارسی میں خیالی تخلص قرار دیا، جو اخیر زمانہ تک قائم رہا،

عربی میں بھی کبھی کبھی تغزل یا مناجات کے اشعار نظم فرمایا کرتے تھے، مہر جہانتاب میں اُسکا بھی انتخاب کیا ہے، مگر وہ بہت تھوڑا ہے، شاید تیس چالیس شعر ہوں گے،

راجپوتانہ کی کسی ریاست میں جب چند روز رہنے کا اتفاق ہوا، تو ہندی بھی سیکھ لی تھی اور بے تکلف اُس میں لکھتے پڑھتے تھے،

اُن کے حالاتِ زندگی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے ذہین و ذکی تھے جس طرف توجہ کرتے تھے اُس کو بآسانی حاصل کر لیتے تھے، حافظہ کمزور تھا، مقرر بھی نہ تھے، اس کے ساتھ طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا، اور اظہارِ کمال سے سخت نفرت تھی،

یہی وجہ تھی کہ زندگی میں اُن کو کم کسی نے جانا، اور باانیہمہ کمالاتِ علمی و عملی وہ گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے، اور آخر کار ۱۰ رمضان ۱۳۲۶ھ کو تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ کر وفات پائی،

فارسی غزلوں کا انتخاب،

چمن نادیدہ دام صید در یا لم رسید اینجا   تمنائے تماشائے گلم بیخود کشید اینجا
پر و بالم بیک پرواز صیادے شکست اکنوں   کرا باشد بہ پرواز دگر اے دل امید اینجا

زود آے کہ یادت بکمینِ دل و جانست   مشتاقِ قدوم تو بہر سو نگران است
بشکست دلم چرخ و ہنوزم نگران است   در مشقِ ستم پیر شد و چرخ جوان است
اے دوست مپرس از دلِ چون زلفِ پریشاں   بنگر برخِ زرد عیاں را چہ بیان است

ز چشمِ انتظارِ من سیاہی وقفِ شبہا شد   تمنا مردہ بعد از من صباحِ وصل پیدا شد
چو بودم پر دل از غم خالی از شادی پس از مردن   دلم شد خاک و ساغر گشت و گریاں چشم مینا شد
دلِ پر آبلہ می داشت آبِ رز ز بے کیفی   نگاہِ چشمِ مستش را بدل جا داد و صہبا شد

از شکستِ بند کار از پیش بہتر می شود   تیغ چوں بر خود شکست آورد خنجر می شود
صحبتِ روشن دلاں تاریکیِ دل می برد   پیشِ آتش در دمی انگشت اخگر می شود

جان را بہ برق جلوہ جانانہ سوختیم   شوقش زبانہ زد و مستانہ سوختیم
از گرمیِ ہجومِ تمنائے دل چہ عود   پنہاں بسوزِ ہجر دلیرانہ سوختیم
تابِ سخن نماند پس انیست مختصر   با شمع ساختیم چو پروانہ سوختیم

اردو غزلوں کا انتخاب ،

رہے ہم ہاتھ ہی ملتے جنوں نے پاؤں پھیلائے   نشانِ تار تک چھوڑا نہیں جیبِ گریباں کا

جسے سمجھا تھا دل آرام جاں اے وائے بیدردی
وہ اک آتش کا پرکالہ ہی خرمن سوزیِ جاں کا
زمیں ہے مدفنِ نعش اور سینہ مخزنِ حسرت
دلِ پر آرزو بھی رشک ہی گورِ غریباں کا

ارمانِ وصل کا دلِ شیدا میں رہ گیا
یہی عمر بھر فریبِ تمنا میں رہ گیا
کیا کیا دیا ہے ساتھ رفیقِ جنوں نے آہ
ٹوٹا جو خارِ دشت کفِ پا میں رہ گیا

مر کے ٹھنڈے ہوئے تو یہ سمجھے
عشق تھا وہ جو شعلہ افگن تھا

حسرت ہے پھر وہی کوئی ایسا ہو دلفریب
کیا کیا نگاہِ ناز نے ظالم مزا دیا

مجبور سچ ہے آدمی اس جی کے ہاتھ سے
دل جس پہ آیا، آیا، جدھر سے پھرا، پھرا

زندگی اک خواب کی سی تھی
یہ کھلا ہم پہ بعد مردن آج

مسافرانِ خیالات گذرے ہیں کیا کیا
ہمارے دل کا بھی ہے حال، رہگذر کی طرح

شجرِ گل پہ جو دو چار پر آتے ہیں نظر
تھا کسی وقت یہ بلبل کا نشیمن آباد

مر کر بھی شوخیوں کا تقاضا نہ کم ہوا
بادِ صبا سے کرتا ہے میرا غبار ناز

نکبت ہی ابتو ثمرۂ دانش زمانے میں
سایہ کا بھی نہیں ہی نہالِ ہنر سے فیض

* * *

ہم کو برسوں میں رقیبوں کے لئے
تین دن میں آئے اس کے چار خط

فخر اس زہد ریائی پہ نہ کرنا زنہار
بندگی کی نہیں پروا ہے وہاں اے واعظ

ہے فصلِ گل خزاں گئی بدلا ہوا کا رنگ
جمنے لگا چمن میں نسیم و صبا کا رنگ

نکہتِ گل کی طرح آزاد بربادی سے ہیں
پھرتے ہیں بے قید کیا کیا خانہ ویرانی سے ہم
بے نشانی سے نہیں احساں کسی کا بعدِ مرگ
پاک ہیں یاروں کی رسم فاتحہ خوانی سے ہم

دیکھا تو آپ میرے ہی گھر میں تھے گوشہ گیر
ڈھونڈھ آیا بہانہ میں اُن کو جہاں تمام

انکار وصل ہوتا تو اقرار سہل تھا
دشوار تو یہی ہے کہ انکار بھی نہیں

وصل میں بھی ادب عرضِ بیاں مانع ہے
ہائے جو دل میں ہے وہ منہ سے نکلتا ہی نہیں

دیکھی اک دن بھی نہ اُس باغِ جوانی کی بہار
فصل گل میں بھی ہم اے فخر خزاں رکھتے ہیں

گل کھلے گا اور اے بلبل نہ چھیڑ
منہ جو غنچے کا کھلا اچھا نہیں

ہے ابتدائے عشقِ خیالی ابھی سے آپ
دل بگڑے بگڑے پھرتے ہیں گھبرائے جاتے ہیں

مانا کہ حوصلہ وہی اب تک فغاں کا ہے
لیکن ہجوم یاس اُمید اثر کہاں

غضب کی تیزیاں کرتا ہے ابلقِ شب و روز   کسی سوار کا جمتا نہیں رکاب میں پاؤں

محبت سے یہ بت کدھر دیکھتے ہیں   بُرا دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں

خود گم رہے کسی کی کبھی جستجو نہ ہو   دل دے خدا ور جسمیں کوئی آرزو نہ ہو
قطروں سے میں گرا صفتِ اشکِ بے اثر   مجھ سا بھی خلق میں کوئی بے آبرو نہ ہو

خلافِ قاعدہ کی طرح تم نے میری غیروں سے   سمجھتا ہوں مگر میں خوب ان باتوں کے پہلو کو

بہار باغ میں ہو یا خزاں جو ہو سو ہو   اگر ہمیں نہ رہے تو وہاں جو ہو سو ہو

ایک عالم ہے برابر تپشِ پیہم سے   میرے پہلو میں کوئی دل ہے کہ اخگر کیا ہے
خارِ صحرائے جنوں چارہ گری کرتے ہیں   جوشِ وحشت میں مجھے حاجتِ نشتر کیا ہے

آج آیا ہے دلِ زار جو لیتے ہو تو لو   کل مرے پاس یہ نادان رہے یا نہ رہے
بتو سنگِ مزارِ فخرؔ دیکھو   کہ بعد از مرگ بھی چھاتی پہ سل ہے

حسرت برس رہی ہے مری مشتِ خاک پر   چادر نہ پھول کی ہے نہ شمعِ مزار ہے
دکھلا رہا ہے چرخ پس از مرگ رفعتیں   بادِ صبا کے دوش پہ میرا غبار ہے
غنچہ ہے مدتوں سے گلِ آرزوئے فخرؔ   ناآشنائے لطفِ نسیمِ بہار ہے

اپنے ہوتے غیر بیٹھیں اُن کے پاس   یہ بھی اے دل گردش ایام ہے

لبوں پر دم نہ کیونکر آئے جب ہم ہمنشیں دل کو   وفا کی جس سے ہو اُمید وہ ہی بے وفا نکلے
بر آئی اے فلک تجھ سے نہ امید ایک بھی اپنی   رہا یہ حوصلہ مدتوں کہ کوئی حوصلہ نکلے

یہ شیخ صاحب کی نرالی ہے بات   یہ رٹن اور لہو ولعب کیا کہئیے،

دل و جگر کیوں نہ پیش کر دوں سنوں نصیحت میں کیا کسی کی   ستم ہے چتون کی ترچھی ترچھی وہ بانکی بانکی ادا کسی کی
لٹیں یہ چھوٹی ہیں گیسوؤں کی کہ سرگرانی ہے عاشقوں کو   اِدھر سے اُتری اُدھر کو آئی کسی کے سر پہ بلا کسی کی

بھیرویں ۶ گھڑی سے ۹ گھڑی دن تک موسم بارش میں

بدریا گھیرے سیاما نہیں آئے رے

کبری سُنوت جس بادر گرجت   آنس چُوئیں رت پاوس کیرے رے
یہ تن کبھوں دامن جس چمکے   وہ کی لگن بنت بھیری رے
بچھڑو رین ساون کیری رتیاں   بھور دھوپ پرے کیری رے
رین اندھیاری پنہتہ نہ سوجھے   تیر پیا تھیں اب کت ہیری رے

آہیا نو گھڑی دن سے گیارہ گھڑی تک

جاؤ جی تم کرشن کنھیا

تم انگر جی اپنے گر جی   پھر کتو کے ناہیں سُنیا
میر کہوں کیا سام اگر گئیں   ہے چھیلا پت کا لیو گیا

سارنگ آدھے دن سے ۳ گھڑی دن تک

ٹھنڈی چھیاں بنیا ٹھاؤں

بیریا ڈولے جیرا ہلساوے   بولے کوئلیا ئے پیا نانوں
پپیہا کوکو، مورو ا بولے   میر پیا کا کہہ بدھ پاؤں

گوری ۳ گھڑی دن سے آخر تک یعنی ۶ گھڑی تک

جیرا رہت بجھائے

رو کلی جوبن بالک ہے کنھیا، سنگ کی سکھی سب پیا سنگ کھیلیں، ہل ہل دھوم مچائے، ہمرے بلمہ پلنا میں جھولیں ہم بیٹھے مرجھائے، ساس ننند موہیں سندن واگیں تاکو ہوئے، سہائے،، تمیر بلمہ نادان نہ ہوں تو، کس یہ دکھ ہم پائے،

یمن ۶ گھڑی شام سے ۹ گھڑی رات تک

اتنا نا آپی تم جیرا جادو

سوتن سنگھ تم رین دتا رہو   چھانڈو پر نتھہ نج پا چھو ہارو
تمیر پیارو سے کہ میارو   تم تو نس دن تن من وارو

جھنجھوٹی ۹ گھڑی سے آدھی رات تک،

لاگ رہی نت سرت تمہاری   سدھ بیسار بو بلمہو ہماری
من کے من کے پھیر رہی ہوں   تن جل بھن کے بن گئیو چپاری
بیٹھی ہوں تمہری آس لگائے   دیکھو تراس نا موہیں یں واری
تمیر سوں بھینٹ کرو ہو موہن   نس دن تم پہ رہت بلہاری

بھاگ آدھی رات سے تین گھڑی رات تک

جن چھوڈ بانکے پار   پائل موری ان جھن باجی
ساس بری موٹے پھوٹے نیرے   نند ہٹیلی گاجی
بھرے جان تو آنکھ ملہیو کلھہ   کرم کٹو جو ساجی
بہت ستاؤ نہ جگیو ن ساس   ایسو ٹھٹھول جائے راجی
تیر کہیو کا آئے کے جگ ماں   آئے رہیو کہہ کا جی

سورٹھ ایضاً

اب میں جوگن ہو تھیوں لے پیا کے ساتھ
گھائل کر موہن پیا کہوں آں چھائے   بھنس گئے پر آرسی ناری ہاتھ
تیر جو چندر توری میل بھئی ہے   سیج پیا دھو کا رس کھات

پورچ ۳ گھڑی رات سے ۶ گھڑی صبح تک

سیام کون گن گائے اودھو
نین کچھ دیکھیں بسرا ہیں   جھوئیں دو نج بجائے اودھو
سارنگ بین امین رہیں ادھرن   بیج دسن چمکائے اودھو
میرہ جیا ہر لیگیو تنکھن   لے کر مرلی بجائے اودھو

کالنگڑا ۳۱ گھڑی رات سے ۶ گھڑی صبح تک

سونی سندر بن سیج ہماری
سورہواں۱۶ سنگار برتواں۱۲ برن   موتیں مانگ سنواری
چوا چندن سوگندھ کیو گھر   چو مکھ دینا باری
میر پیا بلمھو کہوں جائے   سدھ یہ تن کے بساری

بسنت ہر وقت

آئی بسنت بہار سکھی ری کہیں جر دے چھائے
کوؤ چوندر کوؤ ساری رنگائے کیسر رنگ چائے   پھرت لئے کرسوں ڈرائے کیل مچو سنسار
ٹیسو پھولے آنبہ بورائے، کوئل سبد سناوے   ہم ہی بلمہ پردیس ماں چھائے بسر رہو سگر و سینگار
یہ سنسار میں کر لیکھا ہمن کھیل کھلاوے   میر جیہ ہر نام رین دن، جو چاہو اُپکار

ہولی

موہے ٹھگ گیو بنسی بجیا   کیسے کروں جیا گیو ہی جھٹک
گرہ انروگ بے پانی نہ نکست   ہنن بنن کے نہیں ڈٹ پڑیا
جیو کریج اسدھ نہیں ایکو   ہر گے ہتی جہ کام کریا
جا سو گئے ہر دے کے لک
جمارا پیر کے رنگ ہو مکھ پہ   آنسو رنگ ہیں نین بہیا
روپ سنگار اہی سب بگرا   من ہے نہیں جو بن کا لو بھیا
جاس رہت گل رنگ چٹک
لاگے کریجے پریم کے گانسے   گھاؤ کا نا ہیں دکھیتا
پیر دکھ نہیں کوؤ دھرت ہو   بھینٹ ہے جیرا کا دکھیا
جاس جات کریج مسک
توری چتون کے تیر بلہاری   پریم نجسہ یا بجتو یا
ایک نجر ٹک دیکھیں موہن   مورے جیا کے بلمبیا
اب تو مٹاؤ آنکھین کی کھٹک

Al No 7/130

متفرقات

رات کی بتیاں میٹھی میٹھی   نوے جیا سے نکس گییں رے

قول و قسم کیو بہیتاں گھر کے   اپنی غرض کیو بیت موری لے کے

بسر گئو اب سب گن لے گے   وہ بتیاں اب کس گئیں رے

پیتم جب سے پردیس سدھائے   ہر دم جور کرت ادھکائے

سیر جیا نہیں رہت سنبھارے   انکھیاں درس کا ترس گئیں رے

ایضاً

موہ گے من سانوریا نینن نین ملائے

اک تو روپ انوکھا تا پہ ٹھمک وا کی چال   ستمکھ ہوتے نجریا دیت جیا ہولسائے
اس چھل بل دیکھ کے ڈھیر دھرے گئے جیو   دیکھ کے سونی نجریا تیر ہو نا ہیں جائے

دارالمصنفین کی نئی کتابیں

تاریخِ سندھ: سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی و تمدنی تاریخ، قیمت :- سے ر

اقبالِ کامل: ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات، اور اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل، قیمت :- سے ر

بزمِ تیموریہ: تیموریون کے علمی ذوق، اور اُن کے دربار کے امرا، شعراء، اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل: قیمت :- ہیعہ

امام رازی: امام رازی کے سوانح و حالات، اور پھر فلسفہ و علم و کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح، قیمت :- سے

بزمِ صوفیہ: یعنی صاحبِ تصنیفات صوفیۂ کرام مثلاً شیخ ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات: قیمت :- ہیے

تاریخ اندلس: اندلس کی سیاسی و علمی تاریخ، ہعہ

اہلِ کتاب صحابہ و تابعین: اہل کتاب صحابہ و تابعین کے مفصل سوانح و حالات قیمت ہلعہ

اسلام اور عربی تمدن

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

یعنی

شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا ترجمہ جس مین مذہبِ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن پر علماے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانون کے اخلاقی علمی اور تمدنی احسانات اور اُس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرونِ وسطیٰ مین اسکی جہالت اور وحشت و بربریت اور اس دورِ ترقی مین اُس کی پُر فریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے، اس سلسلہ مین مسلمانون کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی آگیا ہے

قیمت :- ہیے

ضخامت :- ۴۰۵ صفحے

(طابع و ناشر صدیق احمد)

Danish Mahal
PUBLISHERS & BOOKSELLERS
AMINUDDAULAH PARK, LUCKNOW